(سالنامہ جنوری ۱۹۵۹ء)

تنقیح اسلام نمبر

نگار

قیمت فی کاپی

ہندوستان	پاکستان
تین روپیہ (علاوہ محصول)	

سالانہ چندہ (علاوہ مصارف رجسٹری سالنامہ)

ہندوستان	پاکستان
نو ۹ روپے	دس ۱۰ روپے

تصانیف نیاز فتح پوری

من و یزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو انسانیت کبریٰ اخوتِ عامہ کے ایک رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذہب کی تحقیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) دعا (۱۳) علم غیب (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) ہاروت و ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ۔ ضخامت ۲۶۲ کاغذ سفید دبیز۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے (عہ) (علاوہ محصول ڈاک)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کیے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے (عہ) (علاوہ محصول ڈاک)

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

مکتوبات نیاز (تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپے (علاوہ محصول)

حُسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا، اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشائے عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

سالنامہ "نگار" سنہ ۱۹۵۹ء

تنقیح اسلام نمبر

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۷۵ — شمار، ۱-۲

فہرست مضامین جنوری سنہ ۱۹۵۹ء

ملاحظات	اڈیٹر	۲
مذہب کا افادی و عقلی تصور	اڈیٹر	۹
مذاہبِ عالم میں اسلام کا مرتبہ	اڈیٹر	۱۴
قرآن وحی الٰہی ہے لیکن خدا کا کلام نہیں	اڈیٹر	۳۳
خارستان احادیث	اڈیٹر	۴۲
علماء کرام کا عجیب و غریب نظریہ	اڈیٹر	۵۲
اسلام کا عقلی جایزہ	(م-ا)	۵۶
حروف مقطعات	اڈیٹر	۱
عہدِ حاضر کے منکرینِ خدا و مذہب کیا کہتے ہیں	اڈیٹر	۸۳
احادیث کی کوئی دینی قیمت نہیں	(ایک مسلمان)	۱۰۴
بعض آیاتِ قرآنی کی تصریح	اڈیٹر	۱۱۱
کفو اسلام کی روایتی و عقلی حیثیت	اڈیٹر	۱۱۴
تعلیماتِ اسلامی کا صحیح مفہوم	اڈیٹر	۱۲۲
معجزہ و علمِ غیب	اڈیٹر	۱۲۷
حق اللہ کوئی چیز نہیں	اڈیٹر	۱۳۳

(فروری کا پرچہ علحدہ شایع نہ ہوگا)

ملاحظات

ایک تاریخی یادگار

"نگار" فروری سنہ ۲۲ء میں جاری ہوا۔ لیکن میرے نظم و نثر لکھنے کا سلسلہ اس سے ۲۲ سال قبل ہی شروع ہو گیا تھا جب میری تعلیم بھی پوری طرح ختم نہ ہوئی تھی۔ (جس کی تفصیل کا موقع نہیں، نہ اس کی ضرورت) ۔ اور نگار کے اجراء سے قبل ہی ادبی دُنیا مجھ سے کافی روشناس ہو چکی تھی اور انشاءِ لطیف کے ذوق نے مجھے زیادہ تر اسی طرف مایل کر رکھا تھا لیکن میرا یہ میلان تقاضہ تھا محض میرے جمالیاتی ذوق کا یا نظریۂ فرائڈ کے مطابق صرف میری جنسی تشنگی و ناآسودگی کا۔ لیکن ان داعیات سے ہٹ کر جب کبھی میں سوچتا تھا (اور اکثر سوچتا تھا) تو اس کا تعلق زیادہ تر عقل و مذہب ہی سے ہوا کرتا تھا۔ عقل سے اس لئے کہ نفس و ذہن کو مطمئن کئے بغیر کسی امر کو تسلیم کر لینا، کبھی میرا طالب علمانہ شعار بھی نہیں رہا اور مذہب سے اس لئے کہ میری تعلیم و تربیت ہی مذہب کے ماحول میں ہوئی اور علماء مذہب کے مطالعہ کا مجھے کافی موقع ملا تھا۔

پھر یہ ضرور ہے کہ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو اس کی ابتداء ادبِ لطیف ہی سے ہوئی، کیونکہ اُس وقت کے رسایل و جراید میں اسی جنس کی طلب و قدر تھی، لیکن جب نگار جاری ہوا تو مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا زیادہ موقع ملا اور میرے لاشعور یا دبے ہوئے شعور کی بہت سی وہ باتیں جن کو اس سے قبل ظاہر ہونے کا موقع نہ ملا تھا، سامنے آ گئیں اور نگار خالص ادبی پرچہ نہ رہ سکا، بلکہ علمی و مذہبی، تاریخی و سیاسی سبھی کچھ ہو گیا۔

چونکہ ادبی رسایل کی دنیا میں یہ بالکل نئی چیز تھی، اس لئے ملک نے اس کی قدر کی اور اس طرح نگار کے ادبی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کے بعض وہ پہلو بھی نمایاں ہوتے گئے جن کا تعلق خالص علمی دُنیا سے تھا، یہاں تک کہ اس حیثیت سے کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر نگار میں بحث نہ کی گئی ہو اور معلومات کا بیش بہا ذخیرہ فراہم نہ کیا گیا ہو۔

ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں مذہب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ مسلمانوں کی ذہنی پستی کا سبب صرف مذہبی روایت پرستی ہے جس کے ذمہ دار صرف ہمارے علماء و ظواہر ہیں اور اس طرح اعتقادیات مذہبی کا سلسلہ بھی فروری سنہ ۲۳ء سے شروع ہو گیا اور اول اول اصحابِ کہف، حقیقتِ خضر اور مسیح کی ولادت و وفات پر عقلی گفتگو کی گئی۔

اس سے میرا مقصود در اصل یہ تھا کہ اس نوع کے مسایل میں مذہبی روایات کی تنقیح کر کے محض حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، لیکن چونکہ علماء ظواہر کے بُتوں کے لئے یہ پہلی ضرب بھی کم سنگین نہ تھی اس لئے وہ بیتاب ہو گئے اور آخر کار بھوپال کے علماء نے نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمت میں میرے خلاف ایک محضر پیش کر کے مجھے خارج البلد کر دینے کا مطالبہ شروع کر دیا گیا ہر چند انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی، لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ اب بھوپال کی فضا غالباً زیادہ سازگار ثابت نہ ہو اس لئے سنہ ۲۶ء میں لکھنؤ چلا آیا اور عام مذہبی معتقدات پر زیادہ کھل کر لکھنا شروع کیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کی جماعت میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی اور چونکہ وہ میرے عقلی ایرادات کا جواب عقل سے نہ دے سکتے

تھے اس لئے یہ محسوس کرکے کہ ان کی "عمارتگری گنبد دستار" متزلزل ہو رہی ہے انھوں نے میرے خلاف کفر و الحاد کے فتوے صادر کرکے مسلمانوں کو نگار کے مطالعہ سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن چونکہ عقل کی روشنی جو نگار نے لوگوں کے دلوں میں پیدا کی تھی ایسی نہ تھی جو آسانی سے گل ہو سکتی ——— اس لئے بجائے اس کے کہ عوام میری تحریروں کا مطالعہ ترک کر دیتے، وہ زیادہ نگار کی طرف مایل ہو گئے۔ اور آخر کار اس کی تاب نہ لا کر علماء کرام نے میرے کفر و الحاد کے مقابلہ کے لئے یہیں لکھنؤ میں ایک خاص انجمن قایم کی، جس میں ملک کے کثیر علماء نے حصہ لیا اور بڑی اہم تجاویز پیش کی گئیں۔ لیکن آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ اس دین پرست جماعت، اس الحاد شکن انجمن کا کوئی دوسرا جلسہ منعقد نہ ہو سکا اور جس تاریخ میں اس انجمن نے جنم لیا تھا، اسی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئی۔

اس انجمن کا خیر مقدم میں نے جن الفاظ میں کیا تھا، آج ان کو پھر دہراتا ہوں، محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ علماء کی جماعت ذہنی و عقلی بے مایگی کے علاوہ اپنی قوت عمل کے لحاظ سے بھی کس قدر ناکارہ ہے اور اسی دلچسپ داستان سے اس سالنامہ کا افتتاح کرتا ہوں۔

علماء اسلام کا ایک زبردست دینی جہاد

(ایک تاریخی یادگار)

آپ کو معلوم ہے کہ مذہب اسلام کی تاریخ میں سب سے زیادہ مہتم بالشان رفیع المرتبت و جلیل القدر ساعت از ابتدائے ظہور آدم تا ایندم کونسی ہے؟ — وہ ۲۶ صفر ۱۳۴۸ھ یوم شنبہ مطابق ۳ اگست ۱۹۲۹ء وقت ۲ بجے دن کی تھی جبکہ آفتاب ۱۲ درجہ، ۲۰ دقیقہ، ۴۰ ثانیہ پر مایل بہ مغرب قایم تھا اور تمام نجوم سعد کا قران اعظم ..... کی محلسرائے پرنور افگن۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ
واللہ اکبر، اللہ اکبر وللہ الحمد ط

حضرت قبلہ مولانا ..... سرپرست انجمن موید الاسلام نے دعوت خاص دی، اکناف ہند کے تمام ممتاز علماء کرام اور اکابر قوم کا شاندار اجتماع ہوا، لامذہبیت اور دہریت کے انسداد کی تدابیر پر "غور و مشورہ" کیا گیا اور اس طنطنہ و ہمہمہ اور اس شوکت و جبروت کے ساتھ کہ:-

تزلزل در ایوان کسرے افتاد

راویان خجستہ اطوار و پیام رسانان ذیجاہ و وقار متفقہ طور پر یوں زمزمہ پرداز ہیں، کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ یہ اجتماع ..... میں برپا ہو رہا تھا، امریکہ میں بہ مقام واشنگٹن، ایران میں بمقام طہران، ترکی میں بمقام انگورا، روس میں بمقام لینن گراڈ،

اطالیہ میں بمقام وٹیکن اور لکھنؤ میں بمقام دفتر نگار، سخت زلزلے کے آثار محسوس ہوئے، روشنی کے منارے بجھ گئے، مشینیں چلتے چلتے رُک گئیں، کلیساؤں کے گھنٹے زمین پر آرہے، ماہی زمین نے کروٹ لی، قطب اپنی جگہ سے ہٹتے ہٹتے رہ گیا اور کوہ طور پر بجلی چمک چمک کر۔

سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّنا وَرَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ

جناب مولانا..... نے اپنی "موثر و ایمان آفریں" انداز میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:۔

"لامذہبیت اور زندقہ کا سیلاب ہندوستان میں بڑھ رہا ہے اور تحریروں و تقریروں میں جس طرح مذہب کو بازیگاہ بنایا جارہا ہے وہ آپ حضرات سے پوشیدہ نہیں، افغانستان، ایران جس طرح آزاد ہو رہے ہیں وہ ایسی چیز نہیں ہے جس کا اثر ہندوستان پر نہ پڑے، اس لئے ضرورت ہے کہ علماء کرام بہت جلد اپنے فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ادا کرنے کے واسطے میدانِ عمل میں اُتر آئیں۔"

اس کے بعد متعدد "مولاناؤں" نے اپنی "قیمتی تقریروں" میں "فاضل مقرر" کی تائید کرتے ہوئے علماء کرام کی مستعدی و فرض شناسی کی ضرورت کا اعتراف کیا اور اس طرح گویا اصولاً تحریک کی ضرورت پر مُہرِ توثیق ثبت ہو گئی۔

اس کے بعد مولانا..... نے بعض "بزرگانِ قوم" کے خطوط کا خلاصہ سنایا، جنھوں نے اس مقصد سے اظہار ہمدردی کیا تھا اور پھر مختلف "علماء کرام" کا ایمان افروز اور خلوص پرور بیان پیش ہوا، جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ:۔

"مغربی تعلیم۔ یورپی معاشرت اور فرنگی مادہ پرستی کا ایک خطرناک اثر ہندوستان میں یہ ہوا کہ بہت سے لوگ آزادی مذہبی بلکہ لامذہبی کا شکار ہو رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ارکانِ دین میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے کوئی سمجھتا ہے کہ دین کی مطلق ضرورت نہیں، کسی کا خیال ہے کہ دین و علماء مذہبی آزادی و ترقی کے لئے سنگِ راہ ہیں اور جس قدر جلد ممکن ہو ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ غرض آزادی مذہبی مختلف صورتوں میں رونما ہو رہی ہے اور روز بروز اندر ہی اندر جدید نسل کے قلوب میں گھر کر رہی ہے، یہاں تک کہ بعض نام نہاد حاملانِ دین بھی اس سیلاب میں بہہ گئے ہیں۔ ہندوستان کے نوجوان مختلف جماعتوں کے نام سے منظم ہو رہے ہیں جو علی الاعلان کہتے ہیں کہ کسی مذہب کو زندہ نہ رہنے دو۔ اور قصرِ مذہب کی اینٹ سے اینٹ بجا دو، ان لوگوں نے مذہب کے خلاف عام بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ اور نئے فتنہ کے احیاء و ابقاء میں سرگرمی کا اظہار کر رہے ہیں، اس تہلکہ عظیم سے اگرچہ دیگر اقوام کو بھی نقصان پہونچے گا، لیکن وہ قوم (مسلمان) سب سے زیادہ خسارہ میں رہے گی، جن کی قومیت، سیاست اور وطنیت سب مذہب ہی ہے اور جس کی اُخروی نجات کا انحصار اسلام پر ہے، ان حالات اور ان کے خوفناک نتائج کو محسوس فرما کر انجمن موید الاسلام نے ہندوستان کے ہر طبقہ کے علماء کو مدعو کیا اور مقتدر داعیانِ ملت سے بھی مشورہ لیا گیا۔ اس جلسۂ مشاورت نے بالاتفاق مقتدر علماء کی ایک کمیٹی بنا دی جو اسباب لامذہبی کے انسداد پر غور کرے گی۔ سردست ہم دستخط کنندگان یہ اعلان کرنا فرض خیال کرتے ہیں کہ قوم مسلمین کی پناہ و حفاظت اور اس کی دینی و دنیوی نجات اسلام اور صرف اسلام ہی سے وابستگی پر منحصر ہے۔ آزاد یورپ کی ترقی یافتہ قومیں آج تک نام نہاد مسیحیت کی پرستش کرتی ہیں۔ بائیس کروڑ ہندو برادرانِ وطن اس کی سرفروشانہ جد و جہد کر رہے ہیں کہ ویدک دھرم کی ہر رسم کی حفاظت کی جائے۔ ہمارا اسلام دینِ فطرت ہے اور خالقِ فطرت کی حکیمانہ تشریحات کا مقدس مجموعہ ہے وہ جہاں روحانیت و اخلاق کا بحرِ ذخار ہے، وہاں تجی

وطنیت اور سچی آزادی کا بھی علمبردار ہے، لہٰذا ہر کلمہ گو کا فرض ہے کہ وہ پکّا اور سچّا مسلمان بنے۔ اسلام ہی اس کی عقاید کی روح ہے اور وہی اس کی زندگی کے ہر لمحہ میں رہبر و راہ نما۔ نیز اُسے چاہئے کہ اپنے قول و فعل کی تمام طاقتوں سے لامذہبی اور الحاد کو پامال کرے اور خدا کے بندوں کو خدا کی بغاوت سے روک دے۔ اس بارے میں داعیٔ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے بہترین ہادی ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ دین و دُنیا کے اس محسنِ اعظم کی ہر سنت کو زندہ رکھیں اور خود زندہ رہیں۔"

اس کے بعد بعض علماء کرام کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور یہ ڈراما اس طرح ختم ہوا کہ دستور العمل بنانے کے لئے مولانا .... کا انتخاب کیا گیا۔

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

یہاں تو اس "اہم جلسہ" کی کارروائی کا بیان تھا جو لامذہبیت و دہریت کے انسداد کے لئے قایم ہوا، لیکن آیئے ساتھ ہی ساتھ اس "جلسہ" اور "ارکان جلسہ" کی حقیقت پر بھی اک نظر ڈال لیں، کیونکہ ممکن ہے یہ کہانی پھر دوبارہ آپ کے سننے میں نہ آئے۔

سب سے پہلا سوال ان جلسہ کرنے والوں سے یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو علماءِ کرام میں کس استحقاق سے شمار کرتے ہیں اور ایک عالم کی کیا خصوصیات ہیں جن کا حامل وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

کیا درسِ نظامی کی چند کتابوں یا اس سے بھی زیادہ "یک خرو ار کتابوں" کا مطالعہ ایک شخص کو علماء کرام میں شامل کر سکتا ہے؟ کیا عالم نام ہے صرف اس شخص کا جو بالکل مقلدانہ و غیر مجتہدانہ طور پر چند مسایل فقہیہ کا علم رکھتا ہو، کیا ایک عالم کا تشخص منحصر ہے محض اس امر پر کہ اس نے چند کتابیں حدیث کی پڑھ لی ہوں، کیا عالم کی پہچان یہی ہے کہ وہ عمامہ و عبا سے کبھی منفک نظر نہ آتا ہو، کیا عالم حقیقتاً وہی ہے جو صرف خوش بیان واعظ اور خوش الحانی سے مثنوی مولانا روحی کے اشعار پڑھ سکتا ہو؟ کیا عالم اس کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو مسجود دنیا سمجھے اور اپنے سوا سارے عالم کو حقیر و ذلیل۔ اگر واقعی ایک شخص انھیں خصوصیات کا حامل ہونے کے بعد عالم کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے تو کس کے منھ میں زبان ہے کہ اس جلسہ کی اہمیت سے انکار کر سکے۔ لیکن اگر عالم کہتے ہیں نبض شناس فطرت کو، اصلاح ملک و قوم کے لئے تمام دنیاوی اغراض کو ترک کر کے ایثار و قربانی کا عملی درس دینے والے کو، اس صالحیت و صلاحیت کے حامل کو جس کے لئے وراثت ارض کا وعدہ خدائے قدوس نے کیا ہے، ان صلحاءِ بے نفس کو جو سینوں کو بغض و حسد سے، دلوں کو نفاق کے دریا سے پاک کر کے محض خالصۃً للہ ہدایات خداوندی پر عامل ہو کر دوسروں کے لئے دلیل راہ بنتے ہیں، اور اگر عالم کی ذات عبارت ہے اس استقامت عمل۔ اس استواری عزم اور اس بلند اخلاق سے جس کا لازمی نتیجہ دنیا میں ہمیشہ اور صرف ایک (انتم الاعلون) ظاہر ہوا ہے، تو میں کہوں گا کہ ان علماء کرام کے لئے یہ زیادہ موزوں ہوتا اگر وہ دوسروں کے ایمان کا جایزہ لینے سے پہلے خود اپنے ہی اخلاق و اعمال کا احتساب کرتے اور دوسروں کی اصلاح پر متوجہ ہونے کے بجائے پہلے وہ اپنی ہی اصلاح کی کوشش کرتے۔

"تو برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی"

آج علماء کرام کی ایک جماعت ملک کے اندر دہریت و لامذہبیت کی اشاعت پر ماتم کرنے کے لئے تو فراہم ہو جاتی ہے، لیکن

اس سے قبل کبھی اس کو یہ غور کرنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ اگر دنیا لامذہبیت کی بلا میں گرفتار ہے تو وہ خود اپنے آپ کو صراطِ مستقیم سے منحرف ہونے میں کس نوع کا مجرم قرار دیتی ہے۔

جہاں تک اعلان و نمایش کا تعلق ہے بے شک یہ اپنے آپ کو علماء کرام کہنے والا گروہ بڑی اہم حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یقیناً وہ نمازیں زیادہ پڑھتا ہے، اس کی پیشانی پر اثرِ سجود بھی نمایاں ہے، صیام کے سلسلہ میں ہزاری روزہ بھی ترک نہیں کرتا اور حج کو جاتا ہے تو وہاں سے خاکِ شفا کی تسبیح اور ماءِ زمزم بھی اپنے احباب و اعزہ کے لئے لاتا ہے۔ لیکن اگر ایمان و اسلام کا تعلق بطون سے ہے، اگر عبادات سے مقصود تزکیۂ نفس و اخلاق اور تصفیۂ قلب و روح ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ محشر میں ان علماء کرام کے لئے ہم جاہلوں اور گنہگاروں سے علٰحدہ کوئی دوسری صف قایم کی جائے۔

آج یہ "علماء کرام" کا گروہ اس کا تو شاکی نظر آتا ہے کہ "لوگ مذہبی آزادی بلکہ لامذہبی کا شکار ہو رہے ہیں" لیکن خود اپنے گریبان میں سر ڈال کر یہ غور کرنے کی توفیق اسے کبھی نہیں ہوئی کہ اس کا اصل سبب کہیں انھیں کی ذات بابرکات تو نہیں ہے۔

وہ زمانہ گیا جب ایک طرف "حق را بسجودے و نبی را بہ درودے" کا افسوں کارگر ہو جاتا تھا۔ اب دنیا سخت اضطراب میں مبتلا ہے، عقلِ انسانی مطالبہ کر رہی ہے کہ سب سے زیادہ مدعیِ صداقت مذہب سب سے زیادہ ثبوت اپنے فطری ہونے کا پیش کرے۔ لیکن ہمارے علماء کی تنگ نظری، تہی مایگی و ناداری کا یہ حال ہے کہ کافر کہدینے اور وعید جہنم سے ڈرانے کے سوا اور کوئی ذریعۂ دفاع ان کے پاس نہیں ہے۔

جس وقت کسی گوشہ سے یہ صدا آجاتی ہے کہ "علماء کو جلد سے جلد ختم ہو جانا چاہئے کیونکہ وہ آزادی اور ترقی کیلئے سنگِ راہ ہیں" تو یہ گھبرا اٹھتے ہیں، لیکن انھیں یہ خبر نہیں کہ جو چیز عملاً بے کار ہوتی ہے وہ آپ ہی ختم ہو جایا کرتی ہے۔

وہ یہ زبان سے تو یہ ضرور کہتے ہیں کہ:-

"ہمارا اسلام دینِ فطرت ہے، خالقِ فطرت کی حکیمانہ تشریح کا مقدس مجموعہ ہے، وہ سچی وطنیت اور سچی آزادی کا علمبردار ہے"۔

لیکن عمل کے لحاظ سے ان کی تعلیم یہی ہوتی ہے کہ اسلام نہ وطنیت کا حامی ہے نہ آزادی کا علمبردار، نہ اس میں کوئی حکیمانہ تعلیم ہے اور نہ مصلحانہ تبلیغ، بلکہ وہ بالکل غیر فطری، غیر الٰہی اور غیر مہذب مذہب ہے جو دنیا میں صرف خود غرضی اور نفس پرستی کی اشاعت کے لئے رونما ہوا۔

ایک عالم یہ ضرور کہتا ہے کہ:-

"داعیِ اسلام رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے بہترین ہادی ہے"۔

لیکن نہ وہ اسوۂ حسنہ کے مفہوم سے واقف ہے اور نہ داعیِ اسلام کے اخلاق و عادات سے، اس نے اس قسم کے چند الفاظ محض گرمیِ سخن قایم رکھنے کے لئے یاد کر لئے ہیں، قلب و روح کی حرارت کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

پھر کیا یہ علماء تاریخ اسلام کے اس دور سے واقف نہیں جب عہدِ بنی عباسیہ میں اسلام کو ایک خدائی و فطری مذہب کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا اور دیگر ملل و مذاہب کے علماء کو اس کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی گئی تو کتنے جدید مسایل سامنے آئے اور اس عہد کے علماء و متکلمین نے کس وسعتِ نظر سے کام لے کر صرف معقولات کی مدد سے فریقِ مخالف کو اسلام کا

مدّاح بنا لیا۔ پھر آج جبکہ عباسیہ کے وقت سے زیادہ علم کی روشنی پھیل چکی ہے، اُس وقت سے کہیں زیادہ تنقید وتحقیق کے ذرایع لوگوں کے ہاتھ آگئے ہیں، آپ کے منقولات کس کام آسکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جماعتِ علماء محض ایک (FOSSIL) "متحجر" چیز ہے اور موجودہ کاروبارِ حیات میں اس کا وجود قطعاً باعثِ حیات و زندگی نہیں۔

میں ان تمام "علماءِ کرام" سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت تک انھوں نے کونسی دینی خدمت انجام دی ہے؟ کیا حلال وحرام کے معمولی مسایل بتا دینا، کیا مساجد میں امامت کر لینا، کیا مجالس میلاد میں وعظ کہہ دینا، کسی آریہ کی کتاب کا جواب لکھ دینا، تقلید و عدم تقلید کے مسئلہ میں باہم دست و گریباں ہو جانا، ایسی اہم دینی خدمات ہیں جن کی بنا پر وہ اپنے آپ کو علماءِ کرام کی صف میں شامل کر سکتے ہیں اگر ایسا ہے تو میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ:- "وائے گر درپسِ امروز بود فردائے"

اس جلسہ میں متعدد علماء نے انجمن کے مقاصد کی ایسے پُر جوش عزم کے ساتھ تائید کی کہ معلوم ہوتا تھا جو کمر ہمت آج یہاں کسی گئی ہے وہ داورِ حشر ہی کے سامنے کھلے تو کھلے، لیکن میں اس باب میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ:-

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

یہ بات اب سے ۴۰ سال پہلے کی ہے اور اس دوران میں میرے اور علماءِ کرام کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے۔ "خوشگوار" کا لفظ میں نے محض از راہِ تہذیب و متانت استعمال کیا ہے، ورنہ در اصل مجھے یہ کہنا چاہیے کہ مجھ کو اذیت پہونچانے کا کوئی ذریعہ ایسا نہ تھا جو ان مقدس حضرات نے اختیار نہ کیا ہو مگر یہ داستان بہت طویل ہے اور تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، لیکن اس سلسلہ میں ایک حقیقت کا انکشاف ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس دورِ اضطراب میں مجھے خود اپنے خیالات و جذبات پر غور کرنے کا زیادہ موقع مل گیا اور بار ہا خود میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ "کیا واقعی میں ملحد و بیدین ہوں"۔ اور ہر بار مجھے یہ ماننا پڑا کہ اگر خدا کا وجود، رسول کی رسالت، قرآن کی عظمت اور معتقداتِ اسلام ـــــ ان سب کی حقیقت وہی ہے جو عام طور پر مذہبی علماء کی طرف سے بتائی جاتی ہے تو میں یقیناً "مسلمان نہیں ہوں" اور میرے لئے مذہب میں کوئی گنجایش نہیں۔

لیکن چونکہ اس سلسلہ میں مجھے تصورِ باری کے مسئلہ پر زیادہ فکر سے کام لینا پڑا، اس لئے مجھے کم از کم یہ اطمینان تو ہو ہی گیا کہ میں مسلمان ہوں یا نہ ہوں لیکن موحد و خدا پرست ضرور ہوں اور خدا کی عظمت کا جو تصور میرے ذہن میں ہے وہ یقیناً اس تصور سے بہت بلند و ارفع ہے جو مذاہب نے قایم کیا ہے اور یہیں سے عقبیٰ و آخرت، عذاب و ثواب، حشر و نشر اور حور و قصور کے تمام وہ تصورات یک لخت محو ہو گئے جن پر تقریباً تمام مذاہب کی بنیاد قایم ہے ـــ ایسا کیوں ہوا؟ ـ اس کا جواب آپ کو آیندہ صفحات میں کافی تفصیل کے ساتھ ملے گا، اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں، لیکن اس جگہ ایک بات (جس کا ذکر غالباً آپ کو اس سالنامہ میں کسی دوسری جگہ نہ ملے) ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس جستجو کے سلسلہ میں اس وقت میں جس منزل سے گزر رہا ہوں وہ اعترافِ عجز و نارسائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مدعائے سینۂ موہوم ست
اینقدر بس کہ نالۂ داریم

گُتھی سُلجھ گئی

میں ایک سول انجینئر ہوں۔ میرا باپ ایک عام کلرک تھا۔ میری تعلیم پر جو رقم خرچ ہوئی، اس کے ذریعہ کا علم آج سے پانچ برس پہلے مجھے اُس روز ہوا جب میں اپنی پہلی تنخواہ گھر لایا۔ میرے باپ نے مجھے بتایا کہ اُس نے میری ماں کے تمام زیورات بیچ کر قومی بچت سرٹیفکیٹ خرید لیے تھے۔ بعد میں اِس سرمائے کو وہ باقاعدہ بچت سے بڑھاتا بھی رہا۔ اُس نے مجھے نصیحت کی کہ میں بھی باقاعدہ بچت کروں اور اِس طرح روپیہ جمع کرتا رہوں۔ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنے باپ کا کہا مانا اور آج میرے پاس اتنا سرمایہ جمع ہو چکا ہے کہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے برٹش جا رہا ہوں۔

قومی پلان بچت سرٹیفکیٹوں اور چھوٹی بچت کی دوسری سرکاری اسکیموں میں لگایا ہوا روپیہ آپ کو مع سود واپس مل جاتا ہے، جس پر کوئی ٹیکس نہیں لگتا۔ اس سے نہ صرف آپ کو بلکہ قوم کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، کیونکہ اس سے ملک کی تعمیر و ترقی میں مدد ملتی ہے۔

۱۲ سالہ
قومی پلان بچت سرٹیفکیٹ

- ۱۴ر۵ فی صد سود سالانہ جو ٹیکس سے بری ہے۔
- ۵، ۱۰، ۵۰، ۱۰۰، ۵۰۰، ۱۰۰۰، ۵۰۰۰ روپے کی مالیت کے یہ سرٹیفکیٹ ہر ڈاک گھر سے خریدے جا سکتے ہیں۔
- بھارت سرکار سے ضمانت شدہ۔

چھوٹی بچتوں کی دوسری سرکاری اسکیمیں

۱۰ سالہ
ٹریژری سیونگز ڈپازٹ سرٹیفکیٹ
پوسٹ آفس
سیونگز بنک ڈپازٹ

DA 58/325

قومی بچت آرگنائزیشن

مزید تفصیل اور شرائط و قواعد نیشنل سیونگز کمشنر ناگپور یا اپنے صوبے کے ریجنل نیشنل سیونگز آفیسر سے معلوم کیجیے

مذہب کا افادی و عقلی تصوّر

مذہب کا لفظ سنتے ہی سب سے پہلے خدا کا تصور ہمارے سامنے آجاتا ہے، یہ ممکن نہیں کہ ہم مذہب کا ذکر کریں اور خدا کی طرف ہمارا خیال منتقل نہ ہو۔ کیونکہ ذہن انسانی میں یہ بات مرتسم ہو چکی ہے کہ مذہب خدائی چیز ہے اس کے وضع کرنے میں انسان کو مطلق کوئی دخل نہیں۔ یہ ہے سب سے پہلی چیز جس نے نوع انسانی میں انتشار و افتراق پیدا کیا اور جس کا سلسلہ کسی نہ کسی نہج سے آج تک جاری ہے۔

اس مسئلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ مذہب اور خُدا کے تصوّر میں تفوق زمانی کس کو حاصل ہے یعنی انسان کا ذہن پہلے خدا کی طرف منتقل ہوا یا مذہب کی طرف۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے خدا کا تصوّر اس کے ذہن میں آیا ہوگا اور مذہب کا تصوّر بعد کو، کیونکہ مذہب کی بنیاد خُدا کے تصوّر پر قایم ہے۔

اس لئے سب سے پہلے ہم کو یہ غور کرنا چاہیئے کہ خُدا کے تصوّر کی طرف کس چیز نے انسان کو مایل کیا۔ تفصیل سے قطع نظر اجمالاً یوں سمجھ لیجئے کہ خدا کے وجود کا بنیادی خیال انسان میں اس کو اپنی بیچارگی اور بے بسی کے احساس سے پیدا ہوا۔ آفرینش کی ابتدا نباتات سے ہوئی، اسکے بعد حشرات و حیوانات وجود میں آئے اور سب سے اخیر میں انسان۔ لیکن نباتی و حیوانی دور ایسا نہ تھا کہ خُدا کا تصوّر کیا جا سکتا، کیونکہ نباتات و حیوانات تعقل سے عاری ہیں، البتہ جب انسان پیدا ہوا جو سب سے پہلی صاحب ادراک و تفکر مخلوق تھی تو خدا کا تصور بھی شروع ہوا، اور اس تصور کی ابتدا انسان کے احساس مجبوری سے ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ زندہ رہنے یا زندگی بسر کرنے کے لئے اسے بہت سی متصادم قوتوں سے شکست کھانا پڑتی ہے۔ تو قدرتاً اس کا خیال اس طرف منتقل ہوا کہ کوئی قوت اور بھی ضرور ایسی ہے جو اس کی خواہشوں کو پورا نہیں ہونے دیتی اور اس کی اکثر کوششوں کو ناکام بنا دیتی ہے۔ لیکن اس قوت کا تصور وہ اپنی مادی دُنیا اور ماحول سے ہٹ کر نہ کر سکتا تھا، اس لئے اپنے حواس ظاہری ہی کی مدد سے اس نے اس قوت کے سمجھنے کی کوشش کی۔

سورج کا طلوع و غروب، چاند کا گھٹنا بڑھنا، برق و باراں کی شدت، آندھیوں کی شورش اور اسی طرح کے بہت سے مظاہر فطرت تھے جن کے نتائج انسان دیکھتا ہوگا اور ان طبیعی مظاہر کی عظمت و قوت کا خیال اس کے دل میں مرتسم ہوتا جاتا ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ انھیں پوجنے لگا تاکہ وہ انھیں خوش رکھ سکے، اور یہ تھی ابتدا خُدا کے تصور اور اس کی پرستش کی جس نے رفتہ رفتہ مختلف ممالک و ماحول میں گوناگوں صورتیں اختیار کرلیں، اور متعدد دیوتاؤں کو جنم دیا۔

الغرض اس سے انکار ممکن نہیں کہ خُدا کے وجود کو تسلیم کرنا انسان کی فطری مجبوری تھی، حقیقت آگاہی نہ تھی، ذاتی تاثر کا نتیجہ تھا سماوی الہام و القانہ تھا۔

جب رفتہ رفتہ ذہنِ انسانی میں ترقی ہونے لگی تو خدا کے تصور کی نوعیت بھی بدلتی گئی، عہد تاریک میں خدا کا تصور صرف دیوتاؤں اور بتوں تک محدود تھا۔ لیکن اس کے بعد جب ترقی یافتہ اخلاقی مذاہب کا دور آیا تو خُدا کا تصور ضرور بلند ہوگیا یعنی بتوں اور دیوتاؤں کی

سطح سے اس کی سطح اونچی ہوگئی، لیکن پھر بھی جن صفات کے ساتھ اس کو متصف کیا گیا اور جن الفاظ سے اس کو یاد کیا جانے لگا، وہ بدستور اسی مادی دنیا کے تاثرات و تجربات سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی وہ اسے "غیر مادی قوت" تو تسلیم کرتے تھے، لیکن اس کا ذکر اس طرح کرتے تھے گویا وہ حواس ظاہری کے ذریعہ سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ کے زمانہ میں خدا سے بات بھی کی جا سکتی تھی، اور عیسیٰ کے زمانہ میں وہ کسی کو اپنا بیٹا بھی بنا سکتا تھا۔ اسلام نے بے شک خدا کا تصور کافی پاکیزہ و منزہ پیش کیا اور گو اس کے بتائے ہوئے اسماء صفات بھی اکثر وہی تھے جو اس دنیا کے تاثرات و تجربات سے تعلق رکھتے ہیں (گو ان کا مفہوم غیر مادی بھی لیا جا سکتا ہے) لیکن اسی کے ساتھ اس نے بعض ایسے الفاظ سے بھی خدا کا تعارف کرایا جو مذہبی دنیا کے لئے بالکل نئے تھے اور ماورائی کیفیت سے تعلق رکھتے تھے، یعنی اگر اسلام نے خدا کو رحمان، رحیم و عادل وغیرہ ناموں سے منسوب کیا (حالانکہ در اصل ان کا مفہوم بھی وہ نہیں ہے جیسا عام طور پر سمجھا جاتا ہے) تو اسی کے ساتھ اس نے خدا کو کل اور "ہو الاول ہو الآخر" بھی ظاہر کیا اور خدا کی یہ تعبیر و توصیف یقیناً اس قدر جامع و مکمل ہے کہ موجودہ غیر معمولی علمی ترقیوں کے زمانہ میں بھی وہ بہترین سائنسی اصطلاح قرار پا سکتی ہے۔

مذاہب کے اس دور سے ہمیں واسطہ نہیں جب ہر قبیلہ و خاندان کا خدا یا بت ایک دوسرے سے جدا تھا اور خدا کا تصور یکسر مادی تھا، لیکن وہ اخلاقی مذاہب ضرور قابل توجہ ہیں جنھوں نے الہامی کتابیں رکھنے کا دعوے کیا اور اس الہامی لٹریچر کے پیش کرنے والے کو نبی و رسول کے لقب سے یاد کیا، پھر اگر ان مذاہب کی تعلیم و تبلیغ صرف اجتماعی اصلاح تک محدود رہتی تو آج بھی کسی کو اختلاف نہ ہوتا، لیکن چونکہ اسی کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ انبیاء و رسل جو کچھ کہتے ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ ان کے الفاظ، خدا ہی کے الفاظ ہیں تو مذہب کا تعلق خدا کے علاوہ انسان سے بھی ہوگیا، یعنی ضروری ہوگیا کہ خدا کے ساتھ ساتھ اس کے ایک نائب کو بھی مانا جائے جو خدا ہی کی طرح بہت سی محیر العقول باتیں دکھانے پر قادر ہے، اور یہ تھی اولین بنیاد عقل و مذہب کے تصادم کی۔

اس میں شک نہیں کہ اصول اخلاق پر عمل کرنے کے لئے عقیدۂ الہام و نیابت خداوندی و امکان خوارق عادات اول اول مصلحتاً ضروری تھا لیکن بعد کو جب مذہب کی حقیقی غایت متعین ہوگئی اور اس کو محض اخلاقی اصلاح کا ذریعہ قرار دیا گیا تو پھر اس کی ضرورت نہ تھی کہ مذہب کے لئے خدا کے تصور کے ساتھ کسی اور ایسے تصور کو بھی ضروری قرار دیا جاتا جو مادی دنیا سے تعلق رکھتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور اب موجودہ علمی دنیا میں جو محض حقایق کو دیکھتی ہے، تمام مذاہب کی طرف سے شکوک پیدا ہونے لگے اور اس سلسلہ میں بہت سے ایسے مسایل زیر بحث آگئے جنھوں نے مذاہب کے اکثر معتقدات کو متزلزل کر دیا --- پھر آپ اس کو کفر و الحاد کہئے یا کچھ اور، اس کا ظہور، اس ترقی یافتہ دور فکر و تعقل اور عہد استقراء و استقصا، میں ضروری تھا۔

اگر انبیاء و رسل کو محض مصلح اخلاق کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا اور انھیں خدا کا رسول و نائب تسلیم کرنا مذہب کا ضروری جزو نہ قرار دیا جاتا تو بات آگے نہ بڑھتی، لیکن چونکہ ہدایات اخلاق کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت ایسی باتیں تسلیم کرنے پر بھی مجبور کیا گیا جن کا تعلق اس دنیا سے نہ تھا اور نہ جنھیں ہر شخص سمجھ سکتا تھا، اس لئے لوگوں کو چون و چرا کا موقع مل گیا۔

اگر مذاہب صرف اصول اخلاق کی ترویج پر اکتفا کرتے اور خدا کی عظمت و جلالت ظاہر کرنے کے لئے وہ دنیاوی بادشاہوں کا سا تصور پیش کر کے اس کا جذباتی ہونا ظاہر نہ کرتے اور اس کی بنیاد پر حیات بعد الموت، جزا و سزا، بہشت و دوزخ وغیرہ کے جھگڑے پیدا نہ کرتے تو شاید مذہب و عقل کی جنگ کبھی شروع نہ ہوتی اور دنیا ان خونریزیوں سے محفوظ رہتی جن سے اسے دوچار ہونا پڑا۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ابتدا ہی میں خدا کا تصور صحیح قایم نہ ہو سکا اور نہ ہو سکتا تھا اور جو تصور قایم کیا گیا

اس کو جبر و قوت سے تسلیم کرایا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مذاہب سلطنت و حکومت سے محروم ہو گئے تو عقل نے ان کی جگہ لے لی۔ جس کا دوسرا نام اہل مذاہب نے کفر و الحاد رکھدیا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ جس حد تک بانئین مذہب کا تعلق ہے، وہ اس باب میں بڑی حد تک ناقابل الزام ہیں لیکن جب ان انبیاء کے بعد ان کے حواریئن و تابعین کا دور شروع ہوا تو انھوں نے مذاہب کی روح صلح و آشتی کو نظر انداز کر دیا اور انھیں حکومت و سلطنت میں تبدیل کرنے کے لئے ہر قسم کے مادی و غیر مادی ذرایع سے کام لے کر دنیا میں ہنگامہ پیدا کر دیا اور اپنے دُنیادی مقاصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو نہ صرف مادی و جسمانی غلبہ سے تعلق رکھتا تھا بلکہ انسان کے ذہن و فکر کو بھی مغلوب کرنے کے لئے مذہب کو روایتی حیثیت دے کر اسے تماشہ بنا دیا۔

جغرافیائی دور سے قطع نظر جبکہ مذہب کا تعلق محض دیومالا اور خالص بُت پرستی سے تھا جب ہم اخلاقی و الہامی مذاہب کے موجودہ لٹریچر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بھی ہم کو وہاں بہت سی باتیں ایسی نظر آتی ہیں جنھیں عقل و تاریخ کی کسوٹی پر نہیں کسا جا سکتا لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمیں ان باتوں کو عین مذہب تسلیم کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور یہی وہ سب سے پہلی غلطی تھی جو تمام مبلغین مذاہب سے سرزد ہوئی اور بدقسمتی سے اسلام بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔

جس حد تک جذباتی عقاید کا تعلق ہے اسلام کی بنیاد صرف عقیدۂ توحید ہے اور عملی عقاید کی اساس حُسن اخلاق و حُسن کردار کے سوا کچھ نہیں، اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کا تعلق تبلیغی نفسیات سے ہے نہ کہ مذہب سے۔

قرآن کی تعلیم ان دونوں باتوں پر مشتمل ہے، یعنی اگر اس نے ایک طرف عقیدۂ توحید اور اصلاح اعمال کو بنیادی چیز قرار دیا تو دوسری طرف تبلیغی نفسیات کے پیش نظر ان باتوں کا بھی ذکر کر دیا جو عام ذہن انسانی کو متاثر کر سکتی تھیں۔ جن میں چند باتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مثلاً عہد عتیق کی روایات، حیات بعد الموت، جزا و سزا، بہشت و دوزخ، معجزے و خوارق عادات وغیرہ لیکن اگر نظر غایر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے امم قدیمہ کی داستان کو تاریخی حقیقت کی حیثیت سے پیش نہیں کیا بلکہ محض اعتبار و بصیرت کی غرض سے۔ اور نہ قرآن کے بتائے ہوئے مابعد الطبیعیاتی عقاید بھی اس نقطۂ نظر سے پیش کئے گئے کہ وہ کوئی علمی حقیقت رکھتے ہیں، بلکہ محض نفسیاتی حیثیت سے تاکہ لوگ ان کی وساطت سے قرآن کی صحیح تعلیم پر متوجہ ہوں اور دُنیا میں بلند مرتبۂ انسانیت حاصل کر سکیں۔

اس بحث کو زیادہ واضح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ متعین کر لیا جائے کہ مذہب کا حقیقی مقصود کیا ہے اور پھر اسی کے پیش نظر اس کی تمام معتقدات و تعلیمات پر غور کیا جائے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب کا حقیقی مقصود، انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانا تھا، یعنی اس کو تمام حیوانی جذبات سے جدا کر کے ایک ایسی معقول پسندانہ سطح پر لے آنا جو دنیاوی ترقی و امن و سکون کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص خواہ وہ کسی قوم و ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنے افعال و کردار کے لحاظ سے ایسا ہی معقول ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے مذہب کی حقیقت و غایت کو پالیا ہے اور ہم اسے مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ان تمام عقاید کو بھی تسلیم کرے جن کا ماننا مذہب نے ضروری قرار دیدیا ہے۔ اب آیئے اسلام کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ پر غور کریں۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام کی حقیقی بنیاد چند باتوں کے تسلیم کرنے پر قایم ہے۔ وہ باتیں یہ ہیں:

اللہ، ملائکہ، کتب الہامی، یوم آخرت، حشر و نشر، پر ایمان لانا اور اسی کے ساتھ یہ تسلیم کرنا کہ برائی یا بھلائی سب خدا کی طرف سے ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص ان تمام باتوں کو تسلیم نہ کرے گا تو وہ مسلمان نہیں کہلایا جا سکتا۔

اجتماعی نقطۂ نظر سے تو یہ کہنا بالکل درست ہے کیونکہ کسی جماعت یا قوم کے اتحاد کے لئے متحد العقاید ہونا ضروری ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی جائے کہ ان عقاید کے عقلی مفہوم متعین کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں اور انسان کی نجات انھیں عقاید پر منحصر ہے یا یہ کہ بغیر ان عقاید کے کسی شخص کے اخلاق درست ہو ہی نہیں سکتے (جو مذہب کا حقیقی مقصود ہے) تو اس کے تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ ایک شخص ان عقاید کو نہ ماننے یا ان کی عقلی توجیہ کرنے کے بعد بھی بلند اخلاق کا حامل ہو سکتا ہے اور ان عقاید کے تسلیم کرنے پر بھی خوش اطوار نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ کے عہد میں جماعتی حیثیت سے اسلام کی تنہا شرط خدا کی وحدانیت کا اقرار تھا جس کی تصدیق اس حدیث یا مشہور قول سے بھی ہوتی ہے کہ:- "من قال لا الٰہ الا اللہ فقد دخل الجنۃ" یعنی اس میں محمدؐ کو رسول اللہ ماننے کی شرط بھی شامل نہ تھی، دوسرا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جب صلحنامۂ حدیبیہ کا مسودہ آپ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اسے دیکھ کر حضرت علی سے قلم مانگا اور محمد رسول اللہ قلمزد کر کے محمد ابن عبداللہ لکھ دیا۔

اس کے معنے یہ تھے کہ آپ کبھی کسی کو اس بات پر مجبور نہ کرتے تھے کہ وہ آپ کو رسول اللہ ضرور مانے۔ لیکن خود آپ کی تعلیمات آپ کے بلند اخلاق، اور آپ کی تمام زندگی بجائے خود اتنی زبردست تبلیغ آپ کی نبوت و رسالت کی تھی کہ یہ ممکن ہی نہ تھا کوئی شخص خدا کی وحدانیت کا اقرار کرے اور رسول اللہ کی عظمت تقدس کا اعتراف نہ کرے، کیونکہ اسلام کا صحیح مفہوم لوگوں نے آپ ہی کے اقوال و کردار سے جانا اور اس کا اعتراف ہی در اصل آپ کی رسالت و نبوت کا اعتراف ہے۔

خیر یہ تو معاملہ صرف رسالت و نبوت کے اعتراف یا عدم اعتراف کا تھا، میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص سرے سے خدا ہی کو نہ مانے تو کیا نقصان ہے، کیا خدا کو نہ ماننے کے بعد اس کا بدکردار ہو جانا ضروری ہے، کیا ایک انسان خدا کا اقرار کئے بغیر مدارج انسانیت کو طے نہیں کر سکتا، کیا کسی شخص کا ضمیر خود نیک و بد کی تمیز میں معاون نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی بچّہ کی پرورش ایسے ماحول میں کیجئے جہاں، وہ خدا کا نام تک نہ سُنے اور بلندی اخلاق کی تعلیم اس کو محض فرایض انسانی کی حیثیت سے دی جائے، تو کیا وہ اتنا ہی اچھا انسان نہیں بن سکتا جتنا خدا کے وجود کا اقرار کرنے کے بعد بن سکتا ہے۔ اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذاہب خدا کے ماننے پر کیوں ہمیں مجبور کرتے ہیں، کیا اس لئے کہ واقعی انھوں نے خُدا کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور یہ حقیقت ایسی ہے کہ اس کا تسلیم کرنا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ یہ جاننے کے لئے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ مذاہب عالم نے خدا کو کیا سمجھا ہے اور کن الفاظ میں وہ خُدا کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں۔

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خدا کے تصوّر کی ابتدا انسان کے احساس مجبوری اور جذبۂ خوف و ہراس سے ہوئی اور فطری حوادث و مصائب کا سبب مختلف دیوتاؤں کو قرار دے کر ان کو خوش رکھنے کے لئے قربانی، ہون، بھوگ اور پوجا پاٹ شروع کر دی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ذہن انسانی نے ترقی کی اور اخلاقی مذاہب وجود میں آئے، لیکن دیوتاؤں سے ڈرنے کا بنیادی خیال جو اول اول انسان کے دل کے اندر پیدا ہوا تھا بدستور اپنی جگہ باقی رہا اور یہ بات اس کے ذہن سے نہ نکل سکی کہ خدا جو چاہے جیسا اور جو کچھ بھی ہو، وہ خوش بھی ہو سکتا ہے اور ناخوش بھی اور اسی اعتقاد کی بنا پر عبادت کو ضروری قرار دیا گیا کیونکہ خدا عبادت سے خوش ہوتا ہے اور جب وہ خوش

ہو گا تو یقیناً ہم کو فائدہ پہونچے گا۔

الغرض مذاہب نے خواہ کتنی ہی ترقی کی ہو، مادی اغراض و علایق سے ہٹ کر وہ خدا کا کوئی تصور پیش نہ کر سکے اور انھوں نے خدا کا ذکر اس طرح کیا گویا وہ دنیاوی بادشاہوں ہی کی طرح ایک بہت بڑا بادشاہ ہے اور یہی وہ تصور تھا جس کی بنیاد پر عذاب و ثواب، حشر و نشر، دوزخ و جنت کا عقیدہ وجود میں آیا، کیونکہ اگر خدا کو انعام و سزا کا مجاز و مختار قرار نہ دیا جاتا تو اس کی شوکت و جبروت کیونکر تسلیم کرائی جا سکتی تھی۔

اسلام کے مروجہ عقاید کی اگر ہم کوئی عقلی تاویل نہ کریں تو ہمیں وہاں بھی خدا کا تصور زیادہ تر خدا کا مادی "تشخص" ہی نظر آتا ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ قرآن میں خدا کو جن جن ناموں سے پکارا گیا ہے، ان میں بعض نام ایسے بھی ہیں جو یقیناً مادی تشخص سے بالکل علحدہ ہیں اور ان کے پیش نظر ہم دوسرے ناموں کا مفہوم بھی غیر مادی متعین کر سکتے ہیں۔ مثلاً خدا کو اول و آخر کہنا، ظاہر و باطن ظاہر کرنا، یا اس سے بھی زیادہ عمیق و وسیع معنی میں اُسے کل سے تعبیر کرنا ایسی باتیں ہیں جو یقیناً خدا کے تصور کو مادیات سے جدا کر دینے والی ہیں اور اگر غور کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ قرآن کے بتائے ہوئے دوسرے اسمائے الٰہی میں کوئی نام ایسا نہیں ہے جس کا مفہوم ہم غیر مادی نہ قرار دے سکیں۔

بہرحال تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے خدا کا تصور بہت بلند پیش کیا، اتنا بلند کہ موجودہ علمی دنیا میں بھی اسے ساقط الاعتبار نہیں کر سکتے۔

اہلِ مذاہب کا خیال ہے کہ دنیا میں الحاد و انکار کا سبب سائنس کی ترقیاں ہیں، لیکن یہ خیال قطعاً بے بنیاد ہے۔ میں تو اس کے برخلاف یہ سمجھتا ہوں کہ سائنس نے جو عظمت و جلالت خدا کی ثابت کی ہے وہ اہلِ مذاہب کے تصور میں بھی کبھی نہ آ سکتی تھی، کیونکہ سائنس ہی وہ چیز ہے جس نے خدا کو قیامرہ دا کا سرہ کی صف سے نکال کر ازلی و ابدی قوت کے تخت پر متمکن کیا اور جب وہ اس قوت کی وسعت کا اندازہ کرنے سے عاجز ہو گئی تو صاف صاف کہدیا کہ:-

کنہ ذاتِ تو بہ ادراک نشاید دانست
ویں سخن نیز بہ اندازۂ ادراکِ من ست

یہی وہ بات ہے جو صوفیۂ اسلام نے ظاہر کی اور اسی بنا پر میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ اسلام کا صحیح مفہوم صرف صوفیہ نے سمجھا اور علما و ظاہر کبھی حقیقت تک نہیں پہونچ سکے۔

ہر چند خالص عقلی و منطقی نقطۂ نظر سے صوفیہ کے عقاید پر بحث نہیں کی جا سکتی اور چونکہ وہ صرف روحانی دنیا کے قایل ہیں اور اس مادی دنیا کو برزخی دور کی ایک پایہ دار چیز سمجھتے ہیں، اس لئے ہم ان سے کسی عقلی توجیہ کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذاہب کی نہ سمجھ میں آنے والی باتوں سے گھبرا کر جب ہم اس حد تک نیچے اُتر آتے ہیں کہ "عقل" سے دستبردار ہو جانا بھی ہمیں گوارا ہونے لگتا ہے تو پھر ہمیں پناہ تصوف ہی میں ملتی ہے۔ اور ہم یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دنیا کا امن و سکون اگر غیر عاقلانہ راہوں ہی سے حاصل ہو سکتا ہے تو کیوں نہ مذہبی فراست پر صوفیانہ بے عقلی کو ترجیح دیجائے۔ غالباً یہی وہ جذبہ تھا جس نے غالب کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا

بحث و جدل بجائے ماں، میکدہ جوئے کاندراں
کس نفس از جمل نزد، کس سخن از فدک نراند

مذاہب عالم میں اسلام کا مرتبہ

(۱)

تمہید

تخلیقِ انسان ہر چند یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ انسان کا وجود روئے زمین پر کب سے پایا جاتا ہے، لیکن وہ کوئی زمانہ ہو اس میں شک نہیں کہ انسان کے ساتھ مذہب بھی وجود میں آیا۔ ہر چند انسان نے اپنے خیالات و تجربات کو تحریر میں لانا صرف پانچ چھ ہزار سال سے شروع کیا ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس کی رفتار میدانِ ارتقاء میں یکساں نہیں رہی اور ماحول کا اثر اس پر ہمیشہ پڑتا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قومیں جلد ترقی کر گئیں اور بعض ابھی تک ظلمت و تاریکی کے دور میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ مذہب انسان کی زندگی کے ساتھ پیدا ہوا، گو زمانہ و ماحول کے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں بھی ہوئیں اور ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔

انسان کا مذہب ابتدا میں کیا تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا، یہ جاننے کے لئے ہم اقوام عالم کی دو قسمیں کرتے ہیں ایک وہ جو مدارجِ ارتقاء طے کرتے کرتے متمدن و مہذب ہو گئیں، دوسری وہ جو ہنوز غیر متمدن اور وحشی ہیں۔

تخلیقِ مذہب جب ذہن انسانی کا ابتدائی دور ختم ہوا اور اس میں سوچنے کی کیفیت پیدا ہوئی تو غالباً سب سے پہلے اس کی توجہ اپنے جسم کے سایہ کی طرف منعطف ہوئی ہوگی اور اس نے اس سایہ کو خود اپنا ہی ایک جزو یا زندہ "مثنیٰ" سمجھا ہوگا اسی کے ساتھ جب رات کو اس نے خواب دیکھے ہوں گے تو اس کو خیال میں یہ بھی آیا ہوگا کہ جب وہ سو جاتا ہے تو شاید اس کا سایہ دُنیا بھر کی سیر کرتا اور جب چاروں طرف رات کی تاریکی چھا جاتی ہے اور سائیں سائیں آواز آتی ہے، تو اس کا خیال بعض نظر نہ آنے والی چیزوں کی طرف منتقل ہوا ہوگا اور یہیں سے عقیدۂ روح کی ابتدا ہوتی ہے۔

آغازِ پرستش ابتدائے آفرینش میں دُنیا کی کوئی چیز کسی شخص کی خاص ملکیت نہ سمجھی جاتی تھی اور سب اشتراکی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن ہمیشہ یہ حالت قایم نہ رہی۔ بعد کو طاقتور نے کمزور کو دبانا شروع کیا اور "ادارۂ حقوق و ملکیت" قایم ہو کر رفتہ رفتہ سردار، راجہ و فرمانروا وجود میں آئے لیکن سرداری یا فرمانروائی صرف اسی دُنیا تک محدود نہیں سمجھی گئی بلکہ اس کے مرجانے پر بھی وہی احترام قایم رہا اور اس طرح دُنیا میں زندہ بادشاہ کی فرمانبرداری اور مُردہ بادشاہ کی پرستاری کا سلسلہ جاری ہو گیا جسے "عبادت و پرستش" کی ابتدا کہنا چاہئے۔

اختراعِ بہشت و دوزخ اس کے بعد انسان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کہاں جاتی ہے؟ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ وہ تاریک جنگلوں میں نظروں سے دور کسی مقام میں رہتی ہے، لیکن جب

جنگلوں میں کبھی کسی روح سے ملاقات نہ ہوئی تو یہ خیال ہوا کہ وہ یا تو برف پوش پہاڑوں پر رہتی ہے یا زمین کے نیچے کسی مقام پر چلی جاتی ہے اور یہیں سے سورگ و پاتال، بہشت و دوزخ، علیین و سجّین وغیرہ کی روایات پیدا ہوئیں۔

مقتدایانِ دین کا ظہور

ارتقاءِ تمدن کے ساتھ ساتھ جب انسان نے خانہ بدوشی چھوڑ کر ایک جگہ اقامت اختیار کی اور زراعت و فلاحت میں مصروف ہوگیا تو اس نے اپنے مختلف اغراض و مشاغل کے لحاظ سے مختلف دیوتا بنائے۔ انسان قدیم سمجھتا تھا کہ اس کی صحت و بیماری، زراعت و شکار وغیرہ کی کامیابی و ناکامی کا انحصار انھیں دیوتاؤں کی خوشنودی و برہمی پر ہے اور اسی لئے وہ پوجا پاٹ کو بہت اہمیت دینے لگا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ دیوتا بھی انسان کی طرح الحاح و زاری سے خوش ہوتے ہیں اور اگر خوشامد نہ کی جائے تو برہم ہو جاتے ہیں، اس طرح پرستش کے خاص مراسم قایم ہوئے اور جن لوگوں نے ان مراسم کے ادا کرنے میں مہارت حاصل کی، ان سے لوگ اپنی عبادت میں مشورہ لینے لگے اور ان کی خدمت کے بدلے میں کچھ نذرانہ بھی دیا جانے لگا۔ اسی طرح پنڈتوں، پجاریوں، ملاؤں، دستوروں، موبدوں، بھکشوؤں، پادریوں وغیرہ کی ابتدا ہوئی۔

پھر چونکہ اغراض و مقاصد میں کامیابی کا انحصار درحقیقت بھوتوں یا ارواح کی مدد پر نہیں ہے، اس لئے جب کبھی عبادت کرنے کے بعد بھی کسی شخص کا مقصد حاصل نہ ہوتا تھا تو وہ اپنے پجاری یا مقتدائے دین سے شکایت کرتا تھا اور یہ اپنا اعتبار و اعتماد قایم رکھنے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر ناکامی کی توجیہہ کرنا شروع کر دیتا تھا۔ یہ تھی ابتدا اس جھوٹ کی جو سب سے پہلے ارباب مذہب کی طرف سے بولا گیا اور جس نے آگے چل کر تمام دنیا کو مکر و فریب میں مبتلا کر دیا۔

بُت پرستی کی ابتدا

ارتقاءِ تمدن کے ساتھ انسان کے خیالات میں بھی ترقی ہوئی، وہ دنیا کی چیزوں کو دیکھتا تھا، ان پر غور کرتا تھا، وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ طوفان کیوں آتا ہے؟ دریا کیوں بہتا ہے؟ بادل کیوں گرجتا ہے؟ بارش کیوں ہوتی ہے؟ شیر و نہنگ اس قدر طاقتور و موذی کیوں ہیں؟ نباتات ہر سال از سرِ نو کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ ان سوالات کا جواب اس کے ذہن کی طرف سے یہ ملتا تھا کہ یہ سب ارواح کے کرشمے ہیں اور اس طرح ان ارواح کے بُت قایم ہوگئے اور ان کی پوجا ہونے لگی۔

قاعدہ ہے کہ چھوٹی بات سے بڑی بات پیدا ہوتی ہے۔ جب چھوٹی چھوٹی ارواح کا خیال آیا تو اس کے بعد بڑی بڑی روحوں کا خیال آنا بھی ضروری تھا، اس لئے سورج، چاند، ستارے، آسمان، زمین، بارش، بجلی، رعد وغیرہ کو بڑے بڑے دیوتاؤں سے منسوب کر کے ان کے مندر قایم کئے گئے اور اس طرح دُنیا میں بت پرستی کی ابتدا ہوئی۔

توحید کا تصوّر

جس طرح ایک قبیلہ دوسرے کو مغلوب کر کے طاقتور ہو جاتا تھا، اسی طرح بعد کو جب ایک بادشاہ نے دوسرے فرمانرواؤں کو مغلوب کر کے اپنا تابع بنا لیا تو انسان نے سمجھا کہ دیوتاؤں میں بھی کسی ایک دیوتا کو سب پر غالب آنا چاہئے اور اس طرح توحید کی بنیاد انسان کے دل میں پڑی۔

الحاد کی ابتداء

لیکن انسان کے دماغ کو قرار نہیں، جوں جوں عقل میں پختگی آتی گئی، خیالات میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ قصبوں اور شہروں کی بنیاد پڑی، کتابیں لکھی جانے لگیں۔ وسعتِ خیالات کے ساتھ عقاید پر مناظرے شروع ہوگئے۔ جن امور کا سرچشمہ بتوں یا دیوتاؤں کو سمجھا جاتا تھا ان کے اسباب و علل کچھ اور نکل آئے۔ کہیں گیس کا کرشمہ نظر آیا، کہیں برق و بخار کا عمل اور اس طرح تمام حوادثِ قدرت کی توجیہیں ہونے لگیں۔ یہ تھا پہلا صدمہ جو مذہب کو ہزاروں سال قبل پہنچا

اور جسے دنیا الحاد سے تعبیر کرنے لگی۔

اخلاقی مذاہب یہ حال ان مذاہب کا تھا جنھیں "مذاہب فطرۃ" کہتے ہیں۔ لیکن بالکل اسی طرح سے ابتداء ان مذاہب کی بھی ہوئی جنھیں "اخلاقی مذاہب" کہتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ مقتدایان مذہب اول اول اسی بات پر زور دیتے رہے کہ دیوتاؤں کی پوجا کرو، بھینٹ چڑھاؤ، قربانیاں کرو اور پجاریوں سے مدد لے کر ان کو نذر دو۔ جب رفتہ رفتہ تعلیم بڑھی تو انھوں نے انسان کی اہلی زندگی پر بھی اقتدار قایم کر لیا اور معیشت و معاشرت کے آئین و قوانین بنا کر انھیں دیوتاؤں سے منسوب کیا۔ یہ تھی بنیاد اخلاقی مذاہب کی۔

کتب مقدسہ اول اول پوجا پاٹ کی رسمیں بطور اسرار سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھیں لیکن بعد کو انسان نے حروف ایجاد کئے اور وہ لکھنے پڑھنے لگا تو مقتدایان دین نے ان ابتدائی اعتقادات اور قدیم رسموں کو مدوّن کرنا شروع کیا اور چونکہ حافظہ زیادہ کام نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے انھوں نے سُنی سُنائی باتوں سے ان کتابوں کو بھر دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ اپنی قوم کی عظمت و شان بھی بیان کی۔ پرانے بادشاہوں اور قوموں کے کچھ قصے بھی داخل کئے اپنے معبود کو دوسری قوموں کے معبودوں سے بہتر قرار دیا۔

اب چونکہ احیاء علوم و فنون کا زمانہ ہے، تمام باتیں سائنس کی روشنی میں دیکھی جاتی ہیں۔ اس لئے ماہرین فن نے علم "معیار المذاہب" بھی ایجاد کیا جس سے مختلف مذاہب کو بالمقابل رکھ کر جانچا جا سکتا ہے۔ اور ماہرین آثار قدیمہ نے تمدن قدیم کے وہ تمام خزاین بھی برآمد کر لئے جن کے ذریعہ سے کتب مقدسہ کے بیانات کی بخوبی جانچ کی جا سکتی ہے۔

الغرض قدیم مذاہب دراصل مظاہر قدرت کے متعلق سیدھی سادی خیال آرائی سے زیادہ کوئی چیز نہ تھے۔ لیکن جب بعد کو ان میں کچھ علمی دلیلیں اور اخلاقی اصول شامل ہو گئے تو مذاہب الہامی وجود میں آئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مذہب دوسرے کا مضحکہ اڑانے لگا تاہم تقابل مذاہب سے ہم کو یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بعض مذاہب دوسروں سے نسبتاً اعلیٰ ہیں۔

(۲)

تاریخی مذاہب

موجودہ تہذیب تمدن کا ایک ہی ساتھ آغاز اب سے پانچ چھ ہزار سال پیشتر ہوا، لیکن اس کی ابتدا ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہ ہوئی سب سے پہلے تمدن کی ابتداء کریٹ، مصر اور عراق میں ہوئی، یہ تینوں ملک قریب قریب واقع ہیں (اب سے پانچ چھ ہزار سال قبل سرزمین کریٹ علٰحدہ جزیرہ نہیں تھی، بلکہ مغربی ایشیا کا ایک حصہ تھی) اور ان تینوں ملکوں نے اپنا اپنا تمدن تقریباً ایک ہی ساتھ شروع کیا اور رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار تصویروں کے ذریعہ سے کرنے لگے جسے "خط صوری" کہتے ہیں۔

کریٹ کریٹ کا تمدن بھی اسی قدر بلند تھا، جیسا مصر کا۔ لیکن وہاں کے آثار قدیمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کوئی "مرد دیوتا" نہیں تھا۔ صرف ایک "دیوی" کی پرستش ہوتی تھی جسے دراصل "دھرتی ماتا" کہنا چاہئے۔

مصر مصر قدیم کا مذہب بھی اہل کریٹ کا سا تھا لیکن اس کی نوعیت بہت مختلف تھی۔ کریٹ میں صرف ایک دیوی تھی اور مصر میں دیوتاؤں اور دیویوں کی خاصی فوج موجود تھی۔ ان میں حیات عقبیٰ کا وہی عقیدہ موجود تھا جو آج کل مسیحیت یا اسلام میں نظر آتا ہے

مصری مذہب میں جانور کے سر رکھنے والے دیوتاؤں کی بڑی تعداد موجود ہے، لیکن مطالعہ مصریات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصر کا صرف طبقۂ جہلا ایسے دیوتاؤں کا معتقد تھا اور تعلیم یافتہ طبقہ ان دیوتاؤں کی پرستش نہیں کرتا تھا۔ بادشاہ امان حاطب رابع (AMEN HAIEB IV) کے عہد میں صرف روحانی مذہب رہ گیا تھا جو بڑی حد تک توحید کا درس دیتا تھا۔

بابل اب سے تقریباً پانچ چھ ہزار سال قبل وادیٔ فرات کے مختلف علاقوں میں طوائف الملوکی قایم تھی۔ جگہ جگہ بہت سے آزاد شہر آباد تھے اور ہر شہر ایک خود مختار ریاست تھا۔ جس میں حکومت مستبدانہ دین کی تھی۔ تمام ملک میں دو قومیں خاص اہمیت رکھتی تھیں۔ ان میں ایک قوم سامری (SAMERIAM) اور دوسری سامی یا سماتیقی (SEMITICI) تھی اور یہ دونوں قومیں شیر و شکر ہوگئی تھیں۔ حتیٰ کہ دونوں دیوتا بھی مشترک تھے۔

جب ریاستیں ختم ہوئیں اور سلطنت بابل قایم ہوئی تو وہاں کا مقامی خدا مردوق سب سے بڑا خدا تھا جس کے بعد شمس کا دور دورہ ہوا۔

الغرض ارتقاء تمدن کے ساتھ تہذیب معتقدات کا سلسلہ بھی جاری رہا اور دیوتاؤں کی شخصیت میں زیادہ تجرید اور روحانیت پیدا ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اشتار جو پہلے فسق و فجور کی دیوی تھی اور جس کے بھون میں "مقدس حرام کاری" ہوا کرتی تھی وہی زاہدان مرتاض کی سرپرست بن گئی۔

چین چین کی قدیم تہذیب و تمدن کا ابتدائی سرچشمہ مغربی ایشیا تھا۔ اسی لئے قدیم چین کا تمدن، بابل کے تمدن سے ملتا جاتا تھا۔ قدیم چین کے مذہب، کا حال ان مغلی قبایل کے معتقدات و رسوم سے معلوم ہو سکتا ہے جو حدود چین کے اندر یا ان کے قریب آباد تھے۔ یہ قومیں درخت، جنگل، جھیل، دریا وغیرہ ہر چیز کی پرستش کرتی تھیں اور مرجانے والوں کی روحیں سعید ہوں یا خبیث زندہ سمجھی جاتی تھیں۔

ان میں ایک بڑا دیوتا بھی تھا، جسے وہ اپنی زبان میں "جاں بخش و آفریدگار" کہتے تھے، لیکن تعجب یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت نہیں کرتے تھے، ہندوؤں میں بھی "آفرینندہ" دیوتا برہما ہے لیکن اس کی پرستش نہیں ہوتی۔ قدیم چینیوں کے مذہب میں عام دیوتاؤں کا سردار ایک "مہادیو" تھا جسے وہ لوگ "شنگتی" کہتے تھے۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں دولت چین پر ادبار و زوال کی گھٹائیں چھائیں اور ہر جگہ فساد برپا ہوگیا۔ اس وقت ملک میں دو شخص ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے ملک کو ظلمت و جہالت سے نکالنا چاہا ایک کا نام لاؤتسا تھا اور دوسرے کا نام کنگفو یا کنفوشسس۔ یہ دونوں "لاادریت" کے قایل تھے لاؤتسا نے جسے فارسی زبان میں لوشا کہتے ہیں۔ مذہب "تاؤئیت" قایم کیا (لفظ تاؤ کے معنی چینی زبان میں صراط مستقیم کے ہیں) لیکن بعد میں یہ مذہب "بودیت" سے مل کر مجموعہ اوہام ہوگیا۔

حکیم کنفوشسس کی تعلیم بھی لاادریت پر مبنی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ روحانی ہستیوں کا احترام کرتے ہوئے ان فرائض کو صحیح طور پر ادا کرے جو اس پر از روئے حقوق العباد عاید ہوتے ہیں۔

جاپان جاپان کے تمدن و شایستگی میں چین کا اس قدر حصہ شامل ہے کہ جاپان کو اس سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جاپان میں عوام کا مذہب شنتوئیت (SHINTOISM) ہے جو چین کے مذہب تاؤئیت کا مترادف ہے علاوہ ازیں چین کی طرح جاپان میں بھی بودیت کے مراسم داخل مذہب ہیں۔

مذاہب الہند مشہور ہے کہ برّاعظم ہند میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں اتنے ہی مذہب بھی رائج ہیں۔ ایک طرف کوہستان نیل گری کے نیم وحشی ٹوڈے ہیں جو ارواح یا دیوتاؤں کے معتقد ہیں۔ دوسری طرف آریا ہیں جو خود کو خدا پرست کہتے ہیں ایک طرف وشنوئی ہیں جو رام اور کرشن اور وشنو کے اوتاروں کو مانتے ہیں، دوسری طرف شیومت والے ہیں جو "لنگ اور یونی" یا "مہادیو اور پاربتی" کی فلاح میں اپنی نجات سمجھتے ہیں۔

آریا قوم یا قدیم ہندوؤں کے مذہب کا حال "ویدوں" سے معلوم ہوتا ہے، لیکن ویدوں میں جو حالات اس قوم کے بتائے گئے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوم دماغی لحاظ سے بہت ترقی یافتہ تھی اور اس کا مذہب قدیم ایرانیوں، رومیوں سلافیوں وغیرہ سے بہت مشابہ تھا۔

آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں اور قومیں بھی آباد تھیں جنھیں "دراوڑی" کہتے ہیں۔ یہ لوگ جب زرخیز میدانوں سے نکال دئے گئے تو وہ دور افتادہ کوہستانوں اور وادیوں میں جانب جنوب آباد ہو گئے۔ ان لوگوں کا مذہب اب بھی صرف مظاہر قدرت کے دیوتاؤں کی پرستش ہے۔

مسیح سے تقریباً آٹھ سو برس پیشتر برہمنوں نے جنھیں کھانے کمانے کی کوئی فکر نہ ہونے کے باعث بے حد فرصت تھی مظاہر قدرت پر تخئیل آرائی کرنی شروع کی اور ایک فلسفۂ مذہب بنام "ویدانیت" ایجاد کیا جس میں روح و مادہ اور اسباب و علل سے بحث کی گئی ہے لیکن چونکہ ہندو الٰہیات جمہور کی رسائی فہم سے بہت دور ہے۔ اس لئے عام ہندوؤں کا مذہب ابھی تک وہی بت پرستی چلا آتا ہے، جسے فلسفۂ ویدانت سے کوئی تعلق نہیں۔

مسیح سے چھ یا سات صدی قبل ہندو مذہب سے بودھ مذہب اور جین مت پیدا ہوئے جن کے بانی گوتم بدھ اور مہابیر تھے۔ ان مصلحین نے فلسفہ الٰہیات کو بالائے طاق رکھ کر لوگوں کو صرف تزکیۂ نفس اور حقوق العباد ادا کرنے کی تلقین کی۔ تمام کائنات کا مدار ان کے نزدیک کرم یعنی اعمال پر ہے۔ یہ لوگ دیوتاؤں اور خدا کی ہستی کے منکر ہیں۔

مذاہب امریکہ محققین آثار نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کولمبس کی آمد سے قبل جو لوگ امریکہ میں آباد تھے وہ براہ الاسکا ایشیا کے شمالی و مشرق سے آئے تھے، یہ واقعہ غالباً اب سے پانچ چھ ہزار برس قبل کا ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے مذہبی عقاید تقریباً وہی ہوں گے جو ایشیا کی مغل اقوام کے تھے۔

قطب شمالی کی قوم ایسکیمو (ESKIMO) کا عقیدہ ہے کہ دنیا ارواح رفتگان سے (جن میں زیادہ تر خبیث روحیں ہیں) معمور ہے۔ ان لوگوں میں نہ کوئی دیوتا ہے نہ کوئی معبود۔ اور اس لئے ان کے یہاں پوجا پاٹ یا عبادت نہیں ہے۔

شمالی امریکہ کے قبایل یقین رکھتے ہیں کہ روحیں قایم رہتی ہیں۔ یعنی جب انسان مرجاتا ہے تو اس کی روح جانب مغرب زیر زمین کسی مقام میں چلی جاتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا "زندگی کا دیوتا" یعنی آفریدگار ہے۔ جس کی جائے قیام آفتاب ہے۔ یہ وہی دیوتا ہے جو ہندوؤں میں "سورج نارائن" کہلاتا ہے، ایک دیبی "آسمان کی لافانی بڑھیا" ہے جو چاند میں رہتی ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان میں بعض قومیں زیادہ متمدن اور شایستہ ہوتی گئیں اور اسی نسبت سے ان کے معتقدات مذہبی میں بھی بلندی پیدا ہوئی۔

مذاہب عجم جس طرح کوئی بڑا دریا اپنے سرچشمہ سے نکل کر وادی کے خشک علاقوں کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے اور اس میں بیسیوں ندی نالے آکر مل جاتے ہیں۔ اسی طرح مذہب بھی مختلف زمانوں میں مختلف مدارج ارتقاء طے کرتا چلا جاتا ہے اور اسمیں ادھر ادھر

کے مختلف خیالات و معتقدات داخل ہوتے جاتے ہیں۔ عبرانیوں کا مذہب' جسے سب سے پہلا آسمانی یا الہامی دین بتایا جاتا ہے، در اصل مذاہب بابل مصر و ایران اور یونان کا رہین منت تھا اور انجیل میں تو ایران کے مذہب کا بہت بڑا حصہ پایا جاتا ہے۔

ایشیائے کوچک کے اس علاقہ سے جہاں قدیم زمانہ میں آریا قوم کی ہندی ایرانی شاخ آباد تھی، اہلِ ایران نقل و حرکت کرکے ان کوہستانوں میں جا بسے جو شمال میں واقع ہیں۔ تقریباً ایک ہزار سال تک یہ لوگ بحالت گمنامی و خانہ بدوشی پھرتے رہے۔ اس وقت ان کا مذہب وہی تھا جو قدیم ہندوؤں کا تھا۔ رفتہ رفتہ بابل و آشوریہ کے شاندار تمدن وجود میں آئے جنھوں نے وادیِ فرات و دجلہ کو رشکِ جنت بنا دیا ان کی شان و شوکت اور جلال و عظمت دیکھ کر دنیا کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ جب روز روز کی جنگ و جدال سے دونوں تمدن خاک میں مل گئے اور بابل و نینوا کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تو دنیا کی حکومت ایرانیوں کے ہاتھ آئی۔

ان قدیم ایرانیوں کی مقدس کتب ژند و اوستا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی حسب معمول بے شمار روحوں کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ یہ روحوں کے بقا کے قایل تھے۔ ان کے یہاں سب نیک و بد دو قسم کی روحیں تھیں۔ ان کا ایک آسمانی خدا بھی تھا جس کا نام مترا (MITRA) ہے۔ بعد میں ایرانی اور ہندو مذہب میں بہت کچھ اختلاف ہوگیا۔ لیکن "اگنی پوجن" (آگ کی پوجا) دونوں میں بدستور قایم رہی۔

چھٹی یا ساتویں صدی قبل مسیح میں ایران کے اندر ایک جدید مصلح یا پیغمبر کا ظہور ہوا۔ جس کا نام۔ "زرتشترا" (زرتشت یا زردشت) ہے۔ اس پیغمبر نے مذہب ایران کی صورت بدل دی اور اس میں زیادہ پاکیزگی اور روحانیت پیدا ہوگئی۔ زرتشت نے چھوٹے چھوٹے دیوتا سب غائب کردئے، صرف دو طاقتیں باقی رہ گئیں۔ آہورا مزدا (خدائے خیر) اور اہرمن (خدائے شر) اس مذہب میں مصریوں کی طرح یہ عقیدہ موجود تھا کہ انسان کی روح بعد موت باقی رہتی ہے اور اعمال نیک و زشت کی جزا و سزا ملتی ہے۔ نیکوکاروں کو مسرتِ ابدی کا انعام ملے گا۔ جن لوگوں کے اعمال بُرے ہیں انھیں میعادی سزائیں ملیں گی۔ جب وہ گناہوں سے پاک ہوجائیں گے تو بہشت میں داخل کردئے جائیں گے اور بالآخر بہشت ہی بہشت رہ جائے گی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس مذہب کے عقاید میں بابلی تمدن کا رنگ پیدا ہوگیا یعنی پرانا خدا مترا (MITRA) جو قدیم زمانہ میں ایک موہوم آسمانی دیوتا تھا۔ اب آہورا مزدا کے بجائے تختِ جلال پر آ بیٹھا اور مستقل طور پر "سورج نارائن" ہوگیا۔

ایران سے یہ مذہب "مترائیت" رومی دنیا میں پہونچا جو ابتداءِ مسیحیت کے وقت تک روم میں موجود تھا۔ چنانچہ ہر سال ۲۵ دسمبر کو مترا دیوتا کا جشن میلاد منایا جاتا تھا جس کی ولادت ایک پوشیدہ غار میں ہوتی تھی (یہی زمانہ "سورج نارائن" کی "پیدائش" یعنی آغاز عروج کا ہوتا ہے اور دن بڑا ہونے لگتا ہے) مترا کے بھگتوں کو خون سے بپتسمہ دیا جاتا تھا۔

فلسطین یہ امر باور کرنے کے لئے کافی وجوہ ہیں کہ جس پُر اسرار قوم کو قدیم عبرانی فلسطینی کہا کرتے تھے وہ در اصل جزیرہ کریٹ سے ہجرت کرکے آئی تھی اور اپنے ساتھ سلیمان سے بھی پہلے کا قدیم تمدن لائی تھی۔

مسیح سے تقریباً تیرہ سو برس پہلے جب عبرانی قوم عراق سے ہجرت کرکے صحرا و بیابان کو عبور کرتی ہوئی حدود شام میں پہونچی تو اس وقت وہ بمشکل متمدن و مہذب کہی جا سکتی تھی۔ ان کا قومی معبود جیہو (JEHOVA) تھا۔

اس کے بعد مسیح و ارتقاء مسیحیت کا زمانہ آیا اور عبرانیوں کا فطری مذہب کسی قدر ترمیم و تہذیب کے بعد دُنیا کا اخلاقی مذہب بن گیا۔

یورپ اقوام فن (فنلنڈ کے باشندے) مجار (MATYAR) باشندگانِ ہنگری اور ترکوں کے علاوہ جتنی ایشیائی قومیں ہیں وہ اور یورپ کی تمام اقوام دطبل قوم آریا کی نسل ہیں۔ جو ایرانیوں اور ہندوؤں کی مورثِ اعلیٰ تھی۔ ایک شاخ اس قوم کی جانب مغرب پہونچی اور سواحل بحیرۂ بالٹک پر مسلط ہوگئی یہ تیوتانی (TEUTONIC) کہلائی، دوسری شاخ جانب جنوب گئی اور یونان و اطالیہ پر قابض ہوگئی۔ تیسری شاخ وسطی ممالک میں رہی اور اب سلافی (SLAVO) کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے یورپ کی تمام قدیم اقوام کا مذہب تقریباً ایک ہی تھا۔ یونانیوں کا سب سے بڑا آسمانی دیوتا ذیوس (ZEUS) تھا، جو روم میں جیوپتر (JUPITAR) کہلایا اور ہندوؤں میں در اصل ان تمام ناموں کا مادہ لفظ دیو (DEVA) ہے۔

ناروے، سویڈن اور انگلستان کے قدیم باشندے بھی یہی مذہب رکھتے تھے۔ ہفتہ کے دنوں کے ناموں پر غور فرمایئے تو معلوم ہوگا کہ قدیم اقوام یورپ کا مذہب در اصل مظاہر فطرت سے متعلق تھا اور درختوں، دریاؤں، جنگلوں، کنوؤں وغیرہ کے دیوتا بھی ان میں پائے جاتے تھے (ہندوؤں میں اسی قسم کے سیکڑوں دیبی اور دیوتا موجود ہیں) الغرض عہد تاریخ میں قدم رکھنے سے پہلے تمام یورپ کا وہی مذہب تھا جو دیگر اقوام عالم کا تھا اور دیوتاؤں اور دیبیوں میں بعض بزرگانِ قوم بھی شامل کردئے جاتے تھے، جیسے ہندوؤں رام اور کرشن موجود ہیں۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، یونانیوں کے خیالات میں بھی وسعت ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ حکماء کے ذہن سے تمام مختلف دیوتا محو ہوگئے اور وہ آخر میں توحید پر آگئے۔ چنانچہ سقراط، فلاطون اور ارسطو کا یہی مذہب تھا۔ لیکن حکیم زینو (ZENO) اور ابیقورس (EPICURUS) ملحد تھے وہ کسی خدا یا دیوتا کو نہیں مانتے تھے۔

الغرض جملہ مذاہب قدیمہ پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ (۱) عہد وحشت میں انسان کا اعتقاد یہ تھا کہ اس کا سایہ ہمزاد ضرور ہے اور مرنے کے بعد روح اسی دنیا میں رہتی ہے۔ (۲) روحیں سعید و خبیث دو قسم کی پائی جاتی ہیں جو انسان کو فایدہ یا نقصان پہونچا سکتی ہیں۔ (۳) قدرت کی ہر چیز میں روحوں یا دیوتاؤں کا خیال پیدا ہوا اور سیکڑوں دیوتا بن گئے۔ (۴) متعدد دیوتاؤں میں سے چند کو بلند مرتبہ دے کر مذہب میں روحانیت پیدا کی گئی۔ (۵) متعدد دیوتاؤں کو باہم ملا کر ایک بڑا دیوتا بنایا گیا اور اس طرح توحید کی طرف میلان ہوا۔ (۶) توحید پرستی کے اندر ہی غور و خوض کرتے ہوئے روحانیت و الٰہیات سے لا ادریت پیدا ہوئی اور احکام مذہب، احکام اخلاق و حسن معاشرت بن گئے۔ (۷) روحانیت غائب ہونے کے بعد ذات واجب الوجود کا اعتقاد متزلزل ہوا اور الحاد کی بنیاد پڑی جیسا کہ فرانس اور امریکہ میں آج کل نظر آرہا ہے۔

مسیحیت قدیم موسوی یا یہودی مذہب میں چند ترمیمیں کرنے کے بعد عیسائی مذہب بنایا گیا۔ اس کی تعلیم اخلاقی ہے۔ ہر بات میں تزکیۂ نفس بلکہ نفس کشی کی ہدایت پائی جاتی ہے۔ اس مذہب کے بانی مسیح خیال کئے جاتے ہیں اناجیل اربع جن میں مسیح کی سوانح عمری اور ان کی تعلیم ہے، وفات مسیح کے بہت دنوں کے بعد ان کے حواریین نے لکھی تھی۔ مسیح کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ: (۱) وہ اپنی والدہ مریم کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور مریم کنواری تھیں، اس لئے مسیح ابن اللہ ہیں۔ (۲) یسوع نے شریعت موسوی میں ترمیم و تنسیخ کی اور ایک جدید اصلاح شدہ مذہب اخلاق جاری کیا، (۳) علماء یہود نے یسوع پر بغاوت کا الزام لگایا اور رومی حاکم کے فرمان سے وہ مصلوب کرکے دفن کردئے گئے۔ (۴) تین دن بعد وہ اپنی قبر سے زندہ ہو کر باہر نکلے اور اپنے شاگردوں سے مل کر انھیں آخری ہدایات کیں، اور پھر آسمان پر اپنے باپ خدا کے پاس چلے گئے۔ (۵) آدم نے خدا کے حکم کی نافرمانی کرکے تمام

بنی نوع انسان کو گنہگار بنایا۔ مسیح نے مصلوب ہوکر انسان کے گناہوں کا کفارہ کر دیا۔ (۶) قیامت کے قریب مسیح دوبارہ دُنیا میں آئیں گے۔ (۷) مسیح مامور من اللہ تھے اور ان کا مذہب الہامی ہے۔

مسیحیت کو دیگر قدیم مذاہب کے ساتھ رکھ کر دیکھا جاتا ہے تو انسان حیران رہ جاتا ہے کہ جس مسیحیت کو الہامی مذہب بتایا جاتا ہے وہ صرف قدیم مذاہب کی مختلف روایات و عقاید کا مجموعہ ہے جسے مختلف رنگوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اعمال کے جانچ کی تعلیم جو مسیحیت پیش کرتی ہے وہ مسیح سے کم از کم پانچ ہزار سال پیشتر مصر میں موجود تھی، وہ دیکھتا ہے کہ زبور کی بہترین دُعائیں وہی ہیں جو دیگر مذاہب کی دُعاؤں سے لی گئیں، وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اکثر قدیم مذاہب میں ایک آسمانی دیوتا کسی کنواری عورت پر اپنا پرتو ڈال کر حاملہ کر دیتا ہے اور پھر ایک بیٹا پیدا ہوتا ہے جو الوہیت سے متصف ہوتا ہے، چونکہ مسیحیت نے اسکندریہ میں زیادہ تر نشوونما پائی اس لئے قدیم مصریوں کی طرح اس میں بھی رہبانیت پیدا ہوگئی۔

جب وہ بابلی مذہب کی سیر کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کے مقتدایانِ دین بھی تکوینِ عالم۔ تخلیق آدم۔ ہبوط آدم۔ جنات عدن اور طوفان کی وہی روایتیں سناتے ہیں جو یہود و نصاریٰ کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ قدیم بابلیوں میں بھی ایک دن یوم سبت ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ جس طرح عیسائی لوگ مریم کو ایک دیوی اور پاکدامنی کا نمونہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ بابل اشتار دیوی کو نکوکاری اور پارسائی کی دیوی مانتے تھے۔ آخر میں وہ یہ بھی دیکھے گا کہ بابلیوں کا مذہب ترقی کرتے کرتے توحید ہوگیا تھا حالانکہ مسیحیت آج تک یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی، وہ یہ بھی دیکھے گا کہ بابلیوں کا ہر دلعزیز خدا ہر سال مرکر زندہ ہوتا تھا اور اس کا دھوم دھام سے جشن منایا جاتا تھا۔ بابلیوں نے اپنے مذہب میں مسیح کی طرح ایک نجات دہندہ خدا بھی مان رکھا تھا۔

جب وہ ایران قدیم مذہب کی سیر کرتا ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ مسیح سے صدیوں پیشتر وہاں ایک مصلح یا پیغمبر پیدا ہوا جس نے لوگوں کو اعتدال پسندی، نکوکاری اور پارسائی کی تلقین دے کر ایک خالص روحانی مذہب سکھایا، وہ دیکھے گا کہ ایرانیوں میں صدیوں پیشتر یہ عقیدہ موجود تھا کہ خدائے بزرگ و برتر ایک روز تمام کائنات کو بذریعۂ آتش نابود کر دے گا بعد ازاں وہ "آسمانی بادشاہت" کا دور دورہ ہوگا۔ لوگوں کے اعمال نامے جانچے جائیں گے نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دی جائے گی۔

ایران سے مذہب متھرائیت میں وہ یہ بھی دیکھے گا کہ اُن کا ایک دیوتا ہر سال ۲۵ دسمبر کو ایک غار میں پیدا ہوتا ہے، جس کا جشن مولود ہر سال نہایت تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے۔ یہ دیوتا بنی نوع انسان کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر لے لیتا ہے۔ روم میں اس دیوتا کی پیدائش کے دن یعنی ۲۵ دسمبر کو ہر سال سرکاری طور پر تعطیل ہوتی تھی (یہی عیسائیوں کا بڑا دن ہے) الغرض وہ دیکھتا ہے کہ عیسائیت میں کوئی بات ایسی نہیں جو دیگر مذاہب قدیمہ سے نہ لی گئی ہو۔

(۳)

مذہب سے انحراف

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان مذہب کے لئے پیدا نہیں ہوا بلکہ مذہب انسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے، یعنی مذہب خود کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک کیفیت ہے جو انسان کی دماغی تربیت، تمدنی ماحول اور نظام اجتماعی کے تحت پیدا ہوتی ہے

اس لئے کوئی مذہب یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کی اولین شریعت ہمیشہ یکساں طور پر ہر زمانہ و ملک کا ساتھ دے سکتی ہے

خود انسان کی تاریخ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے اس پر لاکھوں برس کا ایک ایسا زمانہ گزر چکا ہے جب وہ بالکل جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے بعد پانچ چھ لاکھ برس کا وہ زمانہ آیا جب اس نے پتھر کے بھدے آلات بنانا سیکھے۔ پھر حجری عہدِ عتیق آیا۔ جو تین چار ہزار سال تک قایم رہا۔ پھر مسیح سے ۲۰ ہزار سال قبل عہدِ حجری جدید شروع ہوا جو ۳½ ہزار سال قبل مسیح تک جاری رہا۔ اس کے بعد عہد تاریخی شروع ہوا جس کی ارتقائی صورت موجودہ تہذیب و تمدن ہے۔

انسان کے ان مختلف منازل ارتقاء میں مذہب کے اندر جس طرح تبدیلیاں ہوئیں ان کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کرچکے ہیں کہ اول اول مذہب کا خیال کس طرح صرف وہم و گمان پر قایم ہوا۔ اس کے بعد کیونکر مظاہر قدرت کی طرف ذہن منتقل ہوا اور پھر اخلاق پر بنیاد رکھ کر کس طرح ان مذاہب کو پیدا کیا گیا جنھیں الہامی کہا جاتا ہے اسی طرح ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ مختلف ممالک کے مذہبی معتقدات میں بہ ادنےٰ اختلاف کس قدر مشارکت پائی جاتی ہے اور عقاید کی اشاعت کن اصول کے تحت ہوئی یعنی اول اول انسان کا مذہب بالکل ذاتی و بے ضرر چیز تھا لیکن بعد کو جب ایک مخصوص جماعت علم مذہب یا علم رسم و رواج جاننے والی پیدا ہوگئی تو اس نے اپنا اقتدار قایم کرنے کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنایا اور اسے تماشہ بنا دیا۔

اس کے بعد جب علوم و فنون کی ترقی ہوئی، انسان میں سمجھنے اور غور کرنے کی اہلیت پیدا ہوئی تو رفتہ رفتہ ایک جماعت ایسی ظاہر ہونے لگی، جس نے احکام مذاہب اور معتقدات پر غور کرنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ مذہب پیچھے ہٹتا گیا۔

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عہدِ قدیم کی قوموں میں اول اول بت پرستی کس طرح شروع ہوئی اور متعدد بتوں کا وجود مٹ کر کیونکر صرف ایک بڑے بت کی ہستی قایم ہوئی۔ یہ گویا سب سے پہلا خیال تھا جسے ہم ایک لحاظ سے توحید کہہ سکتے ہیں لیکن چونکہ اس میں بھی بہت کچھ مادیت پائی جاتی تھی اس لئے فطرتِ انسانی مطمئن نہ تھی اور کبھی کبھی اس میں بغاوت کے آثار پائے جانے لگتے تھے، چنانچہ زردشت، کنفوشس اور بودھ انھیں لوگوں میں تھے جو مادیت سے علحدہ ہوکر اپنے مذہب کی بنیاد قایم کرنا چاہتے تھے اور اس میں کلام نہیں کہ اس وقت تک زمانہ کے لحاظ سے انھوں نے بہت کچھ کیا۔

عہدِ آخر کے مذاہب میں سب سے آخری مذہب جس نے غیر معمولی وسعت اختیار کی عیسوی مذہب تھا۔ لیکن اس کی جو حالت ہوئی وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں۔

جس طرح تمام مذاہب کے ابتدائی دور میں معلمین مذہب کا اقتدار رہا ہے۔ اسی طرح مسیحیت میں پادریوں کا اثر تھا، لیکن جب انھوں نے دین عیسوی کی رسم و رواج کی پابندیوں کا طلسم بنا دیا تو لوگ رفتہ رفتہ اس سے گھبرانے لگے اور سب سے پہلے لیتھر اور کالوین نے ایک جدید اصلاح یافتہ مذہب "پروتستانیت" (PROTESTANTISM) کے نام سے قایم کیا، لیکن چونکہ یہ اصلاح بھی پوری طرح دل کو نہ لگتی تھی اس لئے جب یورپ میں دورِ نہضت (*Renaissance*) شروع ہوا تو تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں میں مذہبی عقاید و مسایل کی چھان بین ہونے لگی اور انھیں معلوم ہوا کہ دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو نہ انجیل سے تعلق رکھتی ہیں نہ کلیسہ سے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب روم میں شہنشاہیت کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ یہ دورِ اقلیت اٹلی سے منتقل ہوکر رفتہ رفتہ فرانس اور انگلستان پہونچا اور اسی قسم کے مباحث ہونے لگے۔ انگلستان میں شکسپیر سے پہلے وہاں کے سب سے بڑے ڈراما نویس مارلو (MARLOWE) ــــ

سروالٹرریلے (WALTERRALEIGH) اور بہت سے دیگر روشن خیال لوگوں نے متشککین کا ایک کلب قایم کر رکھا تھا اور مذہبی امور پر بحث کرتے تھے۔ جس وقت اطالیہ کی طرف سے ان خیالات کی تائید ہوئی تو تحقیق و تدقیق کا بازار زیادہ گرم ہوگیا اور جو باتیں بائبل میں درج تھیں ان کا ازروئے درایت مضحکہ اڑایا جانے لگا۔

الغرض جدید معلومات کے سامنے پرانے اعتقادات کا شیرازہ درہم برہم ہوتا رہا تھا اور لوگ سمجھنے لگے تھے کہ جس چیز کو "الہامی" بتایا جاتا ہے وہ درحقیقت معمولی دماغوں کے منتشر خیالات ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ مذہب کی وقعت دلوں سے محو ہوگئی اور متشککین، لاادریین اور معقولیئین کا ایک گروہ ملک میں قایم ہوگیا، جنھوں نے آزادی کے ساتھ مذہب پر تنقید شروع کردی، چنانچہ سترھویں صدی کے وسط سے لیکر اٹھارھویں صدی کے وسط تک انگلستان میں بڑے بڑے ملحد مصنفین پیدا ہوئے جن میں بہت زیادہ مشہور ہربرٹ، بلاؤنٹ، ٹنڈل، لارڈ شیفٹسبری، لارڈ بولنگبروک، کولنس وغیرہ تھے، اب ملک میں ہر جگہ آزادی ضمیر کا دور دورہ تھا اور پادریوں کے اخلاق اس قدر گر گئے تھے کہ کلیسہ کے پادری حرام کاری کو عیب نہ سمجھتے تھے اور امراء کی ناجایز اولادیں آسانی سے پادری کا مرتبہ حاصل کرسکتی تھیں۔ اس زمانہ کی ملکۂ انگلستان کیرولائن (CAROLINE) ۱۶۸۳ء-۱۷۳۷ء بھی اسی قدر مذہب کی طرف سے غیر مطمئن تھی کہ مرتے وقت اُس نے کلیسہ کا توشہ لینے سے انکار کردیا، الغرض اس زمانہ کے بڑے بڑے لوگ بجز خدا کے معجزہ و وحی وغیرہ کو نہیں مانتے تھے اور کلیسہ کے معتقدین نے ان کا نام "کافر و ملحد" رکھدیا تھا۔

اصل قصہ یہ ہے کہ جب اٹھارھویں صدی میں صنعت و حرفت و تجارت کا بازار گرم ہوا اور ہر طرف امن و سکون قایم ہوا تو اشاعت علم و فنون کے ساتھ "عقلیت" کو بھی ترقی ہوئی۔ گیٹے، شلگر اور کانٹ وغیرہ سیکڑوں شعرا اور فلسفی پیدا ہوگئے جنکی شاعری اور شیوا بیانیوں نے مذہبی روایات کی امارت متزلزل کردی۔

اسی زمانہ میں انگلستان کی طرح فرانس میں بھی آزادی کا دور شروع ہوا۔ پروٹسٹنٹ جماعت کے قتل عام کے بعد فرقۂ یسوعی کو ملک سے نکال دیا گیا تھا، لوگ مذہبی جھگڑے سے تنگ آگئے تھے اور ان کا دل مذہب کی طرف سے بیزار تھا۔ فلسفیوں نے جدید معلومات کی بناء پر بائبل اور مسیحیت پر حملے کرنا شروع کردئے اور اصحاب کلیسہ اس قدر برہم ہوئے کہ جب والٹیر نے اپنے فلسفیانہ خطوط شایع کئے تو انھیں جلایا گیا۔ غریب والٹیر کو جان بچانے کے لئے ایک نواب کے قلعہ میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبقۂ علماء کی رہی سہی وقعت بھی لوگوں کے دلوں سے اٹھ گئی۔

والٹیر کا ہمعصر روسو بھی موحد تھا اس نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ سے مسیح کا حُلّۂ تقدس چاک کرکے پھینک دیا اور لوگوں پر ثابت کیا کہ جس یسوع ناصری کو مسیحی دنیا خدا مان رہی ہے، اس میں مطلق الوہیت نہیں پائی جاتی تھی اور وہ خدا کا ایک سیدھا سادھا پرہیزگار بندہ تھا۔ الغرض یہ عقیدہ تمام فرانس میں پھیل گیا، وہاں سے ہسپانیہ و جرمنی وغیرہ پہونچا اور اس طرح اکثر بلاد یوروپ کا مذہب "والٹریت" ہوگیا، ہر جگہ درباروں اور بازاروں میں والٹیر کی تصانیف کا چرچا تھا اور سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جہاں اس کی کتابیں نہ پڑھی جاتی ہوں۔

اسی زمانہ میں یوروپ کا اہم ترین واقعہ انقلاب فرانس کا تھا جس نے اگرچہ قدیم نظام حکومت کو تہ و بالا کردیا۔ لیکن سیاسی اور مذہبی آزادی کو اور تقویت پہونچائی۔ یہی وہ زمانہ ہے۔ جس نے تین نہایت زبردست اور سحر بیان اہل قلم طامس پین، روسو اور والٹیر پیدا کئے، یہ تینوں خدا پر ایمان رکھتے تھے، لیکن وحی کے قایل نہ تھے۔

اس کے بعد یورپ میں "مشککین" کی ایک جدید جماعت پیدا ہوئی۔ جنھوں نے خدا کو بھی بالائے طاق رکھدیا یہ لوگ ملحد یا مادیئین کہلائے۔ اس جماعت میں بڑے بڑے لوگ تھے اور ان کی قیادت میں مذہب کے خلاف بغاوت برابر بڑھتی رہی۔
اسی کے ساتھ ڈیکارٹ نے دُنیا کے سامنے ایک نظریۂ ارتقا یہ بھی پیش کیا کہ تمام اجرام سماوی یعنی ثوابت و سیارگاں سدیم یا ذرات نور (Nebula or Cosmic Dust) سے پیدا ہوئے اور اس طرح گویا ذات واجب الوجود کی ہستی کو بھی غیر ضروری ٹھہرایا۔ اٹھارھویں صدی کے اخیر تک اس تحریک میں علمی رنگ زیادہ غالب آگیا اور بائبل کی نکتہ چینی ایک علمی مشغلہ ہوگیا۔ لوگ اصل عبرانی بائبل کا بہت زیادہ غور و فکر سے مطالعہ کرنے لگے اور اس تجزیہ و تحلیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ عبرانی عہد نامۂ عتیق کا راز فاش ہوگیا اور یہ بات ظاہر ہوگئی کہ قدیم صحف انبیاء و بنی اسرائیل مختلف زمانوں کی تصانیف ہیں جن کو بہت کچھ تحریف و ترمیم کے بعد ایک جگہ جمع کردیا گیا ہے۔ اور یہ کام مقتدایانِ دینِ یہود نے عیسیٰ سے چند صدی پیشتر کیا تھا۔ یہ ہے وہ چیز جسے بائبل کا انتقاد عالیہ کہا جاتا ہے۔ جس طرح ہم مختلف زمانوں کی اُردو یا فارسی زبان میں تفریق و تمیز کرسکتے ہیں۔ اور سمجھ جاتے ہیں کہ یہ زبان ولی دکنی کی ہے یا میر کی۔ انشاء کی ہے یا داغ و غالب کی۔ اسی طرح جدید فنِ نقد کے ذریعہ سے قدیم صحف بنی اسرائیل یا تالمود کے زمانہ تصنیف کا تعین ہوجاتا ہے۔ جدید علوم خصوصاً نظریہ ارتقاء نے توریت کے باب پیدائش کی بُری طرح دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ اور اب چونکہ آثار قدیمہ کے اکتشاف سے صحیح تاریخی معلومات ہوچکی ہے۔ اس لئے بائبل کی تاریخی اہمیت بھی خاک میں مل گئی ہے۔

اسی زمانہ میں فن تاریخ نے بھی علمی صورت اختیار کرلی۔ ہیوم (Hume.) اور گبن (Gibbon.) نے قدیم تاریخی روایات و حکایات کو معیار درایت پر کس کر ایسی تاریخیں لکھیں کہ اُن کے مقابلہ میں تمام قدیم تاریخی داستانیں کالعدم ہوگئیں خصوصاً گبن کی تاریخ کے ایک باب نے جو "عروجِ مسیحیت" پر ہے دُنیا کی آنکھیں کھول دیں اور اس تحریک کو اور زیادہ تقویت پہونچائی، گبن ہی وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے عالم بشری کی تاریخ خرافیات سے خالی الذہن ہوکر لکھی۔ اور جس طرح مشہور فرانسیسی ماہر فلکیات لاپلَے (Laplace.) اور جرمن فلسفی و ہیئت داں کانٹ (Kant.) نے یہ نظریہ قایم کرکے کہ تمام اجرام سماوی "سدیم" یا "لطخات سحابیہ" سے پیدا ہوئے ہیں کسی خالق السماء کی ضرورت باقی نہیں رکھی، اسی طرح گبن نے بھی ثابت کردیا کہ تاریخ انسانی میں بھی کسی خالق الارض کا ہاتھ نہیں ہے۔ الغرض جدید علم تاریخ نے تمام خرافی قصے صفحات تاریخ سے نکال کر پھینک دیئے اور ثابت کردیا کہ تاریخ عالم کا نشو و نما اصول ارتقاء کے تحت ہوا ہے۔

جدید علم تاریخ کا ایک اثر دُنیا پر اور بھی ہوا۔ وہ یہ کہ دُنیا قدیم یونانی و رومی تمدن و شایستگی کی مداح ہوگئی اور ان کے قدیم علوم و فنون از سرِ نو زندہ ہوگئے۔ اب تک مسیحی دنیا قدیم یونانیوں اور رومیوں کو مشرک و بت پرست سمجھ کر سزاوار جہنم سمجھتی تھی لیکن جدید علم تاریخ نے ثابت کردیا کہ عہد نامۂ جدید یعنی مجموعۂ اناجیل میں ایک بھی پاکیزہ خیال یا تعلیم ایسی نہیں ہے جو اقوال افلاطون یا حکماء "رواقیین" کی تعلیمات میں موجود نہ ہوں، جب نپولین اعظم نے مصر فتح کرلیا تو یورپ کے علماء نے آثار مصر سے بائبل کی روایات کو اور زیادہ مشکوک بنادیا، اس کے بعد بابل و نینوا کے آثار سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ انبیاء بنی اسرائیل نے جو روایات و حکایات دنیا کے سامنے الہامی کہکر پیش کی تھیں وہ درحقیقت روایات بابل و نینوا کا مجموعہ ہیں جن کو ترمیم و تنسیخ کے بعد پیش کیا گیا تھا کیونکہ تخلیقِ عالم، پیدائش آدم و حوا، جنت عدن، ہبوط آدم، طوفانِ نوح وغیرہ کی تمام اسرائیلی روایات لفظ بلفظ بابلی

روایات ہیں۔ اس انکشاف کے بعد قصص بائبل سے لوگوں کا ایمان بالکل اُٹھ گیا اور وہ وحی و الہام کے بھی منکر ہوگئے۔ اسی کے ساتھ جب انھوں نے توریت کی کتاب پیدائش کے حالات کو علم طبقات الارض کی روشنی میں دیکھا تو وہ بائبل سے اور زیادہ بدگمان ہوگئے کیونکہ یہ روایات قدیم بابل و نینوا میں اس وقت رائج تھیں، جب عبرانیوں کو لکھنا پڑھنا تک آتا تھا۔

آثار قدیمہ کے ساتھ ہی ساتھ فلسفہ نے بھی لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ کیونکہ جب عقیدۂ الہیت (DEISM) نے وحی والہام کے عقیدہ کی بیخ و بنیاد کو متزلزل کر دیا تو لوگوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ ہستی، روح اور وجود باری تعالیٰ کو منطقی دلایل کے ذریعہ سے ثابت کیا جائے کیونکہ جب تک ان دونوں کا وجود ثابت نہ ہو جائے وحی والہام لاشئے محض ٹھہرتے ہیں۔ یعنی وحی سے پہلے یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ کوئی وحی بھیجنے والا موجود ہے، اور کسی ایسی ہستی کا وجود عقلی دلایل سے ثابت نہ ہو سکا۔

آخری چیز جس نے عقاید مذہبی کو ختم کر دیا سائنس ہے۔ مذہب و سائنس کی آویزش اس وقت سے شروع ہوئی جب ڈارون (DARWIN) کی کتاب "مصدر انواع" (Original species) شایع ہوئی۔ ڈارون نے قانون ارتقاء کو اس خوش اسلوبی سے واقعاتی بنیاد پر پیش کیا کہ ہر شخص کی توجہ اس طرف مایل ہوگئی۔ پادریوں کو نظریۂ ارتقاء سے اس لئے سخت مخالفت پیدا ہوئی کہ از روئے بائبل آدم کی پیدائش کو صرف چھ ہزار سال گذرے تھے۔ لیکن سائنس نے دنیا کے سامنے انسان کے بنائے ہوئے وہ آلات تجربی پیش کر دئے جو پندرہ بیس ہزار سال پیشتر کے بنے ہوئے ہیں علاوہ ازیں بائبل کی طرف سے مینار بابل اور اختلاف السنہ کی روایات پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن سائنس نے انیسویں صدی میں ایک جدید علم کی بنیاد ڈالی جسے عرف عام میں "علم الالسنہ" (Philology) کہتے ہیں۔ اس علم نے تحقیق و تدقیق کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ سنسکرت، فارسی اور اکثر یورپین زبانیں ایک دوسرے سے اتنا گہرا تعلق رکھتی ہیں، گویا وہ سب ایک ہی قدیم زبان کی شاخیں ہیں اور اسی طرح بائبل کی روایت دربارۂ اختلاالسنہ قرار پائی۔

بائبل کا بیان ہے کہ خدا نے نوح کے زمانہ میں تمام دنیا کو تباہ کر دیا تھا۔ اور دنیا کی آبادی کو صرف چھ ہزار سال گزرے ہیں لیکن سائنس نے دنیا کے سامنے طبقات الارض کی مدد سے ثابت کر دیا کہ کرۂ زمین کی خشک سطح رفتہ رفتہ کروڑوں برس کے بعد بنی ہے اور زمین کی ساخت بھی قانون ارتقاء کے تحت ہوئی۔

بائبل کی پہلی آیت یہ ہے کہ ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا لیکن فلکیات نے یہ ثابت کر دیا کہ اجرام سماوی دفعتاً نہیں بنے۔ بلکہ قانون ارتقاء کے تحت رفتہ رفتہ سدیم یا ذرات نور سے بنے ہیں۔

انسانی خیالات و معتقدات کی کایا پلٹ سب سے زیادہ ان انکشافات نے کی ہے جو فلکیات سے متعلق ہیں۔ اب یہ امر بھی متحقق ہوگیا ہے کہ کس ستارہ کی عمر کتنی ہے۔ اگر "کن فیکون" کے ساتھ ہی تمام اجرام سماوی معرض ظہور میں آئے ہوتے تو خواہ وہ [illegible] ہوتے یا انجم لاتعد و لاتحصیٰ ان سب کی عمریں برابر ہوتیں۔ لیکن سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مختلف ستاروں کی عمروں میں اربوں سال کا تفاوت ہے۔ اور بہت سے اجرام سماوی ایسے ہیں جو ہنوز سحابی یا سدیمی حالت میں ہیں، گویا ہماری کائنات بنتی جا رہی ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا اور ہماری دنیاوی زندگی ابدی سلسلۂ حیات کی ایسی حقیر کڑی ہے جس کے لئے سوال و جواب، میزان و صراط اور بہشت و دوزخ کا سوال اصلاً کوئی معنی نہیں رکھتا۔

(۴)

مذہب کا مستقبل

اس سے قبل ہم یہ بتا چکے ہیں کہ مذہب کی ابتدا دنیا میں کیونکر ہوئی، عہد حاضر میں اس کے ضعف و اضمحلال کے کیا اسباب ہیں اور اس پر قیاس کرکے بہ آسانی یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ ایک زمانہ وہ آنے والا ہے جب مذہب کی تعلیمات و اعتقادات کو اسی نگاہ سے دیکھا جائے گا جس طرح آج "سکونِ زمین و حرکت افلاک" کے نظریۂ قدیم کو دیکھا جاتا ہے یا جس طرح ایک ماہر آثار قدیمہ پرانے کھنڈروں کو کھود کر بہت سے محو شدہ واقعات کو سامنے لاتا ہے۔

مذہب کو سب سے زیادہ صدمہ پہونچانے والے اسباب کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کا تفصیلی ذکر اس سے قبل آچکا ہے، لیکن مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دنیا کا ہر وہ قدم جو علم و حکمت کی طرف بڑھتا ہے مذہب کو سیکڑوں قدم پیچھے ہٹا دیتا ہے۔

علم و فنون کے سلسلہ میں سب سے بڑا صدمہ مذہب کو جس چیز سے پہونچا وہ قانون ارتقاء کی تحقیق تھی جس نے عیسب کے بہت سے مسلمات تاریخی کو پارہ پارہ کرکے رکھ دیا۔

چونکہ مذہب کی بنا صرف یقین پر قایم ہے اور فطرت انسانی صرف ان باتوں کا یقین کرنا چاہتی ہے جو خود اس کے مشاہدہ و تجربہ میں آئیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ علمی مشاہدات و تجربات کے مقابلہ میں مذہبی بیانات کو ترجیح دی جاتی اور انسانی ضمیر ان پر مطمئن ہو جاتا۔

اول اول جب مذہب و حکومت میں زیادہ فرق نہ تھا اور حکومت کے مفہوم سے مذہب کو جدا نہیں کر سکتے تھے، تو جبراً و شمشیر مذہب کا تلخ گھونٹ ہر شخص کو گوارا کرنا پڑتا تھا، چنانچہ تمام مذاہب کی تاریخ میں اس طرح کے سیکڑوں واقعات نظر آتے ہیں کہ مذہب پر جب کسی نے نکتہ چینی کی تو اس کو قید و بند میں ڈالا گیا، دار پر کھینچا گیا، اور جس طرح ممکن ہوا حریت و فکر و رائے کی اشاعت کو روکا گیا۔

جب یونان قدیم کے باشندوں نے ایران، کریٹ اور مصر والوں سے علوم و فنون کے حصول کا ذوق حاصل کیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ روایات مذہبی بالکل لغو چیز ہیں اور انسان کو خود اپنے عقل و حواس سے کام لے کر کسی نتیجہ پر پہونچنا چاہئے، پھر وہ جہاں بھی گئے اسی خیال کو ساتھ لے گئے۔ جب وہ اثینہ (Athens) پہونچے جو اس زمانہ کا بڑا عظیم الشان شہر تھا تو وہاں علم و حکمت کے ساتھ لوگوں کی دشمنی کو اور زیادہ شدید پایا۔ یہاں تک کہ انکساغورس نے جب وہاں ایک علمی درسگاہ قایم کرنا چاہی تو اس کی جان خطرہ میں پڑ گئی اور آخر کار اسے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اثینہ کے فلاسفہ کا دعویٰ تھا کہ وہ صرف روحانی حقیقتوں کی طرف توجہ کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ غریب سقراط باوجود تبلیغ روحانیت اپنی جان سلامت نہ لے جا سکا۔

اس کے کئی صدی بعد اسکندریہ میں جسے دراصل یونانی شہر کہنا چاہئے زیادہ موافق حالات کے تحت علم و عقل کی کارگاہ قایم ہوئی، ہرچند یہاں اتنے مذاہب پائے جاتے تھے کہ خداؤں کی تعداد کے لحاظ سے پجاری بھی کافی نہیں تھے۔ لیکن شاید یہ مذہبی گمراہی کے ردعمل کا وقت تھا کہ اس کے بعد ہی لوگ چونکے اور علم و حکمت کی ترقی ہونے لگی، مگر بدقسمتی سے اسی وقت ایک نئے مذہب مسیحیت نے

سیاسی اقتدار حاصل کرلیا اور اس نے یونانی عقل و حکمت کے چراغ کو گل کرکے رکھدیا۔

ظہور اسلام

اس کے بعد صدیاں گزر گئیں اور علم کی روشنی مذاہب کے ظلم کدوں میں نہ پھیل سکی۔ ہرچند علم و فراست کے تمام خزانے یونانی کتابوں میں محفوظ تھے۔ لیکن یونان کی عیسائی حکومت کے زمانہ میں کس کو ان کی تلاش کی جرأت ہوسکتی تھی۔

آخرکار اسلام کا ظہور ہوا اور اس نے عرب کے وحشیوں میں وہ انقلاب عظیم پیدا کیا جس نے دمشق و بغداد کو گہوارۂ علم و حکمت بنادیا اور چاروں طرف سے عقل کی روشنی سمٹ کر وہاں آنے لگی، یونانی، ایرانی اور شامی علوم عربی زبان میں منتقل ہونے لگے۔ اور پھر یہی تہذیب دمشق و بغداد سے منتقل ہوکر شمالی افریقہ ہوتی ہوئی اسپین پہونچی اور وہاں علوم و فنون کی ترقی نے وہی رنگ اختیار کیا جو یونان قدیم میں کسی وقت پایا جاتا تھا، اس کے بعد چند یہودی و مسیحی سیاح یہاں آئے اور عربوں کے تراجم و تصانیف کو اٹلی، فرانس اور انگلستان لیگئے، ادھر یہ تھا ہی کہ مسلمان صقلیہ اور اطالیہ کے جنوب میں بھی آباد تھے اس لئے یہاں سے بھی چشمۂ علم یورپ کی طرف بہا اور عقلیت کی ترقی ہونے لگی۔

جب انیسویں صدی شروع ہوئی اور اسی کے ساتھ علم و حکمت کو ترقی ہوئی تو مذہب کے سخت گیر دیوتا کا بت ٹوٹا اور عقیدت نے توریت و انجیل میں تاریخی، آثاری، علمی، اخلاقی ہزاروں قسم کے نقایص نکال کر مسیحیت کا جنازہ نکال دیا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی مذہب کے فنا ہونے کے چند در چند اسباب تھے۔ ایک یہ کہ اس کی تعلیمات ترقی علوم و فنون کا ساتھ نہ دے سکتی تھی، دوسرے یہ کہ دنیا سے ملوکیت و استبداد کی رسم اٹھی اور اصول حکمرانی میں مذہب سے کوئی تعلق نہ رہا۔ تیسرے یہ کہ لوگوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ بائبل سے ان کی زندگی کی کوئی ضرورت وابستہ نہیں ہے اور نہ وہ حیات انسانی کی جستجو کا شافی جواب دے سکتی ہے، اس کا تاریخی پہلو بالکل لغو، علمی پہلو بالکل مہمل ہے۔ اس کی اخلاقی تعلیم یکسر ناقابل عمل ہے وہی یورپ جس نے مسیح اور تعلیم مسیح کی حمایت میں شدید ترین ظلم کرنے سے کبھی باک نہ کیا تھا۔ آج اس کا یہ عالم ہے کہ وہ مسیح کو جاہل محض اور بائبل کو مجموعۂ مزخرفات بتاتا ہے۔ وہ انجیل کی اس روایت کو دیکھتے ہیں جس میں یونس کا تین دن، تین رات تک مچھلی کے پیٹ میں رہنا بیان کیا جاتا ہے اور ہنستے ہیں، وہ علانیہ کہتے ہیں کہ مسیح کو دنیا اور قدرت کا اتنا علم بھی حاصل نہ تھا جتنا آج ایک اسکول کے لڑکے کو حاصل ہے۔ نہ وہ تاریخ سے آگاہ تھے نہ جغرافیہ سے۔ نہ علم الحیات سے ان کو آگاہی تھی۔ نہ طبیعیات سے، نہ فلکیات کا علم انھیں حاصل تھا، نہ سیاسیات کا۔ رہ گئی تعلیم اخلاق سو اس کا یہ حال ہے کہ نہ پہلے کبھی اس پر کوئی انسان عمل کرسکتا تھا نہ آج اس کا امکان ہے۔

اب آیئے غور کریں کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے اور اس کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ وہ مذہبی دنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے کس حد تک صحیح ہے۔

مذہب اسلام کی تعلیمی حقیقت معلوم کرنے کا ذریعہ قرآن ہے اور اس کے بعد محمدؐ کی سیرت کہ ان دونوں میں اصولاً کوئی فرق نہ ہونا چاہئے۔ ان دو ذریعوں کے علاوہ جو کچھ ہے یعنی احادیث کا مجموعہ اور مذہب اسلام کی تاریخ ان کو کوئی حقیقی یا معیاری ذریعہ تحقیق کا نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ان سے اگر کوئی کام لیا جاسکتا ہے تو صرف یہ کہ اسلام نے خیالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زمانہ کی کس قدر موافقت کی، لوگوں نے اسلام کے مفہوم میں کیا کیا تغیرات پیدا کئے اور یہ کہ اس میں حشو و زواید کا اضافہ کب اور کن

اسباب کے تحت ہوتا رہا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اسلام کی تعلیمات سے بحث کریں، مذہب کے مفہوم کو متعین کر لینا ضروری ہے۔

مذہب اگر انسان کے لئے کوئی ضروری چیز ہے تو دیکھنا چاہئے کہ یہ ضرورت محض فطرت کے اقتضاء سے پیدا ہوتی ہے یا صرف ماحول کے اثر سے۔

اس کا جواب دینے کے لئے زیادہ غور و تامل کی ضرورت نہیں، ابتداء آفرینش سے لے کر اس وقت تک انسان کی تاریخ اس نتیجہ پر پہونچنے میں مدد کرتی ہے کہ مذہب کا خیال بڑی حد تک فطری اقتضاء ہے اور محض اس لئے کہ انسان بالطبع تمدن پسند ہے اور تمدن کا نظام بہت کچھ منحصر ہے کسی اعتقادی قانون پر۔ یہ ضرور ہے کہ ماحول کے اثر سے مذہبی خیالات میں تغیر و تبدلی پیدا ہوتا رہتا ہے، لیکن مذہب کا خلاق ماحول نہیں ہے بلکہ فطری اقتضاء ہے۔

اس لئے ایک مذہب کے بہترین ہونے کی علامت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اصول فطرت کے مطابق ہو یعنی فطرت انسانی اپنے اکتسابات کے لحاظ سے جس قدر ترقی کرتی جائے، مذہب نہ صرف یہ کہ اس کا ساتھ دے، بلکہ ہمیشہ ترقی کا ایک بلند نصب العین سامنے رکھے۔ یہ ایک ایسا اصول کسی مذہب پر نقد کرنے کا ہے کہ اس کی صحت سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اچھا تو آئیے سب سے پہلے اسی کو سامنے رکھ کر اسلام کی جانچ کریں کہ وہ کس حد تک اس معیار پر پورا اُترتا ہے۔

قرآن میں مذہب اسلام کی حقیقت جن الفاظ میں بیان کی گئی یہ ہیں:-

"فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا ولا تبدیل لخلق اللّٰہ ذالک الدین القیم"

(یعنی اسلام نام ہے صرف اس فطرتِ الٰہی کا جس پر انسان پیدا ہوا ہے، اور فطرت الٰہی یہ ہے کہ قانون نظام عالم کا اس نے بنایا ہے اس میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہی مسلک و مذہب ایسا ہے جو ہمیشہ قایم رہنے والا ہے)

ان چند الفاظ میں جو فلسفہ مذہب کا بیان کیا گیا ہے وہ اس قدر سادہ اور ایسا مکمل ہے کہ زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کرے اسکی صداقت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

پھر اسلام نے اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ترقی کے اصول کیا ہیں اور ارتقاء کے جو اصول قدرت نے مقرر کر دئے ہیں ان میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی اصول کو خدا نے کہیں آیات محکمات کہا ہے کسی جگہ "لن تجد لسنۃ اللّٰہ تبدیلا" سے تعبیر کیا ہے، کبھی "بصائر للناس" بتایا ہے اور کبھی "حبل اللّٰہ" سے اس کی صراحت کی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ اگر انسان اس اصول پر کاربند ہو اور وہ اس حقیقت کو سمجھ لے کہ:

"لیس للانسان الا ما سعیٰ" (ایک شخص کو اتنا ہی ملے گا جتنی وہ کوشش کرے گا) تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا، ترقی کی صورت کیا ہوگی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:- "وعد اللّٰہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحٰت لیستخلفنہم فی الارض" یعنی اگر لوگوں نے مقررہ اصول حیات و ترقی کا یقین کر لیا اور انھوں نے اس پر کاربند ہو کر سعی و کوشش کی تو ہمارا وعدہ ہے کہ ہم ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنا دیں گے۔ کرۂ ارض کا وارث کر دیں گے اور وہ نائب خدا ہونے کی حیثیت سے زبردست اقتدار و حکومت کے مستحق قرار پائیں گے۔

یہ ہے اصل روح اس تعلیم کی جو مذہب اسلام نے دُنیا کے سامنے پیش کی اور دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ

اس سے زیادہ عملی تعلیم نہ اس سے قبل کسی مذہب نے دی نہ آئندہ اس میں کسی اضافہ کی ضرورت ہے۔

اسلام کی اولین شرط توحید ہے، لیکن چونکہ عام طور پر اس کا مفہوم غلط سمجھا جاتا ہے اس لئے مختصراً اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ آپ جس مولوی سے پوچھئے گا کہ توحید کسے کہتے ہیں تو وہ یہی جواب دے گا کہ خدا کو ایک ماننا توحید ہے۔ حالانکہ اس مفہوم کی غلطی اس سے ظاہر ہے کہ جب خدا کو زمان و مکان سے بے نیاز مانا جاتا ہے تو اس کو ایک کیسے کہہ سکتے ہیں؟ جب کہ ایک کے مفہوم میں زمان و مکان دونوں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک کا مفہوم لوگوں نے بالکل غلط لیا ہے۔ اصل مفہوم وہ ہے جو لفظ کُل یا ہوالاول اور ہوالآخر سے ظاہر کیا جاسکتا ہے، اسی لئے میرے نزدیک خدا کا اگر کوئی موزوں و مناسب نام ہوسکتا ہے تو وہ صرف کُل ہے، یہ مفہوم خدا کا ایسا ہے جس میں نہ کبھی شائبۂ شرک پیدا ہوسکتا ہے اور نہ وہ صورتیں جو عام طور پر شرک سمجھی جاتی ہیں، داخل شرک ہوسکتی ہیں۔

خدا کو کُل سمجھنا، یعنی اس کو تمام کائنات کا محیط اعظم، دائرۂ کونین کا مرکز حقیقی موجودات کا خالق اصلی، عالم اسباب کا علۃ العلل قرار دینا یہی مفہوم ہے اسلام کی توحید کا۔

میں ہرگز یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ اگر کوئی شخص بت پرستی کرتا ہے تو وہ شرک میں مبتلا ہے، کیونکہ بت پرستی حقیقتاً اسی کُل کے مختلف مظاہر و آثار کا مطالعہ ہے اور دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ تمام کاموں کا انحصار حقیقتاً انھیں پتھر کی مورتوں پر ہے۔

خدا کے مفہوم کے تعین میں سب سے بڑی غلطی جو ہر جگہ اور ہر زمانہ میں یہ ہوئی ہے کہ اُسے دنیا کے انسانی بادشاہ کی طرح ہستی کہا گیا جو خوش بھی ہوسکتا ہے اور برہم بھی، حالانکہ ان دونوں کا اطلاق اس پر نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی شخص عمر بھر خدا کو برا کہے تو وہ برہم ہوکر اپنے قانون کو نہیں بدلے گا اور اگر کوئی ہر وقت سجدہ ہی میں پڑا رہے تو خوش ہوکر سعی سے زیادہ اسے نہیں دے گا۔

اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر کوئی قوم بتوں کے سامنے جھکتی ہے، متعدد خداؤں کی قائل ہے تو وہ صرف اسی وجہ سے عنداللہ مغضوب ہے، درست نہیں۔ البتہ اگر اس کی بت پرستی یا شرک اوہام باطلہ میں مبتلا کرکے اس نصب العین سے ہٹا دینے والے ہیں جو خدا کو واحد یا کُل ماننے کی حالت میں سعی و عمل، کاوش و جستجو، اقدام و ترقی کی صورت میں رونما ہوتا ہے تو بے شک ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت اس سے برہم ہے اور اس کی برہمی یہی ہے کہ ایسے لوگ دنیا میں ذلیل و خوار رہیں اور غلامی و اسیری کی زندگی بسر کریں۔

"انتم الاعلون ان کنتم مومنین" (تم کو بلند مرتبہ والا ہونا چاہئے اگر تم مومن ہو) اسلام کی تعلیم ہے اور یہیں سے ایمان کی حقیقت واضح ہوتی ہے اور اس توحید کی جو ایمان کی بنیاد ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص تمام عمر خدا کے ایک ہونے کا وظیفہ رٹتا رہے، لیکن وہ اس کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہوئے سوا مسجد میں اذان دینے کے اور کچھ نہ کرے تو کیا ایسے انسان کو ان مومنین میں شامل کرسکتے ہیں، جن کے ایمان کا نتیجہ لازمی اقتدار و مرتبہ بلند بتایا گیا ہے۔

اس لئے اگر ایمان و اسلام کی بنیاد توحید ہے، تو اس توحید کے معنے یہ نہیں ہیں کہ خدا کو ایک سمجھا جائے بلکہ اس کو محیط کل باور کیا جائے۔ عالم اسباب پر نگاہ ڈالی جائے، دماغی و ذہنی قوتوں سے کام لیا جائے اور کائنات کو مسخر کردیا جائے چنانچہ صراحتاً بیان ہوا ہے کہ:- "وسخر لکم ما فی السمٰوات وما فی الارض جمیعاً منہ ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون"

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے تابع فرمان ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ تم غور و فکر، تامل و تدبر، سعی و کاوش

سے کام لو، پھر دیکھو کیا بحر و بر کی تسخیر انسان کے لئے ناممکن ہے، کیا جبال و انہار پر آج انسانی اقتدار نہیں پایا جاتا، پانی، ہوا، آگ، بجلی، بادل، فضا، روشنی، حرارت، ہوا کے طیور، زمین کے چوپائے، پہاڑوں کے معدنیات، پانی کے حیوانات الغرض دنیا میں کوئی چیز، کوئی کیفیت، کوئی قوت ایسی نہیں ہے جو انسان کے اقتدار سے باہر ہو، لیکن کیا دنیا کا کوئی مذہب اس کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس نے انسان کی ان جملہ ذہنی ترقیوں کا درس اسی طرح کھلے ہوئے الفاظ میں دیا ہے۔ جیسا قرآن میں پایا جاتا ہے۔ اسلام نام ہے صرف قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے کا، اس لئے ہر وہ جماعت جو اس کی عامل ہے مسلمان کہلائے گی خواہ وہ مسیح کی اولاد میں ہو یا رام و لچھمن کی ذریات میں سے اور جو اس پر عامل نہیں ہے، وہ یقیناً کافر، مشرک اور غیر مسلم کہلائے گی، خواہ وہ کسی خاندان سے نسبت رکھے یہ ہے قرآن کا فیصلۂ آخر جو اس نے ایک مسلم و کافر کی تفریق و امتیاز کے متعلق سب کو سنا دیا ہے اور جس میں کبھی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہو سکتی خواہ انسانی ذہن و تمدن کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے۔

آپ تمام قرآن کو دیکھ ڈالئے، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ کی چھان بین کر لیجئے۔ ہر جگہ تعلیم کی یہی عمومیت اور وسعت عمل کی یہی ہمہ گیری نظر آئے گی، عبادات کی تعلیم، اصلاح و تقویٰ کا درس، غور و تامل کی ہدایت، تفکر و تدبر کی تاکید، الغرض ہر ارشاد اسی ایک اصول ترقی پر منحصر ہے اور کسی جگہ رسمی، ظاہری بے معنی طاعت کو مقصود قرار نہیں دیا گیا۔ نماز میں بھی اسی وحدت عمل کا نظارہ ہے، روزہ میں بھی اسی احساس انسانیت کی تعلیم ہے، زکوٰۃ میں بھی اسی تعاون و ہمدردی کا سبق ہے، حج میں بھی وحدت عمل مقصود ہے اور جہاد نفس و مال اسی محنت و جفاکشی، اسی ایثار و قربانی کی تعلیم ہے جو اساسِ ارتقاء اور بنیادِ اخلاق ہے۔

اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ سب سے زیادہ صدمہ مذاہب کو جس چیز سے پہونچا وہ ڈارون کا اصول ارتقاء (EVOLUTION) تھا، لیکن اسلام اس لحاظ سے بھی تمام مذاہب سے ممتاز نظر آتا ہے، کیونکہ سب سے پہلے جس نے اس مسئلہ کی حقیقت پر گفتگو کی وہ اسلام ہی کا پیرو ابونصر محمد فارابی تھا اور ڈارون سے بہت قبل ابن سینا، ابن باجہ اور ابن مسکویہ (حکمائے اسلام) ہی تھے جنھوں نے اصول ارتقاء کو بڑی حد تک مدون کیا۔

ممکن ہے آج مولوی اس کو بھی کفر و الحاد کہے اور قدیم حکماء اسلام کو کافر و ملحد کے خطاب سے یاد کرے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ قرآن میں خود اس مسئلہ کے مختلف مدارج و اصول کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، آج چونکہ ڈارون کے نام سے یہ نظریہ منسوب کیا جاتا ہے اس لئے مسلمانوں کو اس کے قبول کرنے میں پس و پیش ہوتا ہے، علماء کرام اس کی تضحیک کرتے ہیں، حالانکہ اگر نظر وسیع ہوتی تو ان کو معلوم ہوتا کہ اس نظریہ کے دریافت کا فخر بھی فرزندانِ اسلام ہی کو حاصل ہے اور خود قرآن میں جا بجا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:-

۱۔ "ربنا الذی اعطے کل شئی خلقہ ثم ہدیٰ"

(ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی فطرت و جبلت عطا کی اور پھر ترقی کی طرف مائل کیا)

کیا ڈارون کے اصول انواع کا اس کے سوا کوئی اور مفہوم ہے۔

۲۔ "لیس للانسان الا ما سعیٰ - رفع بعضکم فوق درجات"۔

کیا تنازع للبقا اور صلاحیت کے لحاظ سے، مختلف درجات قیام کی تعیین اور بقاء اصلح کو ان سے بہتر الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے

کیا کلام مجید میں مومنین، مسلمین، صالحین، قانتین وغیرہ کے جو سیکڑوں الفاظ آئے ہیں وہ افراد اصلح کو ظاہر نہیں کرتے اور کیا (Servival of the fittest) کا کوئی اور مفہوم ہو سکتا ہے۔

۳ - "ہوالذی انشاءکم من نفس واحدۃ فمستقر و مستودع"۔

کیا موجودہ علم الحیات کا یہ مسئلہ کہ آفرینش کا سلسلہ صرف ایک نفس سے ہوا ہے جسے (Proton) بھی کہتے ہیں، کوئی دوسری چیز ہے کیا لفظ مستقر سلسلۂ آفرینش کے مختلف مدارج کو ظاہر نہیں کرتا اور کیا لفظ مستودع سے سلسلۂ آفرینش کی آخری مکمل کڑی (انسان) کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

الغرض نظریۂ ارتقاء کا کوئی اصول ایسا نہیں ہے جس کی طرف قرآن نے رہبری نہ کی ہو اور اس لئے تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو علم و حکمت کے زبردست نظریہ کا ہم آہنگ نظر آتا ہے اور پھر ایک اسی مسئلہ پر کیا موقوف ہے تمام وہ مسایل جو اساسی طور پر کسی نہ کسی نہج سے مذہب کے متصادم ہو سکتے ہیں سب کے لئے قرآن میں بہترین اشارات پائے جاتے ہیں اور ایسے مستحکم و مضبوط کہ ذہن انسانی اپنے بلند ترین نقطۂ عروج پر پہونچنے کے بعد بھی ان میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتا۔

فلکیات میں بطلیموس اور ارسطاطالیسی نظام کی تردید سب سے پہلے جس نے کی وہ قرآن ہی تھا کہ اسنے اجرام کو "کل فی فلک یسبحون" کہکر یہ بتایا کہ یہ سب کے سب اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں اس کے بعد کوپرنیکی نظام قایم ہوا جس میں غلطی سے سورج کو اپنی جگہ ساکن مانا گیا پھر ایک زمانہ کے بعد ہرشل نے گزشتہ صدی میں ثابت کیا کہ آفتاب مع اپنے تمام سیارگاں کے خود کسی اور چیز کا طواف کر رہا ہے حالانکہ قرآن اس سے بہت قبل اس حقیقت کا اظہار کر چکا ہے کہ "والشمس تجری لمستقرلہا" اسی طرح علوم جدیدہ کے اور بہت سے اساسی مسایل ایسے ہیں جو تعلیمات قرآنی کے احاطہ سے باہر نہیں ہیں اور اس لئے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اسلام ہی ایک مذہب ہے جو ہر زمانہ کی ترقی کا ساتھ دے سکتا ہے تو یہ دعوےٰ غالباً غلط نہ ہوگا۔

اب رہ گئی اس کی اخلاقی تعلیم جو حقیقتاً اساس تہذیب و تمدن ہے سو اس کے متعلق غالباً مخالفین کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اسلام سے زیادہ عملی درس دینے والا، اور زندگی کو یکسر حرکت و عمل بنا دینے والا کوئی اور مذہب نہیں ہے۔ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی بنیاد خرافیات پر ہے، نہ صنمیات پر، نہ جس کا انحصار اساطیر الاولین کے ماننے پر ہے، نہ کسی مخصوص رسم و رواج اور طریق عبادت و نمایش پر۔ اس نے صرف ایک تعلیم دی ہے کہ دنیا میں آئے ہو تو کائنات پر غور کرو، مظاہر قدرت کا مطالعہ کرکے اپنی ان قوتوں کو بروئے کار لاؤ جو تمہارے اندر ودیعت کر دی گئی ہیں، نظام تمدن میں ایک عضو مفید کی حیثیت پیدا کرو، ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی کرو، اور اپنی سعی و کوشش سے دنیا کو اپنے لئے فردوس بنالو۔ پھر جو شخص اس اصول پر کاربند ہے وہ حقیقتاً اسلام ہی کے اصول پر کاربند کہلائے گا خواہ کسی رنگ و نسل کا ہو اور جو اس پر عامل نہیں ہے اس کو مسلمان کہلائے جانے کا کوئی حق حاصل نہیں، خواہ حطیم کعبہ ہی کے اندر اس کی ماں نے کیوں نہ اس کو جنا ہو۔

نماز اصولاً درس اجتماع ہے، زکوٰۃ اصولاً جذبۂ تعاون ہے، روزہ اصولاً حیات لطیف کی بیداری ہے، اور حج اخوت و انسانیت کا احساس ہے وسیع پیمانہ پر، اس لئے اگر قوم کو ایک شیرازہ میں منسلک کرنے کے لئے ان کے لئے مخصوص قواعد مرتب کئے جائیں تو تعلیم الٰہی کے منافی نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ یہ تمام قواعد و ضوابط صرف سوسائٹی سے متعلق ہیں اور انسانی معاشرت کو اسلوب بلند پر لانے کے لئے ہمیشہ ایسے قانون مرتب کئے جاتے ہیں جو جماعت کے افراد میں باہم انتشار خیال و اختلاف، اعمال کے امکانات کو دور کرکے ہیئت

اجتماعی کو متاثر نہ ہونے دیں، اس لئے یہ بالکل یقینی ہے کہ آج کا بنایا ہوا قانون کل اور کل کا بنایا ہوا پرسوں کام نہیں دے سکتا اور اس میں زمانہ و ملک کے لحاظ سے تبدیلی ضروری ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جس کو ہمارے علماء کرام نے نہیں سمجھا۔

وہ کہتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی فقہ ایک ہی چیز ہے، میں کہتا ہوں کہ ان دونوں میں بہت فرق ہے، وہ کہتے ہیں کہ اسلام نام ہے صرف ایک مخصوص طریقہ سے عبادت کرنے کا، مقررہ قواعد کے تحت روزہ رکھنے کا، تعین مقدار کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے کا، میں کہتا ہوں کہ یہ طریقے اور قاعدے اصل چیز نہیں بلکہ ہر زمانہ کے لحاظ سے بدل جانے والی چیزیں ہیں اس لئے اُن پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے، اور نہ ان کو مذہب میں داخل کرنے کی، بلکہ اگر آج ترقی تمدن، ضروریات معاشرت اقتضاء مشاغل یا کسی اور مصلحت کی بناء پر جس کی رعایت ہماری دنیوی فلاح کے لئے ضروری ہے، فقہ کو بدل ڈالنا اُصول عبادت میں تغیر و تبدل کر دینا، ضابطۂ معاشرت میں ترمیم و تنسیخ کر دینا، مناسب ہو تو ایسا کر دینا چاہئے اور یہی اولین فرض ہے ایک ذی شعور عالم دین کا، ایک صاحب فہم اخلاقی رہبر کا، اور ہر اس ہادی مذہب کا جو اسلام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو اگر یہ کہا جائے کہ ایسا کرنا تحریف مذہب ہوگی تو یہ کہنا بالکل غلط ہوگا، کیونکہ اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو آج حنبلی فقہ، حنفی فقہ، شافعی فقہ کی کیوں تفریق ہوتی، اشاعرہ و معتزلہ کی جماعتیں کیونکر پیدا ہوتیں، قرون اولیٰ میں تاویلات کا دروازہ کیوں کھلتا اجتہادات و قیاسات میں کیوں اختلاف ہوتا اور اقوال آئمہ و مجتہدین میں کیوں اصولی اختلاف پایا جاتا۔

ظاہر ہے کہ کسی مذہب کی بنیاد مسایل فقہیہ نہیں ہوا کرتے، بلکہ اساس مذہب صرف وہ مرکزی خیال ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا پھر دیکھو کہ مذہب اسلام کا وہ مرکزی خیال کیا ہے، صرف یہ کہ دنیا میں اخوت عامہ و انسانیت کے رشتہ کو مضبوط کرو اور ہر ممکن ترقی کے حصول پر آمادہ ہو جاؤ۔

حقیقت سے ہٹ کر فروع کو اصل بنانے کی داستان بہت طویل ہے، اگر اس کی تاریخ کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد عہد سعادت کے ختم ہوتے ہی پڑ گئی تھی، لیکن بعد کو اس میں اور اضافے ہوتے گئے، گمراہیوں میں اشتداد ہوتا رہا، صراط مستقیم سے ہٹنے کے بعد زیادہ پیچ در پیچ راہوں میں اُلجھتے گئے۔ یہاں تک کہ آج اسلام کا مفہوم ہی بالکل بدل گیا اور وہ انسانیت کی سطح بلند سے گر کر رسم و رواج اور اوہام باطلہ عقاید سخیفہ، مفروضات ردیہ اور مزعومات کاذبہ کا مجموعہ ہو کر رہ گیا۔

اسلام دراصل نام تھا صرف اتحاد امت کا، نفسی و مالی جہاد کا، سعی و عمل کا، مکارم اخلاق کا "سیروا فی الارض" کا، اور کفر کہتے تھے صرف افتراق امت کو، جہاد سے جی چُرانے کو، محنت و کوشش سے منحرف ہونے کو، اصول اخلاق سے ہٹ جانے اور پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ جانے کو، لیکن اب اسلام نام ہے صرف تسبیح و عمامہ کا، جُبہ و دستار کا، رسمی نماز ادا کر لینے کا، اور سر منڈا کر رسُما و تقلیداً حرم کے طواف کر لینے کا۔ اسی طرح کفر کا مفہوم یہاں تک وسیع ہو گیا ہے کہ آج میں کسی مولوی سے فلسفہ عبودیت پر بحث کر کے نماز کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں، تو وہ مجھے کافر، ملحد، فاسق و فاجر کہہ کر نکال دیتا ہے۔

بہر حال دُنیا کو ایک نظام کی ضرورت یقیناً ہے کیونکہ جامعۂ بشری اس کا محتاج ہے، اخلاق کی تعلیم کے لئے کسی نہ کسی ایسی ضرورت ہے جو سوسائٹی کے قوانین لوگوں پر عاید کر سکے اور وہ نظام اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف اسلام ہے جس کی آغوش ساری دُنیا کے لئے کھلی ہوئی ہے اور جس کی تعلیمات ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے موزوں و مناسب ہو سکتی ہیں۔

قرآن وحی الٰہی ہے لیکن خُدا کا کلام نہیں

جن مذاہب کو الہامی کہا جاتا ہے ان کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان مذاہب کے بانیین کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے کیونکہ تمام مذہبی تعلیمات انھیں کی وساطت سے ہم تک پہونچی ہیں اور اگر ہم یہ باور کرلیں کہ وہ اپنے اخلاق کے لحاظ سے بڑا بلند مرتبہ رکھتے تھے، وہ کبھی غلط بات نہ کہتے تھے، کبھی جھوٹ نہ بولتے تھے، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کے اقوال کو غلط سمجھیں اور من وعن جو کچھ انھوں نے کہا اس پر یقین نہ لائیں۔

پھر اس نقطۂ نظر سے ہم عیسوی، موسوی یا دوسرے اخلاقی و الہامی مذاہب پر تو کوئی بحث نہیں کرسکتے کیونکہ ان کی کتابیں اب مفقود ہیں اور ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے اقوال و ارشادات کیا تھے لیکن اسلام کے بارہ میں بے شک ہم اسی اصول کو سامنے رکھ کر گفتگو کرسکتے ہیں، کیونکہ قرآن کا غیر محرف شدہ ہونا سارے دنیا کے نزدیک مسلم ہے اور مذہبی صحایف میں صرف یہی ایک صحیفہ ایسا ہے جس میں ایک نقطہ کی کمی یا بیشی آج تک نہیں ہوئی۔

پھر آئیے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ رسول اللہ اخلاقی حیثیت سے کس مرتبہ کے انسان تھے، اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ آپ غیر معمولی صفات انسانی سے متصف تھے اور آپ کی سب سے بڑی صفت جس کو آپ کے دشمنوں نے بھی تسلیم کیا ہے یہ تھی کہ آپ نے کبھی عمر کے کسی حصّہ میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جسے آپ جھوٹ سمجھتے ہوں یا جس کی صداقت کا آپ کو یقین نہ ہو۔

اب اس بنیادی اصول کو سامنے رکھ کر ارشاد نبوی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آپ کا سب سے بڑا پیام قرآن تھا اور کوئی وجہ نہیں کہ اس میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے، وہ واقعی رسول اللہ کا صحیح مافی الضمیر نہ ہو۔

اگر آپ نے یہ فرمایا ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ واقعی وحی تھی اور اگر آپ نے یہ دعوے کیا ہے کہ قرآن ان پر خدا کی طرف سے نازل ہوا تو یہ بھی بالکل صحیح ہے، ورنہ وہ کبھی ایسا نہ فرماتے ــ الغرض اس باب میں یہ سمجھنے کی تو کوئی گنجائش نہیں کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ خلاف حقیقت تھا لیکن اس حیثیت سے کہ قرآن کے الفاظ یقیناً دنیاوی زبان کے الفاظ تھے ہم یہ گفتگو ضرور کرسکتے ہیں کہ وحی و الہام کے ان معانی کے علاوہ جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں کوئی اور معنی بھی ہوسکتے ہیں یا نہیں۔ نیز یہ کہ خود قرآن اس باب میں کس حد تک ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

قرآن کو خدا کا کلام ثابت کرنے کے سلسلہ میں قرآن نے جن الفاظ کو پیش کیا جاتا ہے وہ صرف چار ہیں:۔ وحی والہام، القاء، "لوح محفوظ" اور انھیں کے سمجھ لینے پر قرآن کے کلام خدا ہونے کا صحیح مفہوم متعین ہوسکتا ہے۔

وحی، الہام، القاء لغت میں وحی کہتے ہیں اشارہ کرنے کو، پیغام پہونچانے کو، جلدی کرنے اور لکھنے کو، وحی کے بعد اگر صلۂ الیٰ کا استعمال ہوتا ہے اور کبھی بغیر کسی صلہ کے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ صلۂ الیٰ کے ساتھ جب استعمال ہوتا ہے تو

اس کا مفہوم اشارہ کرنا اور بھیجنا ہوتا ہے، مثلاً وحی الیہ (اشارہ کیا اور پیام بھیجا اس کی طرف)۔ وحی الیہ کلاماً اس سے خفیہ بات کی وحی الذبیحۃ (جانور کو جلدی ذبح کیا) ۔ وحی الکتاب، وحی مکتوب کے معنی میں بھی آتا ہے اور داحی جلدی کرنے والے کو کہتے ہیں

الہام تعدیہ مزید ہے لہم کا جس کے معنے نگلنے کے ہیں اس لئے الہام کے معنی نگلوانے کے ہوئے۔

القاء کے معنے ڈالنے اور پہونچانے کے ہیں، چنانچہ القی الیہ القول بات پہونچانے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

ان تینوں الفاظ میں ایک مفہوم بقدر مشترک سب میں موجود ہے، یعنی خلاف معمول خارج سے کسی شئے کا حاصل ہونا، اسی لئے جب ان الفاظ کے اصطلاحی معنی پیدا کئے گئے تو ان میں بھی خارج کی رعایت ملحوظ رہی اور چونکہ مذہب و نبوت کے باب میں تمام تعلیمات و تلقینات کا منبع ذات خداوندی ہے اس لئے وہ خارج فضا، ذات خدا سے متعلق کی گئی اور وحی، الہام و القاء کے معنی ہوگئے ان ہدا واشارات کے جو خدا کی طرف سے نبی کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔

سب سے پہلی غلطی جو وحی کا مفہوم متعین کرنے میں روا رکھی جاتی ہے یہ ہے کہ وحی کو انبیاء و رسل کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا، حالا حقیقت یہ نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء و رسل کے پاس وحی بھیجے جانے کا ذکر کلام پاک میں پایا جاتا ہے، لیکن غیر انبیاء بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل ہونا قرآن سے ثابت ہے، سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"واوحینا الیٰ ام موسیٰ ان ارضعیہ"

ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں۔

ظاہر ہے کہ موسیٰ کی ماں نبیہ نہ تھیں اور اس لئے آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کے جی میں یہ بات ڈال دی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں اور اس طرح وحی کے معنی وہ نہ رہے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔

خدا نے انسان کے علاوہ حیوانات پر بھی وحی بھیجی ہے۔ سورۂ نحل کی آیت ہے:۔

"واوحیٰ ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتاً ومن الشجر ومما یعرشون"

ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں اور درختوں اور مکانوں میں اپنا چھتا بنائے۔

اس جگہ وحی کے معنی اس فطرت ذکاوت کے ہوئے جس سے کام لے کر شہد کی مکھی اپنا خوبصورت چھتا طیار کرتی ہے۔ جمادات پر وحی نازل ہونے کا ثبوت سورۂ زلزال کی اس آیت سے ملتا ہے:۔

"یومئذٍ تحدث اخبارہا بان ربک اوحیٰ لہا"

اس دن زمین اپنی خبریں اس طرح بیان کرنے لگے گی جیسے خدا نے اس پر وحی نازل کی ہو۔

ظاہر ہے کہ زمین زبان نہیں رکھتی اس لئے اس کا یہ بیان بہ زبان حال ہوگا اور اس جگہ وحی کا مفہوم "ماحول و اقتضاء ماحول" قرار پا کلام مجید میں ایک جگہ اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ سورۂ "حم" میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"فقضٰہن سبع سمٰوات فی یومین واوحیٰ فی کل سماء امرہا"

پس ہم نے دو دن میں سات آسمانوں کی تخلیق کا حکم دیدیا اور ہر آسمان میں اس نظم و اصول کو وحی کردیا

اس جگہ وحی کے معنی ودیعت کرنے کے ہوئے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن میں وحی کا لفظ کس قدر وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق بڑی حد تک اس فطری صلاحیت یا ذکاوت سے ہے جو خدا نے ایک انسان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کر دی ہے اور آپ سن کر تعجب کریں گے کہ الہام و وحی کا استعمال بُری باتوں کے لئے بھی کیا گیا ہے۔

سورۂ شمس میں نفس ایمانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :۔

"فالھمہا فجورہا وتقواہا"

یعنی اس میں بُرائی بھلائی الہام کی ۔۔ یہاں بھی الہام اسی فطری صلاحیت و عدم صلاحیت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ لفظ وحی بھی ایک جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بُری باتوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ انعام کی یہ آیت

"وکذالک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا"

اس طرح ہم نے ہر نبی کے ساتھ اس کے دشمن اس کے ساتھ لگا دئے، یہ وہ شیاطین ہیں جو ایک دوسرے کو لغو باتوں کی وحی کرتے رہتے ہیں۔

اس جگہ وحی کے معنی "بُری بات سجھانے" کے ہوئے۔ یہاں تک تو لفظ وحی کے اس مفہوم سے بحث ہوئی جو مختلف جگہ پر مختلف مفہوم میں مستعمل ہوا ہے، اب خود قرآن پاک سے جو تعلق وحی کا ظاہر کیا گیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے :۔

سورۂ نجم میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"وما ینطق عن الھویٰ ان ھوالا وحیٌ یوحیٰ علمہ شدید القویٰ"

رسول ہوائی باتیں نہیں کرتا، بلکہ وہ سب کچھ وحی ہے اور ایک بڑی قوت والے نے اسے سکھایا ہے۔

سورۂ انعام میں رسول اللہ کی زبان سے یہ کہے جاتے ہیں :۔

"واوحی الیّ ہذالقرآن لانذرکم بہ"

مجھ پر قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تمھیں بُری باتوں کی طرف سے ڈراؤں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں قرآن کو حکمت کی کتاب بتایا جاتا ہے :۔

"ذالک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ"

سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"قل لا اقول لکم عندی خزاین اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا مایوحی الیّ"

(اے رسول کہدو کہ نہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کا حال جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے وحی کیا جاتا ہے)

ان تمام آیات میں قرآن کو وحی بتایا گیا ہے لیکن صرف اس کے علم و حکمت ہونے کے لحاظ سے اور کہیں نہیں یہ ظاہر کیا گیا کہ الفاظ بھی خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں۔

خدا کسی سے ہمکلام نہیں ہوسکتا، نہ کوئی انسان اس سے ہمکلام ہوسکتا ہے، عبد و معبود کی اس باہمی گفتگو کی صورت کوئی اگر ہوسکتی ہے تو صرف وحی کے ذریعہ سے اس کا ثبوت خود قرآن میں موجود ہے۔

سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے :-

"وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیًا او من وراء حجاب"۔ یعنی انسان خدا سے ہمکلام نہیں ہوسکتا سوا اسکے کہ اسپر وحی بھیجے

اس آیت سے اس عقیدہ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ موسیٰ خدا سے باتیں کرتے تھے۔

مسلمانوں میں یہ عقیدہ کیوں پیدا ہوا کہ قرآن کے تمام الفاظ خدا کے الفاظ ہیں اور فرشتہ ان الفاظ کو رسول اللہ کے پاس لایا کرتا تھا اس کے متعلق ہم آئندہ بیان کریں گے، لیکن ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی طرف سے جو آیتیں کلام پاک کی پیش کی جاتی ہیں پہلے انھیں سن لیجئے۔

سورۂ زخرف کی آیت ہے :-

"ان جعلنا قرآنا عربیا لعلکم تعقلون، وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم"

اس آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اس ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جو ہمارے پاس موجود ہے یہ ام الکتاب ہے کیا اس کی صراحت میں وہ کلام مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں :-

"بل ہو قرآن مجید فی لوح محفوظ"

(یعنی قرآن ایک تختی میں محفوظ ہے)

ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جس کا دوسرا نام لوح بھی ہے، لیکن جس وقت ہم سورۂ رعد کی حسب ذیل آیت پڑھتے ہیں تو ہم کو "لوح وام الکتاب" دونوں کا صحیح مفہوم معلوم ہو جاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے :-

"ہو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ہذہ ام الکتاب واخر متشابہات"

اس آیت میں "ام الکتاب" کو "آیات محکمات" سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی "مضبوط و مستحکم نشانیاں" یا بالفاظ دیگر وہ قوانین فطرت جو اٹل ہیں اور جن میں تبدیلی ممکن نہیں اور یہی مفہوم لوح یا تختی کا بھی قرار پایا۔

۲ - اب عام روایات کی بناء پر اس عقیدہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو قرآن کے ام الکتاب اور لوح محفوظ میں مرسوم ہونے کے متعلق عام مسلمانوں میں رواج پا گیا ہے۔ قصص الانبیاء کی روایت ملاحظہ ہو :-

عرشِ اعظم سے نیچے اس نے ایک دانہ مروارید پیدا کیا اور اس موتی سے اس نے لوحِ محفوظ بنائی۔ اس لوح کا طول ۵۰۰ سال اور عرض ۴۰۰ برس کی راہ[1] تھا اس کے حاشیہ پر خدا نے اپنی قدرت سے لعل و یاقوت کی گل کاری کی تھی۔ بعد ازاں قلم کو حکم ہوا کہ :-

"لکھ اے قلم میری تمام مخلوق کی نسبت اور جو کچھ تا قیامت ہو گا اس کے متعلق میرے علم کا حال"۔

قلم نے لوح محفوظ پر "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھا اور پھر تمام مخلوقات کی نسبت قیامت کا حال لکھا، یہاں کہ درخت کا پتہ ہلنے گرنے یا اوپر اڑنے تک کا حال درج کیا۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ ایک مادی تختی تھی جو موتی سے بنائی گئی تھی اور جس پر خوشنویسوں کی رسم کے مطابق چاروں طرف حاشیہ میں گلکاری بھی کی گئی تھی۔ اس لغویت کے ساتھ ہی اس بیان سے یہ عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عالم کی

---

[1] معلوم نہیں راہ کس کی مراد ہے، انسان کی، طیور کی یا حشرات کی اور اگر موٹر یا ہوائی جہاز کی رفتار کو سامنے رکھا جائے تو یہ راہ کتنے دن کی قرار پائے گی۔

تخلیق سے قبل ہی قرآن لوحِ محفوظ میں درج ہوگیا تھا، لیکن اس خیال کی تکذیب خود قرآن پاک کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں زبور، توریت و انجیل وغیرہ کا بھی ذکر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے پہلے ہی لوحِ محفوظ میں درج ہوگئی ہوں گی ورنہ ایسی چیز کا ذکر جو وجود میں نہ آئی ہو کوئی معنی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ لوح کے عقیدہ کا خیال بہت قدیم ہے، اہلِ بابل کا عقیدہ تھا کہ ہر شخص کی قسمت کا حال ایک لوح پر لکھا ہوا محفوظ ہے، یہی خیال توریت میں منتقل ہوا جیسا کہ کتاب استثناء باب ۱۰، آیت ۱ لغایتہ ۵ سے ظاہر ہوتا ہے، اس میں لکھا ہے کہ جب موسیٰ نے خدا کے حکم سے ویسی دو تختیاں پتھر تراش کر بنائیں، جیسی اس نے توڑی تھیں، تو خدا نے ان پر احکام عشرہ تحریر فرمائے اور موسیٰ کو خدا نے حکم دیا کہ وہ ان تختیوں کو ببول کی لکڑی کے صندوق میں محفوظ رکھے"۔ اور پھر یہی خیال یہود سے مسلمانوں میں منتقل ہوا، چنانچہ عبرانی زبان میں جو لفظ تختی کے لئے استعمال ہوا ہے وہی ہے جو عربی میں پایا جاتا ہے۔

چونکہ رسول اللہ کے زمانہ میں یہود و نصاریٰ عام طور پر یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے توریت و انجیل لوحِ محفوظ میں منقوش خدا کے پاس موجود ہیں اور اس عقیدہ سے عوام بہت متاثر ہوتے تھے اس لئے مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا کہ اگر قرآن، توریت و انجیل کی طرح خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے تو اسے بھی لوحِ محفوظ میں درج ہونا چاہئے اور اس باب میں متعدد حدیثیں گھڑلی گئیں۔

۳- یہاں تک میں نے روایتی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر واضح کر دیا ہے کہ قرآن کا وحی ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے اور اس کو لوحِ محفوظ میں درج سمجھنا ایک مستعار عقیدہ ہے جو قدیم بابلیوں اور یہود و نصاریٰ سے لیا گیا ہے، اب روایتی حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے، حد درجہ جاہلانہ عقیدہ ہے جس سے ایک طرف خدا کے تصور وحدانیت کو صدمہ پہونچتا ہے اور دوسری طرف رسول کی عظمت کو۔

اگر ہم الفاظِ قرآن کو بھی الہامی اور منطوق خداوندی کہیں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کی صفت نطق مادی اسباب کی محتاج ہوگی اور یہ اسلام کے تصور وحدانیت کے منافی ہے۔

گفتگو، نطق، الفاظ، ان سب کے تخیل کے ساتھ ہم مجبور ہیں کہ ان تمام آلات نطق یا عضلات و اعصاب وغیرہ کو بھی سامنے رکھیں جو ادائے صوت کے لئے ضروری ہیں اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ خدا ایسے الفاظ بغیر کسی مادی اسباب یا ذرائع کے پیدا کر سکتا ہے تو ایسا فرض کرنے کی نہ کوئی دلیل موجود ہے اور نہ اس کی ضرورت۔

خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے تو قطعی اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ انسان کی طرح چلتا پھرتا، بولتا، چالتا، فرض کیا جائے اور رسول کی برتری اخلاق کے ثبوت کے لئے بھی ضروری نہیں کہ خدا اس سے باتیں کرے یا اس کی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کرکے اپنے فرشتہ کے ذریعہ سے اس کے پاس بھیجدے بلکہ سچ پوچھئے تو یہ رسول کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو۔

رسول کو محض ایک ایسے پیغامبر کی حیثیت دینا جو خود کوئی عقل یا ارادہ نہ رکھتا ہو، جسے خود کچھ کہنے سننے کا اختیار نہ ہو اس کی انسانی حیثیت کو عام انسانی سطح سے بھی نیچے گرا دیتا ہے۔

ہم رسول کو مصلح قوم کہتے ہیں، لیکن کیا وہ شخص صحیح معنی میں مصلح ہوسکتا ہے جو وقت و زمانہ کے لحاظ سے خود کوئی حکم لگانے یا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار نہ رکھتا ہو، جو خود قوانین اصلاح وضع نہ کر سکتا ہو اور جو اپنی ذاتی عقل و رائے سے کام لینے کا مجاز

نہ ہو، فوج کے ایک جنرل کا یہ کام نہیں کہ وہ صرف مرکز کے احکام کی تعمیل کرے اور خود اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے کر فوج کو نہ لڑائے اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وقت و موقعہ کے لحاظ سے خود مناسب احکام صادر کرے کیونکہ وہ جنگ کو کامیاب بنانے کا ذمہ دار ہے

اگر قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف خدا کا بتایا ہوا ہے تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا دُنیا میں جواب نہیں اور اگر خدا کوئی کلام کرسکتا ہے تو واقعی اس کو ایسا فصیح و بلیغ ہونا چاہئے لیکن اس سے رسول اللہ کی ذہنی بلندی یا قوت اختراع کیا ثابت ہوتی ہے۔

الغرض قرآن کو خدا کا کلام کہنا یا لوح محفوظ میں اس کا مرتسم ہونا یقین کرنا صحیح اسلامی خیال نہیں ہے بلکہ مستعار ہے یہود و نصاریٰ سے، قرآن میں جہاں جہاں "کلام اللہ اور کلمات اللہ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے مراد خدا کے احکام ہیں، رسول نے صرف الفاظ پیش کرکے ان کی پوجا نہیں کرائی بلکہ احکام پیش کرکے ان کی تعمیل چاہی ہے۔

یہ ہے میرا عقیدہ قرآن پاک اور رسول اللہ کی رسالت کے متعلق اور میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضاء یہی ہے کہ قرآن کو انھیں کا کلام سمجھا جائے اور اس کے وحی ہونے کا مفہوم وہی قرار دیا جائے جو اس سے قبل کے صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے۔

اگر قرآن کو خدا کا کلام سمجھا جائے جو عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے تو اس پر بہت سے شبہات وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ وہ بھی از خود وجود میں آیا ہے، دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا۔ حالانکہ قدیم ذات صرف خُدا کی ہے اور اگر اول صورت مانی جائے تو قرآن کو "شے مخلوق" ماننا پڑے گا، لیکن "شے" کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ:۔ "کل شئی ہالک الا وجہہ"۔ اس لئے یہ نتیجہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانے والی چیز ہے، اور اس لئے خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔

(۲) اگر قرآن شریف نام ہے ان الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعہ چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ تو کلام مجید کا ہر نسخہ کلام خداوندی ہے اور جو نسخہ ان میں سے ضایع ہو جائے اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ خدا کا کلام ضایع ہو گیا۔

(۳) اگر قرآنِ پاک خدا کا کلام ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصور کیا جائے یا صفات خداوندی میں شامل کیا جائے، قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کے معنے یہ ہوں گے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن ہے، اس لئے لامحالہ اسے "صفت ربانی" ماننا پڑے گا، لیکن چونکہ خدا کی ہر صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے اس لئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ "نطق خداوندی" ہے جو جبرئیل کے ذریعہ سے آنحضرت تک پہونچایا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ نے بھی اسی طرح اس کو نطق کیا تھا۔ جس طرح خدا نے کیا تھا، بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے۔

(۵) قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے، اس لئے وہ قرآن جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے، اس قرآن سے بہ لحاظ ترتیب مختلف ہے جو لوح محفوظ میں پایا جاتا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پذیر چیز حادث ہے، حالانکہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہئے۔

(۶) کہا جاتا ہے کہ قرآن نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی اس کی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں رسالتمآب پر نازل ہوئی ہے جس کو اصطلاح میں "شانِ نزول" کہتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا وہ آیت بھی موجود نہ تھی اس لئے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوحِ محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں واقعہ پیش آئے گا اور اسی علم کی بنا پر پہلے ہی تمام آیات لوحِ محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں تو پھر ان واقعات وحالات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔

(۷) اگر قرآن مجید پہلے سے لوح محفوظ میں موجود تھا تو پھر ان آیات کے متعلق کیا کہا جائے گا جو لفظ قُل سے شروع ہوتی ہیں یعنی جن میں رسول اللہ سے خطاب کرکے کہا جاتا ہے کہ "ایسا کہو" درانحالیکہ اس وقت رسول اللہ کی ذات دنیا میں موجود نہ تھی، اسی طرح ان دُعاؤں کی کیا تاویل کی جائے گی جن کی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے۔ کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل تمام دُعائیں مرتب کر لی گئیں تھیں۔

(۸) قرآن شریف میں بہ کثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہے جن کا تعلق عہد نبوی سے ہے۔ مثلاً ابو لہب یا کفار مکہ اور ان کے اصنام وغیرہ پھر اگر قرآن مجید ازل سے لوح محفوظ میں منقوش تھا (جیسا کہ عام عقیدہ ہے) تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ بصورت مقدرات طے ہو چکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہو جاتی ہے جس میں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف ان کے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہے، درانحالیکہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔

(۹) خدا کو سمیع وبصیر بھی کہتے ہیں لیکن اس کی سماعت وبصارت کان اور آنکھ کی محتاج نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ جب اس کی صفت نطق کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ "نطق" ہو جو الفاظ کا محتاج ہے، جس طرح اس کو سننے اور دیکھنے کے لئے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں، اسی طرح کلام کے لئے زبان یا الفاظ سے اسے بے نیاز ہونا چاہئے اور اس صورت میں الفاظ قرآنی کو "خدا کا کلام" کہنا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زبان والفاظ کا محتاج ہے۔

یہ ہیں چند منجملہ اور شبہات کے جن کی بناء پر میں قرآن پاک کو "منطوق خداوندی" نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن اگر ان تمام باتوں کے جواب میں یہ کہا جائے کہ کلام خداوندی سے مراد قرآن کے الفاظ وحروف نہیں ہیں، بلکہ ان کا مفہوم مراد ہے تو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ خدا نے علیٰ وجہ البصیرت تمام احکام رسول اللہ پر نازل کئے جنھیں آپ نے اپنی زبان میں پیش کر دیا۔ بلکہ اس سے زیادہ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ نہ صرف مفہوم بلکہ الفاظ قرآنی بھی وہی ہیں جو رسول اللہ کو القا ہوئے تھے۔

الغرض جیسا کہ ابھی ظاہر کیا گیا وحی والہام صرف انبیاء کے لئے مخصوص نہیں ——— النحل (شہد کی مکھی) کی طرف بھی وحی بھیجتا ہے۔ (فاوحیٰ ربک الی النحل) اور حضرت موسیٰ کی ماں کو بھی وحی بھیجی حالانکہ وہ نبیہ نہ تھیں

(اذاوحینا الیٰ امک مایوحیٰ) حواریین مسیح کو بھی بھیجی حالانکہ وہ نبی نہ تھے۔ (واذاوحیت الی الحواریین ان آمنوبی وبرسولی) اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ شیاطین و اعداء نبی کو بھی وحی بھیجتا ہے (وکذالک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الیٰ بعض زخرف القول غرورا) یہی حال الہام کا بھی ہے کہ فاجر و متقی دونوں کا فجور و تقویٰ الہامی چیز بتایا گیا ہے۔ (فالھمھا فجورھا وتقواھا)

وحی و الہام نام ہے اس صلاحیت کا جو ایک مخصوص قوت ادراک کی وجہ سے ایک شخص کو کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ پس جس شخص میں یہ صلاحیت دماغی ساخت کے لحاظ سے جتنی اچھی یا بری، قوی یا ضعیف ہوگی، اتنا ہی ایک شخص متقی یا فاجر ذکی الحس یا بلید الادراک ہوگا۔ گویا وحی یا الہام نام ہے صرف ایک مخصوص فطری حس (INSTINCT) کا جو ایک شخص قدرت کی طرف سے لے کر آتا ہے اور اسی کے زیر اثر اس سے مخصوص افعال سرزد ہوتے ہیں۔

پھر چونکہ نبوت بھی اکتسابی چیز نہیں ہے، بلکہ نبی پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی دماغ کی ساخت، قوتِ ادراک کی نوعیت، اثر و تاثر کی شدت، فطانت و ذکاوت کے لحاظ سے عام انسانوں سے بہت بلند ہوتا ہے اس لئے اس میں وہ کیفیت بہت شدید ہوتی ہے جسے وحی و الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

انسان پر کسی خاص جذبہ یا کیفیت کا طاری ہونا حقیقتاً ایک نوع کی مقناطیسیت ہے جس سے انسان پہلے خود متاثر ہوتا ہے اور پھر دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔ پھر یہ کیفیت جتنی زیادہ قوی ہوگی اسی قدر وہ خود بھی زیادہ متاثر ہوگا اور دوسروں کو بھی متاثر کرے گا۔ ہم ایک غمزدہ انسان کو دیکھ کر کیوں ملول ہو جاتے ہیں، ایک سوگوار ماں کا بین سن کر کیوں رنجیدہ ہو جاتے ہیں، ہم ایک معصوم بچہ کو دیکھ کر کیوں بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں؟ اس لئے کہ اس کا غم، اس کی سوگواری اور اس کی معصومیت ایسا شدید حال ہے، ایسی قوی مقناطیسیت ہے کہ دوسروں کا اس سے متاثر ہو جانا ناگزیر ہے۔

جس کسی شخص پر کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کی تمام قوتوں میں ایک مخصوص قسم کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کے وہ قوائے کامنہ بھی ظاہر ہو جاتے ہیں جو اس سے قبل پوشیدہ و خوابیدہ تھے۔ مخصوص کیفیات کے تحت مخصوص افعال اس سے سرزد ہونے لگتے ہیں، مخصوص الفاظ اس کے منہ سے نکلنے لگتے ہیں اور دیکھنے سننے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ ایسا کیونکر ہوا۔ غصہ کی حالت میں کمزور انسانوں کی حالت سے بھی غیر معمولی قوت کا اظہار دیکھا جاتا ہے اور انتہائی جوش و تاثر کے عالم میں جو الفاظ ایک واعظ کی زبان سے نکل جاتے ہیں، وہ یوں معمولی حالت میں ممکن نہیں۔

نبی چونکہ فطرت سے نہایت ہی روشن دماغ، اعلیٰ صلاحیت، غیر معمولی ذکاوتِ حس اور روحانی بلندی لیکر آتا ہے اس لئے اس کے اندر ہمیشہ نیک جذبہ پیدا ہوتا ہے اور انتہا درجہ کا قوی اور بڑی زبردست مقناطیسی قوت رکھنے والا ہوتا ہے، خود اسکے اوپر ایک کیفیت محویت و استغراق (TRANCE) کی طاری ہوتی ہے اور اس حالت کے تحت مخصوص الفاظ اس کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، جن میں قصد و ارادہ کو دخل نہیں ہوتا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اور قوت اس سے یہ سب کچھ کہلا رہی ہے اس حالت میں جو کچھ ایک نبی کی زبان سے نکلتا ہے اسے وحی و الہام کہتے ہیں اور اس قوت و صلاحیت کو مذہبی زبان میں لوگوں کو سمجھانے کے لئے روح القدس یا جبرئیل سے موسوم کیا جاتا ہے۔

وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ الہامی کتاب اسی معنی میں خدا کا کلام ہے جیسا کہ عام طور پر انسان کی گفتگو، حقیقتاً غلطی میں

بتلاتی ہیں۔ خدا جس طرح زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے، اسی طرح وہ الفاظ و کلام کی پابندی سے مبرا ہے۔

قرآن مجموعہ ہے انھیں تمام الہامی الفاظ کا جو وقتاً فوقتاً خاص کیفیت تاثر کے تحت رسول اللہ کے قلب پر نازل ہوئے اور جو مخصوص محویت و استغراق کے عالم میں آپ کی زبان سے نکلے۔ اس لئے جس مجموعہ کو قرآن کہتے ہیں، وہ یقیناً الہام ہے، وحی ہے اور ان تاثرات کا نتیجہ ہے جو حجابات کے اُٹھ جانے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

خود خدا نے قرآن کا جو مفہوم بتایا ہے وہ اس بیان کی تائید کرتا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

"وکذٰلک اوحینا الیک روحاً من امرنا" (اسی طرح ہم نے اپنے منشا سے سری طرف اشارۂ روحانی کیا ہے) یعنی جسے کلام خدا کہا جاتا ہے وہ نتیجہ ہے صرف اشارۂ روحانی کا، ہدایت غیبی کا جو مخصوص الہامی الفاظ کی صورت میں رسول اللہ کی زبان سے ادا ہوئے۔

اب رہا سوال جبرئیل کا یقیناً جبرئیل سے مراد صرف وہ ملکہ و قوت فطری ہے جو رسول اللہ میں قبول وحی و الہام کے متعلق پائی جاتی تھی۔ ورنہ کلام مجید نہ عرش پر منقوش تھا جسے پڑھ کر جبرئیل آتے اور رسول اللہ کے کان میں ڈالتے تھے اور نہ خدا کی کوئی زبان ہے جو الفاظ کی محتاج ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن کے تمام الفاظ یقیناً وحی تھے اور بغیر وحی ممکن نہ تھا کہ محض رسول اللہ اپنی زباندانی کی مدد سے قرآن مرتب کر سکتے اور اسی لئے "فاتوا بسورۃٍ من مثلہ" کے چیلنج کا جواب فصحائے عرب میں کوئی نہ دے سکا۔ بلکہ خود احادیث رسول اللہ کا بھی وہ رنگ نہیں ہے جو کہ قرآن کی آیتوں کا ہے۔

ادارۂ فروغ اردو (نقوش) لاہور کے مطبوعات

اور اس کے خصوصی سالنامے

آپ ہم سے حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جو کتابیں یا سالنامے مطلوب ہوں ان کی قیمت ہمیں بھیج دیجئے، پندرہ دن کے اندر آپ کو ذریعہ رجسٹری مل جائیں گی (وی، پی کے ذریعہ سے نہیں بھیجی جا سکتیں) آرڈر دس روپے سے کم کا نہ ہو اور محصول ڈاک بحساب ۵ فی صدی روانہ کیا جائے۔ — مینجر نگار لکھنؤ

تاریخی و ادبی کتابیں

ید بیضا۔ سید عابد علی کے دلنشین ڈراموں کا مجموعہ۔ [illegible]

سیاست الٰہیہ۔ امام ابن تیمیہ کی تصنیف کا ترجمہ۔ [illegible]

ہماری داستانیں۔ ہماری قدیم داستانوں کی داستان [illegible]

نقوش لطیف۔۔ مرتبہ احمد ندیم قاسمی۔۔۔ [illegible]

مضامین جمال الدین افغانی۔۔۔۔۔۔ [illegible]

انتقاد۔ سید عابد علی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ [illegible]

پانچ ناولٹ۔۔۔ مرتبہ وقار عظیم۔ اس مجموعہ میں منٹو، شوکت تھانوی، اشفاق احمد، اے حمید اور

انتصار حسین کے بہترین ناولٹ ہیں۔۔۔۔۔ [illegible]

تذکرہ شعرائے متغزلین۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی [illegible]

امراؤ جان ادا۔۔۔۔۔۔ [illegible]

تصانیف شوکت تھانوی

مولانا۔۔۔ [illegible] — غزالہ۔۔۔۔ [illegible]

خدانخواستہ۔۔۔ [illegible] — سودیشی ریل۔۔ [illegible]

کتیا۔۔۔ [illegible] — سانچ کو آنچ۔۔۔ [illegible]

کارٹون بے قاعدہ [illegible] — بار خاطر۔۔۔ [illegible]

بقراط۔۔۔ [illegible] — جوڑ توڑ۔۔۔ [illegible]

مضامین شوکت۔۔۔۔۔ [illegible]

قاضی جی ۲ حصے۔۔۔ فی حصہ۔۔۔ [illegible]

غالب کے ڈرامے [illegible]

وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔۔ [illegible]

نقوش کے چند خصوصی نمبر

افسانہ نمبر۔ مجلد۔۔۔۔۔ [illegible]

شخصیات نمبر۔۔ نمبر ۲۔۔۔۔ [illegible]

منٹو نمبر۔۔۔۔۔۔ [illegible]

مکاتیب نمبر۔۔۔۔۔۔ [illegible]

خارستانِ احادیث

ظہور اسلام سے قبل بھی اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے اسلاف و اکابر کے مراسم و شعائر اور واقعات "تاریخی و روایات محفوظ رکھا کرتے تھے اور ان سے ہٹنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جب رسول اللہ مبعوث ہوئے اور عربستان کی ذہنی اور دماغی دُنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا تو اسی کے ساتھ اس عادت میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی یعنی روایات قدیمہ کے محفوظ رکھنے کے بجائے رسول و صحابہ کے اقوال و افعال کی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی اور یہ تھی اولین بنیاد فنِ حدیث کی۔

پھر چونکہ کسی واقعہ کا انحصار زیادہ تر اس پر ہے کہ اس کے بیان کرنے والے نے خود اُسے دیکھا ہو یا اُس سے قریب تر زمانہ میں پایا جاتا ہو' اس لئے سب سے زیادہ معتبر راوی وہ صحابہ مانے گئے جو رسول اللہ کے ساتھ ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے اور سفر و حضر میں ساتھ رہتے تھے' اس کے بعد تابعین کا درجہ قرار پایا جنھوں نے صحابہ کا زمانہ دیکھا تھا اور پھر تبع تابعین کا و ہلم جرا ۔ ــــــــــــــ

اس لئے حدیث کے دو حصے ہو گئے' ایک وہ جسے اسناد کہتے ہیں۔ دوسرا متن یعنی ایک حصہ وہ جس میں یہ بتایا جائے کہ کن کن راویوں کے ذریعہ سے روایت بیان کی گئی اور دوسرا حصہ خود اس واقعہ یا روایت کا۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جب کوئی شخص کسی واقعہ کی روایت کرتا تھا تو اسے یہ بھی ثابت کرنا پڑتا تھا کہ واقعی رسول اللہ نے ایسا فرمایا' یا ایسا کیا اور اس کا ثبوت اس سے زیادہ کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ معتبر راویوں کا سلسلہ بیان کر دے۔

اس امر کی تحقیق کے لئے کہ جن راویوں کے سلسلہ سے حدیث بیان کی جاتی ہے وہ معتبر ہیں یا نہیں اور یہ کہ اخلاقی و ذہنی اعتبار سے ان کا کیا مرتبہ ہے' ایک علٰحدہ فن کی بنیاد پڑی جسے فن رجال کہتے ہیں اور اس کا اصطلاحی نام "الجرح والتعدیل" قرار پایا۔

ظاہر ہے کہ تنقید کے سلسلہ میں بعض روایتیں زیادہ معتبر تسلیم کی گئی ہوں گی اور بعض کم۔ اس لئے راویوں کی حیثیت' الفاظ اور روایت کے اختلاف' اور سلسلۂ روایت کے لحاظ سے حدیث کی بہت سی تقسیمیں ہو گئیں۔

(۱) اگر راویوں کا پورا سلسلہ نہایت معتبر ہے اور حدیث میں کوئی بات عقیدۂ مروجہ کے خلاف نہیں ہے تو ایسی حدیث کو "صحیح" کہتے ہیں۔

(۲) اگر راویوں کے سلسلہ میں کوئی راوی کم درجہ کا ہے یا اسناد مکمل نہیں تو ایسی حدیث کا نام "حسن" قرار پاتا ہے۔

(۳) اگر راوی مشتبہ ہے یا نفس روایت میں کوئی بات شبہ کی ہے تو ایسی حدیث کا نام ضعیف کہا جاتا ہے۔

(۴) اگر راوی نے قول رسول کے الفاظ کے بجائے کہیں کہیں خود اپنے الفاظ استعمال کئے ہیں تو ایسی حدیث کو "مدرج" کہتے ہیں۔

(۵) اگر راوی صرف ایک ہے اور اس کی روایت ضعیف سمجھی جاتی ہے تو ایسی حدیث کو "متروک" کہتے ہیں۔

(۶) اور اگر روایت بہ لحاظ روایت و مفہوم بالکل غلط مانی جاتی ہے تو اس کا اصطلاحی نام موضوع ہے۔

پھر چونکہ احادیث میں صرف رسول ہی کے اقوال و افعال سے بحث نہیں کی جاتی بلکہ صحابہ و تابعین کے حالات و اقوال کی

روایت کو بھی حدیث کہتے ہیں اس لئے ایک تقسیم اور ہوئی یعنی :-

(۱) اگر کسی حدیث میں رسول اللہ کا ذکر ہے تو اسے مرفوع کہتے ہیں۔

(۲) اگر صحابہ کے اقوال و افعال کا ذکر ہے تو اس کا نام موقوف ہوگا۔

(۳) اگر تابعین کے اقوال و افعال بیان کئے گئے ہیں تو اسے مقطوع کہتے ہیں۔

اسناد کے لحاظ سے ایک اور تقسیم احادیث کی کی جاتی ہے :-

(۱) اگر روایت کا نہایت معتبر و غیر منقطع سلسلہ کسی صحابی تک پہونچتا ہے تو اُسے مسند کہتے ہیں۔

(۲) اگر راویوں کا سلسلہ اس طرح کا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے قسم و حلف کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ مارکر روایت بیان کی ہے تو ایسی حدیث کو مسلسل کہتے ہیں۔ (مسلسل الحلف اور مسلسل الید)

(۳) اگر اسناد مکمل بھی ہیں اور مختصر بھی یعنی آخری راوی اور اول راوی کے درمیان بہت کم واسطے ہیں تو ایسی حدیث کو عالی کہتے ہیں۔

(۴) اگر راویوں کا سلسلہ غیر منقطع ہے تو ایسی حدیث کو متصل کہتے ہیں۔

(۵) اگر یہ سلسلہ بیچ سے ٹوٹ گیا۔ یعنی تابعین کے سلسلہ کا کوئی راوی نہیں ہے تو منقطع کہتے ہیں۔

(۶) اگر کوئی بات رسول اللہ کے متعلق کسی تابعی نے بیان کی ہے اور اسے نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ کس صحابی سے اس نے سنا ہے تو ایسی حدیث کو مرسل کہتے ہیں۔

(۷) اگر کوئی حدیث ایسی ہے جو "عن فلاں" و "عن فلاں" سے بیان کی گئی ہے یعنی صرف سماعی اسناد ہے تو اسے "معنعن" کہتے ہیں۔

(۸) اگر کسی حدیث میں کوئی راوی غیر متعین ہے تو اسے مبہم کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور تقسیم باعتبار طریقِ روایت بھی کی گئی یعنی ایک ہی روایت کتنے لوگوں نے علٰحدہ علٰحدہ بیان کی ہے پھر

(۱) اگر کوئی حدیث علٰحدہ علٰحدہ بہت سے لوگوں نے بیان کی ہے اور وہ سب ثقہ اور معتبر ہیں تو اُسے متواتر کہتے ہیں۔

(۲) اگر کم از کم تین معتبر طبقے کے راویوں نے اسے بیان کیا ہے تو مشہور کہتے ہیں۔

(۳) اگر علٰحدہ علٰحدہ راویوں نے روایت کی ہے تو اسے عزیز کہتے ہیں۔

(۴) اگر ایک ہی راوی ہے تو آحاد کہتے ہیں۔

(۵) اگر صرف ایک تابعی نے روایت کی ہے تو غریب مطلق کہتے ہیں۔

ہر چند یہ تمام تقسیمیں جو بیان کی گئی ہیں ان پر تمام علماء کا اتفاق نہیں ہے اور مفہوم کے لحاظ سے ائمہ فن باہم دگر مختلف ہیں لیکن ہمارا مقصود اس اظہار سے صرف یہ بتانا ہے کہ احادیث کی چھان بین میں کتنی کاوش سے کام لیا گیا اور رسول اللہ کے اقوال و افعال کا صحیح علم حاصل کرنے کے لئے کس قدر بلیغ کوششیں صرف کی گئیں۔

اول اول دستور تھا کہ احادیث زبانی روایت سے حاصل کی جاتی تھیں، یعنی اگر معلوم ہو جاتا تھا کہ کسی شخص کو کسی حدیث کا علم ہے تو شائقین اس کے پاس جاتے تھے اور اس سے سُن کر یاد کر لیتے تھے یا یہ ہوتا تھا کہ راوی کسی حدیث کو بیان کرتا تھا اور

لوگ اسے لکھ لیتے تھے اور دوبارہ اس کو سنا کر اگر کوئی غلطی ہوتی تو صحت کر لیتے تھے اور راوی اس کی شرح بھی بیان کر دیتا اس طرح رفتہ رفتہ زبانی روایت کا دستور بند ہو گیا اور تحریری روایت کا رواج قایم ہو گیا۔

جمع حدیث کی اول اول یہ صورت تھی کہ راوتی یا رجال کے لحاظ سے اُن کی ترتیب قایم کی گئی اور ایسے مجموعہ کو مسند کہتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں "مسند احمد بن حنبل" خاص شہرت رکھتا ہے، لیکن بعد کو متن کے مفہوم کے لحاظ سے ترتیب قایم کی گئی اور ایسے مجموعوں کا نام "مصنف" قرار پایا اس کے مجموعوں میں بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ خاص مرتبہ کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ علی الخصوص بخاری و مسلم جو صحیحین کے نام سے موسوم ہیں کہ اگر کوئی ایک بھی روایت ان دونوں میں پائی جائے تو پھر اس سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کی جاتی۔ حضرات شیعہ کے نزدیک صرف وہ روایات قابل اعتبار ہیں جو جناب علی یا ان کے تبعین کی وساطت سے پہونچی ہیں، چنانچہ اس اصول کے لحاظ سے حسب ذیل پانچ کتابیں ان کے یہاں مرتب ہوئی ہیں۔

(۱) الکافی محمد بن یعقوب الکلینی۔ (۲) من لا یستحضرہ الفقیہہ محمد بن علی بابویہ القمی کی۔ (۳) تہذیب الاحکام۔ (۴) الاستبصار فی ما اختلف فیہہ الاخبار، محمد الطوسی کی۔ (۵) نہج البلاغہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اقوال جناب علی کا مجموعہ ہے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اُس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کتب احادیث کی تدوین میں کتنی کاوش سے کام لیا گیا لیکن آپ حیران ہو جائیں گے یہ سُن کر کہ باوجود اس تمام حزم و احتیاط کے کتب احادیث کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں اور ان پر آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے متعدد وجوہ ہیں۔ تاریخی و سیاسی بھی اور نفسیاتی بھی۔

جس وقت آپ غور کریں گے کہ روایت حدیث کی ابتدا کب سے ہوئی تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ زمانہ وہ تھا جب رسول اللہ کی وفات کے بعد اسلام کا دائرۂ اثر وسیع ہوتا جا رہا تھا اور اس کی سلطنت و حکومت پھیلتی جا رہی تھی۔ مسیحی مذہب کے پیرو، موسوی مسلک کے متبعین، فلسفۂ یونان کے ماننے والے، ایران کے آتش پرست اور بودھ مذہب کے تارک الدنیا لوگ، سبھی سے مسلمانوں کو واسطہ پڑ رہا تھا اور ان سب کے تمدن و اخلاق، مذہب و اعتقاد کے مقابلہ میں ان کو اسلام کا مطالعہ کرنا اور شریعت اسلامی کا منضبط کرنا ضروری تھا، پھر ظاہر ہے کہ انھیں بات بات میں غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہوگی کہ رسول اللہ کا فلاں امر میں کیا طرز عمل تھا۔ کیا ہدایت فرمائی تھی اور یہی وہ چیز تھی جس نے روایت احادیث کی بنیاد ڈالی۔ پھر چونکہ رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی لوگوں میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا اور ہر جماعت اپنی ہی تائید میں رسول کی حدیث پیش کرنا پسند کرتی تھی اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد ہی روایت حدیث و وضع حدیث کی بنیاد پڑ گئی تھی، کیونکہ جب دو مخالف جماعتوں میں سے ہر ایک اپنی موافقت میں حدیث پیش کرے گا تو ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک ضرور جھوٹی ہوگی اگر دونوں نہ ہوں۔

پھر صحابہ کے بعد جب عہد بنی امیہ و بنی عباس میں مصالح سیاسی کے لحاظ سے ہر ایک جماعت کو اپنی تائید میں بہت زیادہ ضرورت احادیث کی پڑی تو اس وقت مستقل ٹکسالیں وضع حدیث کی قایم ہو گئیں اور حکومت کے اثر اور روپیہ کی مدد سے جس امیر و خلیفہ نے جس قسم کی حدیث چاہی فوراً ڈھلوالی۔ چنانچہ کتب تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ خود امراء کے پاس جا جا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کسی حدیث کی ضرورت ہو تو مہیا کر دی جائے۔

اسی کے ساتھ چونکہ حدیث روایت کرنے والوں کی سوسائٹی میں بہت عزت کی جاتی تھی اسی لئے لوگوں میں بالطبع یوں بھی اس طرف رغبت پیدا ہوئی۔

اسی سلسلہ میں نفسِ روایت کی اہمیت پر بھی غور کرنا ضروری ہے یعنی جو احادیث روایت کی گئی ہیں وہ بالفاظِ رسول روایت ہوئی ہیں یا صرف مفہوم لے لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتب احادیث کی تدوین رسول اللہ کے کم از کم دو سو سال بعد شروع ہوئی ہے اور یہ امر کسی طرح قرینِ عقل و قیاس نہیں کہ اتنے زمانہ کے بعد درجنوں راویوں کے ذریعہ سے جو روایتیں فراہم کی گئی ہیں ان کا مفہوم بھی وہی باقی رہا ہوگا جو رسول اللہ کا مقصود تھا، چہ جائیکہ الفاظِ نبوی۔

ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ ایک ہی بات مختلف لوگوں کی زبان سے نکل کر نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتی ہے اور ہر راوی اپنی عقل آرائی سے کام لے کر اصل مفہوم میں ضرور کچھ نہ کچھ تصرف کر دیتا ہے۔

غور فرمائیے کہ رسول اللہ چار آدمیوں کے سامنے کسی وقت کوئی بات ارشاد فرماتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ اس کا ایک مفہوم قرار دے کر اس کی روایت کرتا ہے، پھر کیا یہ ممکن ہے کہ سب کے سب ایک ہی مفہوم پر متفق ہوں یا سب نے رسول اللہ کا حقیقی مدعا معلوم کر لیا ہو یا آپ کے الفاظ یاد رکھے ہوں۔

پھر اسی کے ساتھ جس وقت اس امر پر غور کیا جائے کہ اس وقت رسول اللہ کا لب و لہجہ کیا تھا، کس سلسلۂ سخن میں کیا بات ارشاد ہوئی تھی، آپ کا روئے سخن کس طرف تھا تو یہ اُلجھنیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں اور کسی حدیث کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رسول اللہ ہی کا ارشاد ہے۔ یہی سبب تھا کہ متقدمین صحابہ میں بعض سرے سے روایت حدیث ہی کو پسند نہ کرتے تھے اور بعض محدثین نے روایت بالمعنی کو کبھی جائز قرار نہیں دیا۔ لیکن ضرورتِ زمانہ نہ روایت احادیث سے لوگوں کو باز رکھ سکی اور نہ روایت بالمعنی کی روک تھام ہو سکی۔

رسول اللہ کے بعد تاریخ اسلام میں جتنی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں، آپ کی آنکھ بند ہوتے ہی خلافت کے مسئلہ میں دو گروہ پیدا ہو گئے اور ہر چند بظاہر ان میں کوئی تصادم تو نہیں ہوا لیکن اصول دونوں کے علیحدہ تھے۔ خلیفہ اول کے بعد جب خلیفہ دوم کے انتخاب کا وقت آیا تو اس اختلاف میں زیادہ قوت پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ خلیفہ ثالث کے زمانہ میں یہ پوری طرح نمایاں ہو گیا اور خلیفۂ چہارم کے عہد میں کھلم کھلا ٹھن گئی۔ پھر غور فرمائیے کہ جب اتنی مختلف جماعتیں موجود ہوں اور علویئین و خوارج، امویئین و عباسیئین وغیرہ کے متصادم اغراض نے شیرازہ کو درہم برہم کر رکھا ہو، اور ایک ہی سرزمین کے باشندے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں تو ایسے زمانہ میں احادیث کی روایت کیا اہمیت رکھ سکتی ہے جبکہ ہر ایک اپنی موافقت میں احادیث ہی کو پیش کرتا تھا۔

اسلام میں نماز سے زیادہ اہم عبادت کوئی نہیں جسے رسول اللہ روزانہ متعدد بار ادا کرتے تھے لیکن انھیں اختلاف رُوات کی وجہ سے آج ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ رسول اللہ دن رات میں کتنی بار نماز پڑھتے تھے۔ کوئی کہتا ہے کہ آپ ہاتھ کھول کر ادا کرتے تھے اور کوئی ہاتھ باندھ کر ادا کرنے کا قائل ہے، کوئی رفع یدین کرتا ہے کوئی نہیں۔ کوئی آمین بالجہر کا مؤید ہے، کوئی مخالف۔ پھر جب نماز ایسی اہم چیز کا صحیح حال انھیں اختلاف احادیث کی وجہ سے نہ معلوم ہو سکا تو اور دوسری باتوں کا کیا ذکر۔

آپ صحیحین کو اُٹھا کر دیکھئے جو سُنیوں میں نہایت اہم کتابیں حدیث کی سمجھی جاتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اہم ترین مسائل میں بھی باہمدگر متعارض و مخالف احادیث ان میں پائی جاتی ہیں، چہ جائیکہ فروعی مسائل کہ اگر ان میں کوئی شخص احادیث کی پابندی کرے تو ایک ہی وقت میں کافر و مسلمان دونوں ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امام بخاری وغیرہ نے وہی احادیث جمع کی ہیں جو ان کے اعتقاد و یقین کے مطابق صحیح تھیں اور یہ بھی درست ہے کہ انھوں نے کافی تحقیق و تنقید سے کام لیا۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ اب اس میں چون و چرا کی گنجایش نہیں ہے، اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب یہ مان لیا جائے کہ جتنی عقل و فراست تھی وہ سب بخاری پر ختم ہوگئی اور ان کے بعد کوئی صاحب عقل پیدا ہی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے لیکن اگر یہ تسلیم کرنا بجائے خود عقل کے منافی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آج بھی کتب احادیث تنقید کا محل نہ قرار پائیں اور آنکھ بند کر کے ان کو تسلیم کر لیا جائے خواہ وہ کتنی ہی معارض، کتنی ہی خلاف عقل اور کتنی ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہوں۔

روایت کے ساتھ ساتھ ائمۂ فن نے چند اصول درایت بھی مقرر کر دئے ہیں، چنانچہ شاہ عبد العزیز صاحب نے عجالۂ نافعہ میں جن اصول درایت کا ذکر کیا ہے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ :-

(۱) اگر کوئی روایت تاریخ مشہور کے خلاف ہو تو صحیح نہیں۔

(۲) اگر وقت و حال کا قرینہ اس کے خلاف ہو تو بھی باور نہ کرنا چاہئے۔

(۳) اگر مقتضائے عقل و شرع کے خلاف ہو تو بھی ایسی حدیث قابل اعتبار نہیں۔

(۴) اگر کوئی بات ایسی بیان کی جائے جو رسول اللہ کے اخلاق کے منافی ہے تو بھی رد کر دینا چاہئے۔

اسی طرح امام بخاری نے ابن جوزی سے جو اصول درایت بیان کئے ہیں وہ بھی قریب قریب اسی کے ہیں لیکن آپ کتب احادیث کو اُٹھا کر دیکھئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ ان میں کتنی حدیثیں اصول درایت کے معیار پر ٹھیک اُترتی ہیں، شاید ہزار میں دس بیس۔

اگر احادیث کی تقسیم ان کے مطالب کے لحاظ سے کی جائے تو حسب ذیل بڑی بڑی تقسیمیں ہو سکتی ہیں :-

(۱) تعلیم عقاید و عبادات و اخلاق۔

(۲) پیشین گوئیاں اور قصص و حکایات۔

(۳) احکام شریعت یا معاشری قانون۔

(۴) مابعد الطبیعیات (یعنی حیات بعد الموت اور دوزخ و جنت، عذاب و ثواب وغیرہ وغیرہ)

ظاہر ہے کہ ان ابواب میں سب سے زیادہ محفوظ و ناقابل اعتراض باب اگر ہو سکتا ہے تو پہلا لیکن افسوس ہے کہ وہ بھی اپنی جزئیات میں اختلافات سے خالی نہیں اور روایتاً و درایتاً اس پر بھی گفتگو ہو سکتی ہے۔

دوسرا باب بالکل اسرائیلی روایات سے بھرا ہوا ہے اور چونکہ عیسوی و موسوی مذہب کے اثرات رسول اللہ کے بعد بھی بہت کچھ باقی تھے اس لئے لوگوں نے ان مذاہب کی روایتوں کو نقل کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا اور اُن کی توثیق کے لئے ان روایتوں کو رسول اللہ سے منسوب کر دیا۔ پیشین گوئیوں کی حدیثیں جتنی ہیں وہ سب ناقابل اعتبار ہیں کیونکہ ہر زمانہ میں ہر شخص نے اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے ایسی حدیثیں گھڑ کر مطلب برآری کرنا چاہی ہے۔

احکام شریعت کے متعلق بھی احادیث میں بکثرت اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اور اسی لئے اسلام کی فقہ میں کئی اسکول ہوگئے پھر چونکہ ہر اسکول اپنی تائید میں احادیث ہی پیش کرتا ہے اس لئے لامحالہ ان سب کو موضوع قرار دیا جائے گا، کیونکہ اب یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ واقعی رسول اللہ نے کیا ارشاد فرمایا تھا۔

وہ احادیث جو مابعد الطبیعیات سے متعلق ہیں وہ بھی یکسر موضوع ہیں اور اسلام میں جو غیر مذاہب کے عناصر شامل ہوگئے۔

ان کے زیر اثر یہ سب کچھ بعد کو بڑھایا گیا ہے کیونکہ اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اُس سے مختلف نہیں ہے جو مذاہب قدیمہ کے خرافیات میں پایا جاتا ہے۔

ان حالات کے تحت اب سوا اس کے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو تمام کتب احادیث کو سامنے رکھ کر از سر نو جدید معیار تنقید کے لحاظ سے پوری طرح ریسرچ کیا جائے اور واقعی جو احادیث رسول کی ہوں انھیں متعین کرکے باقی کو نظرانداز کر دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہیں ہے (اور یقیناً ممکن نہیں ہے کیونکہ ہمارے یہاں کے علماء کو نہ اس کا سلیقہ ہے نہ ضرورت) تو پھر محفوظ صورت یہ ہے کہ اسلام و اصول اسلام کا مطالعہ احادیث سے بالکل علٰحدہ ہو کر کیا جائے۔

کسی قول یا فعل کو رسول اللہؐ سے منسوب کر دینا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں امام بخاری وغیرہ تو اس کو بیباکانہ انجام دے سکتے تھے جب عقول انسانی زیادہ ترقی یافتہ نہ تھیں اور مذہب کے مفہوم سے قدامت پرستی وتوہم پرستی جدا نہ ہوئی تھی، لیکن آج اس زمانہ میں جبکہ علوم و فنون کی ترقی نے قدرت کے ہزاروں چھپے ہوئے راز بے نقاب کر دیئے ہیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوہ قاف کے متعلق رسول اللہؐ کی یہ حدیث باور کر لی جائے، کہ وہ ایک زمرد کا پہاڑ ہے، جس کے انعکاس سے آسمان نیلگوں نظر آتا ہے اور جس کے چاروں طرف فرشتے زنجیریں ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں' اور جب زنجیریں کھینچتے ہیں تو زلزلہ آجاتا ہے۔

پھر چونکہ کتب احادیث اسی قسم کی خلاف عقل باتوں سے بھری پڑی ہیں اس لئے اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو انھیں رسول اللہؐ سے منسوب کرکے رسول اللہؐ کی توہین کیجئے یا احادیث سے قطع نظر کرکے منکر بخاری ہونے کا الزام گوارا فرمایئے، میں چونکہ رسول اللہؐ کی ذات گرامی کو بخاری وغیرہ سے ارفع سمجھتا ہوں اس لئے ظاہر ہے کہ میں احادیث کا قایل کیونکر ہو سکتا ہوں۔

یہاں تک تو میں نے اصولی گفتگو کی ہے، لیکن اس سلسلہ میں وضع احادیث کی چند مثالیں پیش کرنا بھی ضروری ہے تاکہ قارئین نگار خود فیصلہ کر سکیں کہ اگر میں مجموعۂ احادیث کو خارزار سے تعبیر کرتا ہوں تو میرا یہ کہنا غلط ہے یا صحیح۔

ا — ابوہریرہ کی ایک روایت ملاحظہ ہو جو مسلم و بخاری میں درج ہے:-

"رسول اللہؐ نے فرمایا کہ عورت مرد کی پسلی کی ہڈی سے پیدا ہوئی ہے، وہ کبھی سیدھی چال نہ چلے گی، پھر تو اس سے جو کام چاہے لے، لیکن وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے گی اور اگر تو نے اسے سیدھا کرنا چاہا تو اسے توڑ ڈالے گا اور اس کا توڑنا طلاق ہے"۔

یہ حدیث بائبل کی روایت کو سامنے رکھ کر وضع کر دی گئی اور اس کا مطلق خیال نہ کیا گیا کہ رسول اللہؐ جو عورتوں کے ساتھ نہایت رحمدلانہ سلوک کی تاکید فرماتے تھے، کبھی ایسا نہیں فرما سکتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک اور حدیث ملاحظہ ہو جو محاصرۂ قسطنطنیہ سے تعلق رکھتی ہے۔

۲ — جب مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو عساکر اسلامی کچھ مایوس ہو چلی تھی اور ان کی ہمت پست ہوتی جارہی تھی۔ لشکر کے ساتھ ابوہریرہ بھی تھے انھوں نے اسی وقت مسلمانوں کی ہمت بڑھانے کے لئے یہ حدیث پیش کر دی:-

"فرمایا رسول اللہؐ نے صحابہ سے کہ تم نے سنا ہے ایسا شہر جس کے ایک جانب خشکی ہے اور ایک جانب سمندر۔ انھوں نے کہا ہم نے سنا ہے۔ پھر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ قیامت قایم نہ ہوگی، یہاں تک کہ لوگ لڑیں گے ہزار بنی اسحاق سے

(قیاصرۂ قسطنطنیہ کو اسحاق کے نام سے پکارتے تھے) اور جب اس شہر کے پاس آئیں گے، سو نہ ہتھیار سے لڑیں گے نہ تیر چلائیں گے بلکہ "لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر" کہیں گے اور دریا کی طرف کی دیوار گر پڑے گی، دوسری بار یہی کلمہ کہیں گے تو دوسری طرف کی دیوار گر پڑے گی اور تیسری بار اس کلمہ کا نعرہ لگانے پر شہر ہر طرف سے کھل جائے گا، سو اس شہر میں گھس پڑیں گے اور لوٹیں گے لوٹ کا مال" (مسلم)

اس قسم کی موضوع احادیث کا واقعات تاریخی پر بھی بڑا اثر پڑتا ہے اور اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی بربنائے عقیدت غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، چنانچہ سید سلیمان ندوی (مرحوم) اپنی "سیرۃ نبوی" میں فتح ہندوستان کے متعلق ابوہریرہ کی روایت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:- "یہ حدیث نسائی نے اس وقت نقل کی تھی جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ بھی نہ کیا تھا اور اس لئے یہ ایک پیشین گوئی تھی جو حرف بہ حرف صحیح نکلی"۔ حیرت ہے کہ سید سلیمان جیسا باخبر شخص یہ کہے۔ یہ حدیث اس وقت وضع کی گئی تھی جب محمد قاسم نے ہندوستان پر فوجکشی کی تھی، یہ زمانہ حجاج کا تھا، جب ابوہریرہ بھی موجود تھے اور مجاہدین کی ہمت افزائی کے لئے یہ حدیث انھوں نے وضع کی تھی محمود غزنوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۳ – حضرت عثمان کے زمانہ میں جب عساکر اسلامی مغلوں اور ترکوں سے جنگ کر رہے تھے تو ابوہریرہ نے اس وقت بھی آثار قیامت کا ذکر کرتے ہوئے ایک حدیث مسلمانوں کی ہمت بڑھانے کے لئے پیش کی تھی:-

"رسول اللہ نے فرمایا، قیامت قایم نہ ہوگی جب تک کہ تم لڑتے رہو گے ایسے لوگوں سے جن کے چہرے ڈھالوں جیسے چپٹے ہوں گے اور جن کے جوتے بالوں کے ہوں گے"۔

آثار قیامت کے سلسلہ میں دجال اور عیسیٰ کے ظہور کے متعلق بھی ابوہریرہ نے رسول اللہ کی متعدد لغو احادیث نقل کی ہیں اور ہمارے اعجوبہ پرست علماء کو ان کی صحت سے انکار کی جرأت نہیں ہوتی محض اس لئے کہ ان کے راوی ابوہریرہ ہیں اور مسلم و بخاری نے انھیں نقل کیا ہے۔

واضح ہو کہ ابوہریرہ نے جتنی احادیث روایت کی ہیں ان کی تعداد پانچ ہزار سے کسی طرح کم نہیں ہے، حالانکہ رسول اللہ جم کر مدینہ میں ایک ماہ بھی قیام نہ کر سکے اور ساڑھے تین سال کا زمانہ جنگ ہی میں بسر ہوا، لیکن باوجود اس کے ابوہریرہ نے ہزاروں احادیث رسول اللہ کی سن لیں اور انھیں یاد بھی رکھا۔ کس قدر عجیب بات ہے۔

پھر یہ بات آج ہمیں کو نہیں کھٹکتی، بلکہ خود عہد نبوی میں بھی دوسرے صحابہ ان کے متعلق یہی خیال کرتے تھے کہ وہ وضع احادیث کے بڑے مشاق ہیں۔

۴ – چنانچہ ایک بار جب ابوہریرہ نے یہ حدیث بیان کی کہ "جو شخص کسی کے جنازہ میں شریک ہوتا ہے تو اس کو ایک قیراط کا ثواب ملتا ہے اور قیراط کا وزن اُحد پہاڑ کے برابر ہے" تو ابن عمر نے کہا کہ "ابوہریرہ کو حدیث بنانے کی عادت ہے"۔ اور حضرت عمر نے تو ایکبار ان کو ایک حدیث کی روایت پر زد و کوب بھی کی تھی۔

۵ – کعب احبار، جو اسرائیلی مزخرفات کی روایتیں بیان کرنے میں خاص ملکہ رکھتے تھے وہ بھی ابوہریرہ کی حدیثوں سے گھبرا جاتے تھے، ایک بار ابوہریرہ نے یہ روایت بیان کی کہ:-

"رسول اللہ نے فرمایا، بنی اسرائیل کا ایک گروہ گم ہو گیا تھا، معلوم ہوتا ہے وہ لوگ سب چوہے بن گئے۔ کیا تم نہیں دیکھتے

کہ جب چوہوں کو اونٹ کا دودھ دیا جاتا ہے تو نہیں پیتے اور بکری کا دودھ پی لیتے ہیں۔" (مسلم)

کعب احبار نے ازراہِ تعجب ابوہریرہ سے پوچھا "کیا واقعی تم نے رسول اللہ کو ایسا کہتے سنا تھا"۔ اور انھوں نے بار بار اس کی تصدیق کی۔

اس حدیث کے پڑھنے کے بعد ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ اُس وقت عرب میں جتنے چوہے پائے جاتے تھے وہ سب مسخ شدہ بنی اسرائیل کی اولاد تھے۔ پھر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ کی زبان سے ایسی لغو بات نکلی ہو۔

چند اور احادیث ملاحظہ فرمائیے:-

۶ — "رسول اللہ نے فرمایا جب مرد عورت کے چاروں کونوں پر بیٹھے، پھر لگے اس سے —— تو غسل واجب ہوگیا مرد پر"
(مسلم، ابن ماجہ، بخاری، داؤد)

۷ — "رسول اللہ نے فرمایا شیطان جب اذان سنتا ہے تو بھاگتا ہے پادتا ہوا تاکہ اذان کی آواز نہ سنائی دے"۔ (مسلم، بخاری)

۸ — "جب تم پاخانے کے لئے بیٹھو تو آڑ کرو، کیونکہ شیطان ابن آدم کے...... سے کھیلتا رہتا ہے" (مسلم، بخاری)

ایک طرف رسول اللہ کی فطری تہذیب و شائستگی کو سامنے رکھئے، دوسری طرف ان احادیث کے الفاظ کو اور حیرت کیجئے ان احادیث کی راویوں پر اور سر دھنئے بخاری و مسلم پر!

اسرائیلیات کے سلسلہ کی روایات ملاحظہ کیجئے تو آپ کو اور زیادہ حیرت ہوگی کہ راویانِ احادیث نے کس کس طرح اسلام کے چہرہ کو داغدار کیا ہے۔

رسول اللہ کے عہد سے قبل ہی عربوں کا ذہن بائبل اور تالمود کی روایتوں سے کافی متاثر تھا اور بعثت نبوی کے بعد بھی یہ سلسلہ باقی رہا اور مسلم راویانِ حدیث بھی جن میں ابوہریرہ اور کعب احبار خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں، ان روایات کو رسول اللہ سے منسوب کر کے انھیں واہمہ پرست ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہیں اٹھا رکھا۔ مثلاً چند روایات ملاحظہ ہوں:-

۹ — "رسول اللہ نے فرمایا اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر کی خیانت نہ کرتی"۔ (مسلم، بخاری)

۱۰ — "حضرت سلیمان کی ۶۰ بیویاں تھیں۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک رات میں سب کے پاس ہو آؤں گا اور سب کے بیٹا رہ جائیگا لیکن کوئی حاملہ نہ ہوئی۔ رسول اللہ نے فرمایا اگر حضرت سلیمان "انشاء اللہ" کہہ دیتے تو ہر عورت لڑکا جنتی"

بائبل میں سلیمان کی ۷۰۰ بیویاں اور ۳۰۰ کنیزیں ظاہر کی گئی ہیں اور باقی قصہ وہی ہے۔ پھر کون ہے جو یقین کرے گا کہ رسول اللہ ایسی لغو و فحش بات کہہ سکتے تھے۔

۱۱ — "فرمایا رسول اللہ نے کہ خدا نے ہفتہ کے دن مٹی کو پیدا کیا، اتوار کے دن اس کے پہاڑوں کو، پیر کے دن درختوں کو، کام کاج کی چیزیں منگل کو پیدا کیں، نور بدھ کو پیدا کیا، جمعرات کے دن جانور پھیلائے زمین پر اور جمعہ کو بعد عصر حضرت آدم کو پیدا کیا"۔ (مسلم، بخاری)

بائبل میں بھی اسی قسم کی روایت پائی جاتی ہے جس میں ابوہریرہ نے اختراع سے کام لے کر سنیچر کے دن بھی اللہ کو آرام لینے نہ دیا، حالانکہ بائبل کی رو سے یہ دن آرام کا تھا۔

ابوہریرہ حدیثیں گھڑنے کے اس درجہ شایق تھے کہ جب یہودی اور مسیحی روایتیں ختم ہوگئیں تو انھوں نے خود اپنی قوت اختراع سے

کام لے کر بعض ایسی باتیں رسول اللہ سے منسوب کر دیں کہ ان کا ذکر کرتے بھی شرم محسوس ہوتی ہے، لیکن چونکہ یہ احادیث بخاری و مسلم میں درج ہیں اس لئے کوئی مسلمان یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ انھیں غلط کہدے، خواہ ان سے رسول اللہ کی کتنی ہی توہین کیوں نہ ہوتی ہو ملاحظہ ہوں اس قسم کے چند نوادر احادیث :-

۱۲- "رسول اللہ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل ننگے نہایا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھتے رہتے تھے، لیکن حضرت موسیٰ خلوت میں نہاتے - لوگوں نے کہا کہ موسیٰ ہمارے ساتھ اس لئے نہیں نہاتے کہ انھیں فتق کا عارضہ ہے - ایک دن موسیٰ نہا رہے تھے کہ پتھر ان کے کپڑے لے کر بھاگا - موسیٰ اس کے پیچھے دوڑے - کہتے جاتے تھے اے پتھر میرے کپڑے دیدے، یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے ان کی شرم گاہ کو دیکھ لیا اور کہا خدا کی قسم ان کو تو کوئی بیماری نہیں ہے، حضرت موسیٰ نے اپنے کپڑے لئے اور پتھر کو مارنا شروع کیا"

یہ بات اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ابوہریرہ اس میں ایک اضافہ اور فرماتے ہیں وہ یہ کہ "قسم خدا کی اس پتھر پر چھ یا سات نشان ہیں حضرت موسیٰ کی مار کے" (مسلم، بخاری)

۱۳- "فرمایا رسول اللہ نے کہ جب موت کا فرشتہ حضرت موسیٰ کے پاس آیا تو آپ نے ایک تھپڑ رسید کیا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی وہ لوٹ کر خدا کے پاس گیا اور عرض کی کہ تو نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا جو موت نہیں چاہتا - اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھ درست کر دی اور فرمایا اُس بندے سے کہدے کہ تو اپنا ہاتھ ایک بیل کی پیٹھ پر رکھ اور ہاتھ تلے جتنے بال آئیں اتنے برس کی عمر تم کو ملے گی - حضرت موسیٰ نے کہا اے پروردگار پھر اس کے بعد کیا ہوگا، جواب ملا کہ پھر مرنا ہے - حضرت موسیٰ نے کہا تو پھر ابھی سہی - انھوں نے دُعا کی یارب مجھے پاک زمین کے نزدیک کر دے ایک پتھر کی مار برابر - رسول اللہ نے کہا اگر میں ہوتا تو تم کو حضرت موسیٰ کی قبر دکھا دیتا، راستہ کی طرف سُرخ دھاریدار ریت کے پاس" (مسلم، بخاری)

اس حدیث کو اگر صحیح باور کر لیا جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس وقت دُنیا کا احمق ترین انسان بھی رسول اللہ کی رسالت کا قایل نہیں ہو سکتا۔

۱۴- "رسول اللہ نے فرمایا، خدا نے حضرت آدم کو اپنی صورت پر بنایا، ان کا قد ۶۰ ہاتھ لمبا تھا، جب ان کو بنا چکا تو فرمایا جا اور فرشتوں کو سلام کر اور وہاں کئی فرشتے بیٹھے ہوئے تھے اور سُن وہ کیا جواب دیتے ہیں - حضرت آدم گئے اور کہا السلام علیکم، فرشتوں نے جواب دیا وعلیکم السلام - تو جو کوئی بہشت میں جائے گا وہ آدم کی صورت کا ہوگا ساٹھ ہاتھ لمبا - پھر ان کے بعد لوگوں کے قد گھٹتے گئے" (مسلم، بخاری)

اس حدیث کو صحیح ماننے کے بعد خدا کو بھی مجسم ماننا پڑے گا - رہا انسان کے قد کا آہستہ آہستہ گھٹنا سو اس کی تردید اس سے ہوتی ہے کہ اب سے ہزاروں سال قبل کے جو ڈھانچے زمین سے برآمد ہوئے ہیں ان کا قد بھی چھ سات فٹ سے زیادہ نہیں۔

چند اور خرافیات ملاحظہ فرمائیے :-

۱۵- "جب ایماندار کی روح نکلتی ہے تو اس کے آگے دو فرشتے ہوتے ہیں اور اس میں مشک کی سی خوشبو ہوتی ہے - جب کافر کی روح نکلتی ہے تو اس سے بدبو پیدا ہوتی ہے - ابوہریرہ نے کہا کہ رسول اللہ اس بدبو کا ذکر کرتے وقت ایک باریک کپڑا اپنی ناک پر

ڈال لیا" (مسلم)

۱۶- "ہم رسول اللہ کے ساتھ تھے کہ دفعتاً ایک دھماکے کی آواز آئی - آپ نے فرمایا تم جانتے ہو یہ کیا ہے - یہ ایک پتھر ہے جو جہنم میں پھینکا گیا ہے - ستر سال سے برابر گرتا چلا جا رہا تھا اور اب وہ جہنم کی تہ تک پہونچا ہے"۔ (مسلم)

۱۷- "رسول اللہ نے فرمایا قیامت کے دن کافر کا دانت کوہ اُحد کے برابر ہوگا اور اس کی کھال کی دبازت تین دن کی راہ ہوگی"۔ (مسلم)

۱۸- "رسول اللہ نے فرمایا شکایت کی دوزخ کی آگ نے کہ اے پروردگار کھا گیا میرا ایک ٹکڑا دوسرے کو تو خدا نے اجازت دی اس کو دو سانس کی ایک سانس جاڑے میں اور ایک گرمی میں، سو اسی وجہ سے تم پاتے ہو شدت گرمی اور سردی کی" (مسلم، بخاری)

یہ ہیں چند ان ہزاروں حدیثوں میں سے جنھیں کوئی صاحبِ عقل رسول اللہ سے منسوب نہیں کر سکتا، لیکن ہمارے علماء کی وہم پرستی اور حماقت کا یہ عالم ہے کہ اگر ان احادیث کی صحت پر کوئی گفتگو کرے تو وہ اسے فوراً کافر و مشرک کہدیں گے، کیونکہ اصل اسلام ان کے نزدیک نہ قرآن ہے نہ سیرت رسول، بلکہ محض راویانِ احادیث اور مسلم و بخاری کے اوراق! حالانکہ اصول درایت کے لحاظ سے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ان میں کوئی حدیث قابل اعتنا نہیں ہے۔

مطالب کے لحاظ سے حدیثوں کی تقسیم کی جائے تو ایک حصہ وہ ہوگا جو تعلیم اخلاق اور احکام شریعت سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا پیش گوئیوں اور معجزات سے، تیسرا مسیحی و یہودی قصص و روایات سے اور چوتھا معاد و آخرت، ملائکہ، عذاب و ثواب اور بہشت و دوزخ سے

ان میں سوا ان حدیثوں کے جو تعلیم اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اور بے شک اپنی جگہ درست ہے بشرطیکہ ان میں کوئی بات ایسی نہ پائی جائے جو رسول اللہ کے اخلاقی مرتبت سے گری ہوئی ہو یا جن میں شدید عذاب و ثواب کا ذکر نہ ہو، باقی تمام احادیث محل نظر ہیں اور ان میں سے اکثر ساقط الاعتبار۔

اسی لئے میں نے ہمیشہ علماء کرام کو متوجہ کیا کہ وہ صرف قرآنی تعلیم کو سامنے رکھیں اور احادیث سے استناد نہ کریں، اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر از روئے اصول درایت تمام خس و خاشاک کو نکال کر ایک صحیح مجموعۂ احادیث مرتب کریں، لیکن ان کو "عمارتگری گنبدِ دستار" سے کہاں فرصت!

"شہوانیات"

(حضرت نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف)

اس کے چند نسخے باقی رہ گئے ہیں - قیمت مع محصول آٹھ روپیہ - منیجر نگار لکھنؤ

علماء کرام کا عجیب و غریب دینی نظریہ

نجات کے لئے اخلاق کی پاکیزگی ضروری نہیں

مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں، میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ دُنیا کے کسی مذہب نے اخلاق کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کو اتنا ضروری قرار نہیں دیا، جتنا اسلام نے ۔ یہاں تک کہ عبادات کا اصل مقصود ہی یہ قرار دیدیا گیا کہ انسان پاکیزگی خصایل اختیار کرے ۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ قرآن میں جہاں کہیں نماز یا دوسری عبادات کا ذکر آیا ہے، اسی کے ساتھ "عملوا الصالحات" کی بھی تاکید کردی گئی ہے، یعنی انسان کے اعمال و کردار اگر اچھے نہیں ہیں تو اس کی تمام عبادتیں بیکار ہیں اور وہ اپنے آپ کو صحیح معنے میں مسلمان نہیں کہہ سکتا ۔ گویا عمل نیک ہی عبادت کی جان ہے ۔

اس نتیجہ پر پہونچنے کے بعد قدرتاً یہ سوال میرے سامنے آیا کہ اگر کوئی مسلمان اپنے کردار کے لحاظ سے پست و دنی ہے تو کیا ہم اسے مسلمان سمجھ کر تمام انعامات خداوندی کا مستحق قرار دے سکتے ہیں اور اگر کوئی غیر مسلم بلند اخلاق کا ہے تو بھی ہم اسے مغفرت و نجات کا مستحق نہیں سمجھ سکتے محض اس لئے کہ وہ ظاہری شریعتِ اسلام کا پابند نہیں ۔

میں نے چاہا کہ اس مسئلہ میں علماء کرام کی رائیں حاصل کروں اور ایک استفتاء مرتب کرکے ۳۲ اکابر علماء اسلام کی خدمت میں روانہ کیا ۔

اس استفتاء کے جواب میں بارہ علماء نے پورے رسوخ و یقین کے ساتھ یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ "مسلمان جو چاہے کرے بہرحال ناجی ہے، بشرطیکہ ایمان پر اس کا خاتمہ ہو، اور بُت پرست کافر خواہ وہ کتنے ہی اچھے اخلاق کا ہو ناری ہے"۔

ایک ندوی مولانا نے فرمایا کہ دونوں ناری ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ مسلمان کے بخشے جانے کا امکان ہے اور غیر مسلم کے لئے اس کا کوئی امکان نہیں ۔

احمدی علماء نے کہا کہ اس مسئلہ میں "لب کشائی" نہیں کرسکتے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان دونوں میں کون ناری ہے اور کون ناجی ۔

ان تمام جوابات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محض اخلاق کی پاکیزگی نجات کے لئے ضروری نہیں اور ایک غیر مُسلم خواہ وہ کتنے ہی بلند کردار کا ہو بخشش و مغفرت کا مستحق نہیں ہوسکتا ۔

سب سے پہلے مجھے یہ ظاہر کردینا چاہئے کہ میں نے علماء کرام سے یہ استفسار انھیں کے مروجہ عقاید اسلام کے پیشِ نظر کیا تھا، ورنہ میرے نزدیک معاد و آخرت کا مفہوم دوسرا ہے ۔ اور میرا مقصود اس استفتاء سے یہ تھا کہ اس باب میں عام مروجہ عقاید کی تصدیق علماء کرام کے قلم سے بھی ہوجائے ۔ میں علماء کرام کے فتاویٰ سے جس نتیجہ پر پہونچا اس کی وضاحت کے لئے پہلے چند تنقیحات قایم

کر لینا ضروری ہے :-

(۱) مذہب کا مقصد صحیح کیا ہے ؟

(۲) اخلاق حسنہ کی غایت کیا ہو سکتی ہے ؟

(۳) ناری و ناجی ہونا کسے کہتے ہیں ؟

(۴) خدا اور مذہب کا باہمی تعلق کس قسم کا ہے ؟

تنقیح اول کے متعلق ساری دنیا کی متفقہ رائے یہی ہے کہ مذہب کا مقصد اصلاح اعمال، تزکیۂ اخلاق اور تصفیۂ نفس کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔

اسی طرح تنقیح دوم کے متعلق بھی یہی ایک رائے پائی جاتی ہے کہ اخلاق حسنہ کی غایت صرف یہ ہے کہ انسان دنیا کے نظام تمدن میں عضو مفید کی حیثیت اختیار کرکے دوسروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے، ابنائے جنس کے نظام عمرانی میں ایک فرد معاون ہوکر زندگی بسر کرے اور نفسی و ذاتی اغراض سے شیرازۂ اخوت عامہ کو درہم و برہم نہ ہونے دے ۔ چنانچہ یہی وہ اصل اصول تھا جس کی بناء پر شریعتیں مرتب ہوئیں، قوانین وضع کئے گئے اور اچھے برے افعال کی فہرست ترتیب دے کر گناہ و ثواب اور سزا و جزا کی تعیین کی گئی

تیسری تنقیح سب سے زیادہ اہم تنقیح ہے کیونکہ استفتاء میں یہی دریافت کیا گیا تھا اور اسی میں مجھے اکثر علماء سے اختلاف ہے، عام طور پر ناری و ناجی ہونے کا تعلق "حیات بعد الممات" سے سمجھا جاتا ہے یعنی جب انسان مرجائے گا تو جو اعمال دنیا میں اس نے کئے ہیں انکے لحاظ سے اس کو انعام و سزا یا بہشت و دوزخ ملے گی ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ عذاب و ثواب جسم کے ساتھ ہوگا اور دوزخ میں واقعی سانپ بچھو اور آگ کے شعلے ہوں گے اور جنت میں حقیقتاً حوریں، غلمان، باغ اور میوے وغیرہ ہوں گے، لیکن بعض کہتے ہیں کہ عذاب و ثواب روحانی ہوگا اور دوزخ و جنت کا بیان صرف تشبیہی و تمثیلی ہے، بہرحال وہ انعام و سزا جسمانی ہو یا روحانی نتیجہ ہے اعمال حسنہ یا افعال سیئہ کا جو اس دنیا میں انسان سے سرزد ہوتے ہیں ۔

اس وقت اس بحث میں نہ پڑوں گا کہ مرنے کے بعد سزا یا جزا کا مفہوم نتیجہ خیز و قابل یقین امر ہے یا نہیں بلکہ میں اس کو حرف حرف صحیح ماننے کے بعد یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ناری و ناجی ہونے کا تعلق علاوہ اعمال حسنہ کے کسی اور چیز سے ہے اور اگر ہے تو کیوں ؟

اس سے غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا کہ مذہب کا مقصود اصلی اخلاق حسنہ کی تعلیم ہے ۔ اس لئے اصولاً ناری و ناجی ہونے کا انحصار بھی صرف اخلاق انسانی پر ہونا چاہئے یعنی اگر کوئی شخص برا ہے تو ہم کہیں گے کہ وہ ناری ہے اور اچھا ہے تو حکم لگائیں گے کہ وہ ناجی ہے۔

اس لئے علماء کرام کا فاسق و فاجر مسلمان کے متعلق یہ حکم لگانا کہ بہرحال وہ ناجی ہے اور خوش اخلاق بت پرست کی نسبت [illegible] صادر کرنا کہ وہ کچھ کرے، نجات اس کی ممکن نہیں ۔ یقیناً متذکرہ بالا اصول سے علٰحدہ کسی اور اصول پر مبنی ہوگا پھر آیئے غور کریں وہ اصول کیا ہو سکتا ہے ؟

میں نے جہاں تک غور کیا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ علماء کرام نے مذہب اسلام اور اخلاق حسنہ کو علٰحدہ علٰحدہ دو چیز قرار دیا ہے اور ان کے درمیان جو نسبت پائی جاتی ہے وہ اس طرح ہے کہ ان دونوں کا اجتماع بھی ممکن ہے اور افتراق بھی یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک [illegible] مسلمان ہو لیکن اخلاق حسنہ نہ رکھتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی میں اخلاق حسنہ موجود ہوں اور وہ مسلمان نہ ہو یعنی اصل چیز ان کے نزدیک اخلاق انسانی نہیں بلکہ محض مسلمان ہونا ہے، خواہ اس کے اعمال کیسے ہی خراب کیوں نہ ہوں ؟

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر محض مسلمان ہونا ہی نجات کا ضامن ہے اور انسان کے اچھے اعمال کوئی چیز نہیں ہیں تو پھر اسلام کا مقصد کیا ہے اور اسلام کس چیز کا نام ہے۔

جن علماء کرام نے بدکار مسلمان کے ناجی ہونے اور نکوکار بت پرست کے ناری ہونے پر حکم لگایا ہے وہ گویا بالفاظ دیگر اس بات کے معتقد ہیں کہ محض خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اقرار کر لینا یا یوں کہئے کہ ان کی مقرر کی ہوئی ایمان مجمل و مفصل کی عبارت کو ایک اشلوک کی طرح پڑھ لینا کافی ہے اور کائنات میں انسان کا وجود صرف اس لئے ہے کہ وہ ان چند الفاظ کو یاد کرلے، کیونکہ خدا اور اس کی خدائی کائنات اور اس کا جملہ نظام عبارت ہے، انھیں دو سطروں کے حفظ کر لینے سے۔

اگر حقیقتاً اسلام یہی ہے اور اس کی تمام تعلیمات کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے تو ہم کو تنقیح چہارم کا پہلے فیصلہ کر لینا چاہیے کہ خدا اور مذہب کا باہمی تعلق کیا ہے یعنی خدا کو مذہب کی ضرورت ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا وہ ضرورت صرف ایک شخص کے اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے پوری ہو جاتی ہے۔

یہ مسئلہ میرے نزدیک زیادہ پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ خود انھیں علماء کرام کے اعتقاد کے موافق خدا کی ذات بے نیاز ہے اور وہ ہماری عبادت، ہماری نیایش بلکہ خود ہماری اور ساری کائنات کی ہستی کی طرف سے بالکل بے پروا ہے، نہ آفرینش سے اُس کی کوئی غرض وابستہ ہے نہ ہلاکت و فنا سے، اس نے اگر عالم کو پیدا کیا تو اس طمع و غرض سے نہیں کہ کوئی اس کا نام لے گا اور اگر وہ سب کو تباہ و برباد کردے تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا۔ اگر وہ ہمارے انسانی بادشاہوں اور رئیسوں کی طرح نہیں ہے تو نہ اس میں جذبۂ انتقام پایا جاتا ہے اور نہ جذبۂ استحسان، کوئی عمر بھر اگر اس کی عبادت کرے تو وہ اپنے اصول بدلنے والا نہیں اور اگر کوئی ہر وقت اسے بُرا کہے تو اس سے متاثر نہیں ہوتا' اس لئے اب سوال نہ اصطلاحی عبادت کا رہا نہ اصطلاحی کفر کا اور اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہماری عبادت اگر کسی غرض سے وابستہ ہو سکتی ہیں تو ان کا تعلق خدا سے نہیں بلکہ خود ہماری فلاح و بہبود سے ہے اور اس کا اثر ہماری ہی دُنیاوی زندگی پر پڑنا چاہیئے، اخروی زندگی سے اسے متعلق سمجھنا بالکل بے نتیجہ بات ہے، کیونکہ سزا و جزا کا مدعا صرف یہ ہو سکتا ہے کہ آیندہ بُرے کاموں سے احتراز کیا جائے، لیکن جب اس کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی اور دار العمل ختم ہو جاتا ہے تو سزا و جزا محض ایک لایعنی سے ہو کر رہ جاتی ہے، بہر حال یہ بالکل یقینی ہے کہ خدا سے ہماری عبادت و نافرمانی کا کوئی تعلق نہیں ہے یعنی خدا اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام نے کیوں اعمال حسنہ کو تنہا ذریعۂ نجات قرار نہیں دیا۔ آیئے سب سے پہلے قرآن میں جستجو کریں کہ اس امر میں کیا فیصلہ کیا ہے۔

قرآن میں جہاں کہیں ایمان و اسلام کا ذکر آیا ہے وہیں اعمال صالحہ کو بھی اسی کے ساتھ لازم کر دیا ہے اور بغیر افعال حسنہ کے ایمان کا کوئی مفہوم قرار نہیں دیا گیا۔ قرآن میں کثرت سے اس مفہوم کی آیات موجود ہیں، مثالاً چند یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

"انما المومنین اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم"۔ (یعنی مومنین کی پہچان یہی ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں اور باہم امن و صلح صلاح و فلاح کی زندگی بسر کریں)

"فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ"۔ (یعنی جو کوئی (خواہ وہ کسی ملک و قوم کا ہو) ذرہ برابر نیکی کرے گا اس کا نتیجہ دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے گا اس کا نتیجہ پالے گا)

"ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم" (یعنی اللہ کسی قوم کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے

اندر بُری یا بھلی کوئی تبدیلی نہ پیدا کرے)۔

"ان اللہ لا یظلم الناس شیئاً ولکن الناس انفسہم یظلمون"۔ (بلکہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ خود انسان ہی اپنے اوپر ظلم کرتا ہے)

الغرض یہ اور اسی قسم کی آیات سیکڑوں کی تعداد میں ایسی پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کا مفہوم صرف عمل صالح ہے چنانچہ ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوتا ہے:-

"ومن الناس من یقول آمنا باللہ و بالیوم الآخر وما ہم بمومنین"۔ (یعنی بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے دراں حالیکہ وہ مومن نہیں ہیں)۔

کیوں؟ اس لئے کہ ان کے اعمال اچھے نہیں ہیں اور ان کے اخلاق بُرے ہیں پھر کیا اس آیت کے تحت وہ مسلمان جس کا ذکر میں نے اپنے استفسار میں کیا ہے، ایمان سے خارج نہیں ہو جاتا اور اس کو ناری نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح کثرت سے کلام مجید میں اعمال و نتیجۂ اعمال کے فلسفہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ:- "لیس للانسان الا ما سعیٰ" (یعنی انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی ہے اور وہی ملے گا جو اس کے عمل کا اقتضاء ہے)۔ یہاں انسان کا ذکر کیا گیا ہے، مسلمان کا نہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایک غیر مسلم اپنے اعمال حسنہ کا اجر نہ پائے اور مسلمان اپنے افعال سیئہ کی سزا کا مستوجب نہ ہو۔

اس مسئلہ میں سب سے بڑی اُلجھن جس چیز نے پیدا کر دی ہے وہ شرک و توحید یا کفر و اسلام کی تفریق ہے، چونکہ مشرک و کافر کے لئے قرآن میں جا بجا ناری ہونے کی وعید آئی ہے، اور مشرک و کافر کا مفہوم بُت پرست یا غیر مسلم قرار دیا گیا ہے، اس لئے ایک مولوی نہایت آسانی کے ساتھ ایک غیر مذہب والے کے ناری ہونے پر فتویٰ صادر کر دیتا ہے خواہ اس کے اعمال کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں — میرے نزدیک کفر و اسلام یا شرک و توحید کا مفہوم ہی ان لوگوں نے بالکل غلط سمجھا ہے۔ جس طرح توحید کے معنے زبان سے خدا کو ایک کہہ دینے کے نہیں ہیں اسی طرح شرک کے معنی بُت پرستی کے نہیں ہیں۔ توحید سے مقصود خدا کو ایک کہنا نہیں، بلکہ ایک سے مراد اس کو کل سمجھنا ہے اور اپنے آپ کو بھی اسی کل کا جزو قرار دے کر تمام قوائے عمل سے کام لے کر تمام ان مدارج ارتقاء کو طے کرنا ہے جو اس کل یا قدرت نے سعی و عمل کے لئے مخصوص کر دئے ہیں چونکہ بُت پرست اقوام، یعنی وہ قومیں جو تمام کاموں کا انحصار بتوں کی خوشنودی پر رکھتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اپنے تمام عزائم و قوائے کا سب کو مضمحل بنا لیتی ہیں اس لئے رفتہ رفتہ انسانی عمران و تمدن کو تباہ کر کے خود بھی تباہ ہو جاتی ہیں۔ چونکہ عہد رسالت میں مشرکین عرب کی حالت بالکل اسی درجۂ انحطاط تک پہونچ گئی تھی اس لئے شرک و کفر کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا بغیر اس کے کہ انھیں فلسفۂ کفر و اسلام کو سمجھایا جاتا جس کے سمجھنے کے وہ اہل نہ تھے۔

الغرض محض کفر و شرک اخلاق سے قطع نظر معصیت نہیں ہے اور خود خدا کی برہمی کا سوال اس سے متعلق نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی رسول پیدا ہوتا ہے اور وہ کسی قوم کے لئے قوانین وضع کرتا ہے یا کوئی اسلوب حیات متعین کرتا ہے تو اس سے مراد اسکی یہ ہوتی ہے کہ قوم ان پر کاربند ہو کر ترقی کرے، محض ان قوانین کا حفظ کر لینا یا بالکل مادی طور پر رسم و رواج کی طرح اس اسلوب زندگی پر عامل ہو جانا مفید نہیں، اس لئے اگر کوئی مسلمان باوجود نماز روزہ و دیگر احکام کی شریعت کی پابندی کے اپنے اندر کوئی معنوی یا روحانی تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور یہ سمجھتا ہے کہ صرف ان اعمال و شعائر کی پابندی اس کی نجات کے لئے کافی ہے (جیسا کہ ہمارے علماء کرام سمجھتے ہیں) تو میں ایک بُت پرست کے مقابلہ میں اس کو کوئی ترجیح نہیں دے سکتا، کیونکہ ان دونوں کے درمیان سوا اس کے کوئی فرق نہیں ہے کہ ایک نے بُت پتھر کا بنایا ہے اور دوسرے نے وہم و خیال کا وہ اگر صرف مورت کی پرستش کو حصولِ مقاصد کا ذریعہ سمجھتا ہے تو یہ صرف نماز و روزہ کو اصل ایمان قرار دیتا ہے۔ اُس کا خدا پارۂ سنگ ہے اور اس کا بُت محراب و منبر!

اسلام کا عقلی جایزہ

(م - ا)

مذاہب کا تدریجی ارتقاء جس طرح مختلف زمانوں میں انسان کے خیالات، زبان و معاشرت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اسی طرح پُرانے مذاہب بھی بدلتے رہتے ہیں، اور ان کی جگہ نئے خیالات لے لیتے ہیں۔

دُنیا کے مذاہب دو حصّوں میں منقسم ہو سکتے ہیں، ایک حصّہ سامی مذاہب کا دوسرا آریائی مذاہب کا۔ پس خواہ ہم نسل سام کے مذاہب پر غور کریں یا نسل آریہ کے مذاہب پر، ہم کو ان کے تین ادوار نظر آتے ہیں:-

پہلا دور صابیت و مجوسیت کا جو نسل سام و آریہ کے گہواروں یعنی بابل اور ایران سے متعلق ہے۔ دوسرا دور یہودیت اور ہندوئیت کا جو صابیت و مجوسیت ہی کی ارتقائی صورت ہے۔ یعنی انسان نے اس دور میں اپنے متعدد معبودوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دی اور آخر میں ایک مجسّم دیوتا کو اپنی قوم کا ایک قہار و جبار بادشاہ تصور کر کے حکومتِ الٰہی کی بنیاد ڈالی اور مراسم مذہبی کو اٹل قانون قرار دیا، جس کی مخالفت پر وہی سزا ملتی ہے جو ایک مطلق العنان بادشاہ اپنے حکم کے نہ ماننے پر دیا کرتا ہے۔

اس دور نے مذہب کو سلطنت کی شکل دے کر اس کو صرف چند حرکاتِ جسمانی میں محدود کر دیا اور مذہب کی اصل روح اخوت و روحانیت سے کوئی اعتناء نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد دوسرا دور مسیحیت و بودھیت کا شروع ہوا جو گویا احتجاج تھا تھیوکریسی کے خلاف۔

ان مذاہب نے خدا اور انسان کے تعلقات کا ایک ایسا نظریہ قایم کیا جو ہر چند یہود و ہنود کے تصورات سے بلند تھا مگر اسے بھی فلسفہ میں ایسا اُلجھا دیا کہ آخر کار خود مسیح و بودھ کو الوہیت کی کُرسی پر بٹھا دیا۔

مسیحیت و بودھیت میں باہم اتنی مماثلت پائی جاتی ہے کہ بعضوں کو یہ گمان ہو گیا کہ مسیحیت دراصل کہیں بودھیت تو نہیں اور اس کا امکان اس لئے زیادہ ہے کہ شام و فلسطین میں قبل شیوعِ مسیحیت، بودھیت رائج ہو چکی تھی اور یہ وہی زمانہ تھا جب سکندر مقدونی کے جانشینوں نے باختر، شمالی ہند اور شام میں اپنی سلطنت قایم کی تھی اور ان کے سیاسی اور معاشرتی تعلقات بہت وسیع ہو گئے تھے۔۔۔۔ اس سلسلہ میں اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مسیح جن کی موت ایک راز ہے، ان کا آخری زمانہ (جبکہ وہ یہودیوں کے مکر و عناد سے بچ کر روپوش ہو گئے تھے) کہاں گزرا، بعض کا خیال ہے کہ وہ کوہستان کشمیر و افغانستان کی طرف چلے گئے جہاں بنی اسرائیل کا ایک قبیلہ پہلے ہی بابل سے فرار ہو کر مقیم ہو چکا تھا، چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اُن کے متبعین یقین کرتے ہیں کہ اُن کی قبر اب تک سری نگر میں موجود ہے۔

بہر حال انسانی مذاہب کا معاملہ کچھ اس طرح کا ہے کہ ابھی ایک مذہبی خیال پوری طرح ختم نہیں ہو پاتا کہ دوسرا خیال

پیدا ہو جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے مذہبی خیالات ایک ہی وقت میں خلط ملط ہو جاتے ہیں اور نئے مذاہب نشو و نما پانے لگتے ہیں۔

اسی اصولِ ارتقاء کے مطابق مذہب اسلام بھی وجود میں آیا اور اس میں شک نہیں کہ اس نے مذہب کا تصور بڑے وسیع زاویۂ نظر سے پیش کیا تاکہ وہ ہمیشہ زمانہ کا ساتھ دے سکے اور نوعِ انسانی کا مستقل "دینِ قیّم" قرار پائے۔

لیکن سوال یہ ہو کہ کیا اسلام در اصل وہی ہے جس کی تلقین اس وقت کی جاتی ہے اور کیا اس کے ماننے والے واقعی اپنے آپ کو صحیح معنی میں مسلمان کہہ سکتے ہیں۔

اسلام کی بڑی خصوصیت اس کی سادگی اور عملی تعلیم ہے جو براہ راست اخلاق سے تعلق رکھتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ وہ مفقود ہو گئی۔ کیونکہ عہدِ خلفاء کے بعد مذہب اسلام، حکومتِ اسلام میں تبدیل ہو گیا اور شخصی حکومتوں میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ سب اس میں آ گئیں۔

پھر اگر ان اسلامی حکومتوں کے بانی اپنے آپ کو مذہبی رہنما نہ سمجھتے اور مذہبی ادارے حکومت سے علحٰدہ ہو جاتے تو مذہب بڑی حد تک لغویات سے پاک رہتا، لیکن ہوا یہ کہ مسلم فرمانرواؤں نے عنانِ مذہب بھی اپنے ہی ہاتھ میں رکھی اور اس طرح اپنے مصالح ذاتی کے لحاظ سے شعائر و معتقدات میں بھی بہت سی ایسی تبدیلیاں پیدا کر دیں جو روحِ اسلام کے منافی تھیں۔

یہ تبدیلیاں زیادہ تر احادیث کے ذریعہ سے پیدا کی گئیں جن میں اکثر موضوع تھیں اور محض فرمانروایانِ وقت کی تکمیلِ اغراض کے لئے وضع کی جاتی تھیں، پھر جب تک یہ حکومتیں قایم رہیں اس وقت تک تو خیر ایک ڈھانچہ بُرا یا بھلا قایم بھی رہا، لیکن اس کے بعد جب دورِ انتشار آیا تو اس نے سب سے زیادہ ذہن و عقل میں وہی تمام گتھیاں پیدا کر دیں جو احساسِ کمتری کی بنا پر ہمیشہ پیدا ہو جاتی ہیں اور اسلام کا چہرہ بالکل داغدار ہو گیا، خدا کا صحیح تصور ختم ہو گیا، مفہوم نبوت بدل گیا، عملی رجحانات ختم ہو گئے اور اسلام نام ہو گیا محض روایتی مزخرفات اور واہمہ پرستی کا۔

جیسا کہ ہم نے ابھی ظاہر کیا، ہر دور میں انسانی میلانات کے ساتھ ساتھ مذہبی عقاید و خیالات بھی بدلتے رہتے ہیں اور قانونِ ارتقاء کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں وہ بڑی رجعت پسندانہ تھیں اور بجائے اس کے کہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مذہبی تصورات و اعمال میں بلندی و وسعت پیدا کرتے، وہ اسی اعجوبہ پرستی کی طرف لوٹ گئے جس سے اسلام نے انھیں ہٹایا تھا اور خدا پرستی کی جگہ ان کا شعار صرف قبر پرستی، پیر پرستی اور واہمہ پرستی ہو گیا۔

اس مظلمہ کے سارے ذمہ دار ہمارے مذہبی علماء تھے، جنھوں نے قرآن کو چھوڑ کر روایات کو لے لیا اور اس میں اتنی شدت ہوئی کہ اگر آج کوئی شخص اس خارزار سے نکل کر اسلام کا صحیح تصور پیش کرنا چاہتا ہے تو اسے مُلحد کا فر قرار دے کر جماعت اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

خُدا کا تصوّر اور عالمِ خلق سے اس کا تعلق

خدا کا تصور مذہب کی تاریخ میں اسلام سے قبل صرف یہود و بنی اسرائیل میں ایک خدائے واحد کے وجود کا خیال پایا جاتا تھا، ورنہ یورپی محققین کے خیال سے کیا کلدانی کیا مصری کیا یونانی سب مذاہب بیشمار دیوتاؤں کی پرستش پر مبنی ہیں۔ مشرق کے مذاہب میں وحدانیت کا نہیں تو کم از کم نبوت کے خیالات ضرور ملتے ہیں۔ چنانچہ مصریوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فرعون (طسوتیس چہارم) نے اپنے پرانے معبودوں اور پایۂ تخت کو چھوڑ کر تل العمرانہ کے قریب ایک نیا پایۂ تخت اپنے خدا آتون کے نام سے بنوایا اور خود اپنا لقب اِنی ناتون (یعنی آتون کا پرتو نور) رکھا۔ اس

نئے معبود کے متعلق کتاب تعلیمات میں جو مصریوں کے قول کے مطابق الہامی ہے، توحید کے وہ خیال پائے جاتے ہیں جن کو ہم واقعی الہامی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اخناتون کے بعد ساٹھ سال کے اندر قدیم بت پرستی کے خیالات نے پھر پلٹا کھایا۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اٹھارھویں خاندان کے فراعنۂ مصر میں جب توحید کا رواج تھا تو یہ وہی زمانہ تھا جب حضرت یوسفؑ مصر میں تھے تو گویا تاریخی کتبے اور قرآن مجید دونوں اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ درحقیقت مصر کے مسلم مبعوث پیغمبر تھے اور ان کی تعلیم سے مصریوں کے خیالات بدلے۔ اسی طرح قدیم کلدانیوں میں حمورابی کے زمانہ کے بعد جب بابل کی سلطنت و مذہب کی تشکیل ہوئی، بعل کے لئے وہی صفات مانے جاتے تھے جو ایک خدا میں سمجھے جا سکتے ہیں، اور وہاں بھی کتبات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت نوحؑ کی تعلیم ایک عرصہ تک اُن میں کامیاب رہی تا آنکہ انھوں نے بودھ مذہب و عیسائی مذہب کی طرح خود حضرت نوحؑ کے نام کا ایک دیوتا بنا لیا۔

ہندوؤں کے مذہب میں بھی بقول البیرونی عوام سے بالاتر ایک طبقہ تھا جس کا خیال خدا کی نسبت بالکل الہامی کہا جا سکتا ہے۔ وہ خدا کو واحد ازلی، قادرِ مطلق خالقِ کائنات وغیرہ وغیرہ صفات کے ساتھ ویسا ہی متصف مانتے تھے، جیسے مسلمان۔ چنانچہ کتاب پاتنجلی میں جس کا حوالہ البیرونی نے دیا ہے، شاگرد اپنے استاد سے سوال کرتا ہے:۔ "وہ کونسا معبود ہے جس کی عبادت انسان کو سعید بناتی ہے"، استاد: "وہ وہی ہے جو ازلی و بے ہمتا ہے، بے ہمتا ہے۔ وہ عذاب و رحمت کے لئے کسی کا محتاج نہیں وہ انسان کے خیال میں نہیں آسکتا۔ وہ بے مثل ہے اور کسی قسم کی تشبیہ اس کے لئے لغو ہے۔ وہ خود اپنے وجود سے موجود ازلی ہے، وہ عالم و دانا ہے، بلکہ وہ خود علم ہے اور لاعلمی کی صفت خدا میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی"۔ شاگرد:۔ "کیا اس کے علاوہ بھی اس میں کچھ اور صفات ہیں؟" استاد:۔ "وہ بلند ہے اس کی برتر ذات مکان و زمان سے مستغنی ہے، وہ خالص نیکی ہے وہ علیم و خبیر ہے"۔ اسی طرح بھاگوت گیتا میں باسدیو، ارجن کے مکالمہ میں باسدیو فرماتے ہیں:۔ "میں کائنات ہوں بے ابتدا و انتہا ہستی لایموت ہوں ——— میں بے نیاز ہوں، مجھ سے کسی ہستی کی تشبیہ نہیں ہو سکتی، میں کسی خاص فریق کا طرفدار نہیں۔ میں نے ہر ہستی کو اس کی ضرورت کا تمام سامان دیدیا ہے۔ اس لئے جو میری ہستی کو پہچانتا ہے اور میرے مانند ہونے کے لئے مجاہدہ نفسی کرتا ہے، اس کے علایق کی بیڑیاں کٹ کر اس کو آزادی و نجاتِ ابدی حاصل ہوتی ہے"۔

ایک دوسری جگہ باسدیو نے فرمایا:۔ "انسان کا فطری تقاضا ہے کہ وہ اپنی ضرورت میں خدا کو یاد کرے جو مجھے ازلی اور خالق اکبر جانتا ہے۔ وہی تمام انسانوں میں گناہوں اور خطاؤں سے مبرا ہے"۔ فلاسفۂ یونان و روما کے خیالات میں بھی ہم کو بہت کچھ اس کے پرتو نظر آتے ہیں۔ سات حکمائے یونان جو ارکانِ عقل کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ تمام چیزیں ذات واحد سے نکلی ہیں اور انسان دوسرے غیر ذوی الارواح مخلوق سے اس لئے ممیز ہے کہ وہ اس ذات واحد یا سببِ اول سے قریب تر ہے۔

ان حکماء کا خیال تھا کہ عالم ایک ہی شے ہے اور سببِ اول ان میں مختلف جلوؤں سے ظہور کرتا ہے اور انسان آخرکار اس میں جذب ہو کر اپنی ساری ہستی فنا کر دیتا ہے۔ "خدا ایک ہی ہے۔ خدا متعدد تعدادوں میں نہیں ہے"۔ اسلام نے بھی خدا کا یہی تصور پیش کیا۔

اور آج جب کہ تحقیقات و تدقیقات کی انتہا نظر آتی ہے، جبکہ کائنات کے سیکڑوں اسرار فاش ہو گئے ہیں، جبکہ حقایق اشیاء نے اپنے چہرہ سے نقاب اُلٹ دیا ہے، بڑے بڑے فلاسفر و حکماء بھی انتہائی غور و فکر کے بعد خدا کا تصور اس سے بہتر نہیں پیش کر سکے — جسے پہلے نہایت قریب الفہم اور صاف طریقہ میں ادا کیا تھا۔

انیرک ہوش کہتا ہے:۔ "کائنات کے اجزا میں باوجود ہزاروں انقلاب زمان و مکان کے جو ترتیب اور تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایک ذات کے پایا جا سکے جو سب سے اول ہے اور صاحبِ علم و صاحبِ اختیار ہے۔ اس زمانہ کا سب سے بڑا حکیم ہربرٹ اسپنسر

کہتا ہے :——— "ان تمام اسرار پر ہم جس قدر غور کرتے ہیں اسی قدر وہ اور زیادہ قابض ہوجاتے ہیں اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت موجود ہے جس سے تمام اشیاء صادر ہوتی ہیں۔ کیمل فلا فریال کہتا ہے :" تمام اساتذہ اس بات کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ وجود کیونکر ہوا اور کیونکر برابر جاری ہے۔ اسی بنا پر ہم کو مجبوراً ایک ایسے خالق کا اقرار کرنا پڑتا ہے جس کا موثر ہونا ہمیشہ اور ہر وقت قایم ہے۔

پروفیسر لینی لکھتا ہے کہ :- " خدائے قادر و دانا اپنی عجیب و غریب کارگیریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور میں بالکل دیوانہ بن جاتا ہوں، ہر چیز میں گو یا وہ کتنی ہی چھوٹی ہو۔ اس کی کس قدر عجیب قدرت۔ کس قدر عجیب حکمت۔ کس قدر عجیب ایجاد پائی جاتی ہے" فونسل انسائیکلو پیڈیا میں لکھتا ہے :- " علوم طبیعیات کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ ہماری عقل کی پیاس بجھائے بلکہ ان کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی عقل کی نظر خالق کائنات کی طرف اُٹھائیں اور اس کے جلال و عظمت پر فریفتہ ہو جائیں"

پس درحقیقت ریشنلزم یا عقلیت اس کا نام نہیں کہ ایک ایسی چیز کے وجود سے انکار کیا جائے جسے ہماری عقل سمجھ نہ سکے، یا جیسا اگنا سٹزم (EGNOSTICISM) کا عقیدہ ہے کہ جو باتیں ہمارے عقل و تجربہ سے باہر ہیں اور جنکے متعلق ہم کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتے، ممکن ہے کہ ان کا وجود ہو یا نہ ہو کیونکہ اگر عقلیت کا یہ معیار مقرر کیا جائے تو پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ سائنس کے ایسے مسلمات مثلاً قوت برق۔ مقناطیس۔ ایتھر۔ جو سماوات۔ زمانہ۔ مادہ۔ نیکی و بدی وغیرہ سب ہی کے وجود کا اقرار ریشنلزم کے خلاف ہوگا مگر ان کے وجود سے ہم انکار نہیں کرتے۔

ہم یہ ماننے کے لئے طیار نہیں ہو سکتے کہ خدا میں ہماری ہی طرح کے ادنیٰ قسم کی فیلنگ یا جذبات مثل حسد، غصہ وغیرہ پائے جاتے ہیں جذبات تو صرف ہمارے حفظ نفس کے لئے خدا نے پیدا کئے ہیں۔ نہ خدا کو حفظ نفس کی ضرورت ہے اور نہ ایسے جذبات کی جبکہ اس کا کوئی شریک ہی نہیں جس سے حفظ نفس کی ضرورت ہو، اور یہ خیال کہ جس طرح ہماری رعیت ہم سے سرکشی کرکے دوسرے کی رعیت بن جاتی ہے تو ہم کو ان سے کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی حال خدا کا بھی ہے اور اس طرح جب خدا کا غصہ بھڑکایا جائے گا تو یقیناً ایسے آدمی کی سزا جہنم ہوگی ایک لغو خیال ہے۔

سب سے پہلے ہم کو یہ خیال دل سے نکال دینا چاہئے کہ ہمارا خالق و پروردگار انسانی صفات و شکل کا ہے۔ اگر اس کی کوئی صفات ہیں تو ایسی نہیں جیسی ہم تصور کرتے ہیں۔ ہم خدا کے وجود کے قایل ہونے کے ساتھ فطرتاً مجبور ہیں کہ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اسی لئے ہم دُنیاوی مثال سے اس کا تصور کرتے ہیں، لیکن یہ محض امتناعی تصور ہے۔ اور خدا ان تصورات سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے اس لئے خدا کا یہ تصور کہ وہ دنیاوی بادشاہ کی طرح تخت نشین ہے اور اس کا برتاؤ اپنے بندوں کے ساتھ ویسا ہی ہے جیسا دنیاوی بادشاہوں کا اپنی رعیت سے ہوتا ہے سو یہ محض ہمارے خیالات کا تکیہ یا عصا ہے تاکہ خیال الحاد کی طرف نہ چلا جائے ورنہ درحقیقت دہ نہ ہمارے بادشاہوں کے مانند ہے اور نہ ان کی طرح منتقم و کینہ جو ہے۔ اس کی حکمت نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو دنیا کی بہترین خلقت اور بدترین خلقت بننے کی صلاحیت دی۔ اس نے بذریعہ الہام و وحی انسان کو راہ عمل بتائی اور نیکی و بدی کی دو گھاٹیاں دکھلا دیں۔ اگر انسان کی فطرت نے نیکی کی صلاحیت پیدا کی وہ فرشتہ صفت ہوگیا اور اگر بدی کی صلاحیت پیدا کی تو شیطان صفت ملکہ صفت ہونا اس کے لئے باعث حظ ابدی یا فردوس ہے اور شیطان صفت ہونا اس کے لئے کرب ابدی یا جہنم۔

اب رہا خدا اور مخلوقات کا باہمی تعلق سو اس کے سمجھنے کے لئے موجودات عالم کی نسبت تین احتمال پیدا ہوتے ہیں :-

(۱) قدیم سے اسی طرح موجود ہوں گے۔

(۲) خود بخود پیدا ہو گئے ہوں گے۔

(۳) یا کسی خدا نے ان کو پیدا کیا ہوگا۔

پہلے احتمال کی نسبت ہمیشہ سے موجود رہنے کے لئے غیر محدود زمانہ فرض کرنا پڑے گا، حالانکہ غیر محدود زمانۂ ماضی کا سمجھنا ناممکن

ہے۔ دوسرے احتمال کی نسبت یہ اعتراض ہوتا ہے کہ پیدا ہونے کے لئے کسی علت کا ہونا ضروری ہے، ورنہ قانون فاعلیت کا باطل

ہونا لازم آئے گا اور تیسرے احتمال یعنی خدا کی قدرت سے پیدا ہونے کی نسبت تین اعتراض پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ بغیر مادہ کے

پیدا کرنے کی کوئی نظیر نہیں اور اگر مادہ سے پیدا کیا ہے تو پھر اس مادے کی نسبت وہی تین احتمال ہو سکتے ہیں اور ہر احتمال پر اعتراض

وارد ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس فضا میں یہ دنیا ہے وہ کہاں سے آئی۔ اگر فضا کو بھی خدا نے پیدا کیا تو مخلوقات سے پہلے فضا بھی

ہوگی حالانکہ ہم فضا کے نہ ہونے کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور تیسرے یہ کہ بنانے والا کہاں سے آیا، آیا وہ قدیم سے تھا، یا خود بخود پیدا ہوا

یا اس کو کسی اور خدا نے پیدا کیا، اگرچہ یہ احتمالات ناقابل حل ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ موجودات عالم کو ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ ان کی

حالت یوماً فیوماً لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے، حتیٰ کہ ہماری عقل کی صحیح رفتار نے ثابت کر دیا ہے کہ تمام زمین و آسمان ایک وقت پر اس صورت

میں نہ تھے بلکہ جب سے موجود ہیں اپنی شکلوں کو بدلتے رہے ہیں۔ بس یہ مخلوقات اگر ہمیشہ سے مانی جائے تو سمجھ نہ سکنے کے علاوہ یہی لازم

آتا ہے کہ ان کے تغیرات بھی بغیر کسی علت کے خود بخود پیدا ہوتے ہیں، اور اس احتمال پر قانون علل و اسباب کا باطل ہونا لازم آتا ہے۔

اب ہم الہام کی طرف رجوع کرتے ہیں، خدا نے کائنات کو چھ دور میں پیدا کیا۔ قرآن میں لفظ "ایام" ادوار کے معنی میں آیا ہے۔

ایام سے ہمارا ذہن ایک محدود وقت کی طرف جاتا ہے جو طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک ہے، لیکن کوئی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا

کہ آفتاب و ماہتاب و زمین بنانے کے وقت دن سے مراد یہی ہمارا دن ہوگا، ان ادوار کا کوئی متعین زمانہ نہیں کیا جا سکتا، ممکن ہے

ہزارہا سال یا لاکھوں سال یا کروڑوں سال ہو خود قرآن میں بعض جگہ دن کا شمار ہزار سال کے برابر کیا گیا ہے:-

(۱) "وان یوماً عند ربک کالف سنۃ مما تعدون"

(۲) "یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون"

محققین کی رائے ہے کہ کسی زمانہ میں جس کا شمار کروڑوں سال کی تعداد میں کیا جا سکتا ہے، زمین ایک آتشین گولا تھی اور

اغلب ہے کہ اس سے پہلے کرۂ آفتاب کا ایک جزو رہی ہو، جس سے جدا ہو کر اس نے ایک علٰحدہ کرہ کی صورت اختیار کر لی۔

(اولم یر الذین کفروا ان السموات والارض کانتا رتقاً ففتقناھما)

- - - - - - - - - بہرحال حیوانات اور نباتات تو الگ رہے جمادات کی بھی یہ صورت نہ تھی جو اب ہے، تمام

مادی اجزا ایک شعلۂ جوالہ کی طرح تھے، گویا نہایت لطیف ہوائی جسم رکھتے تھے اور اس لطیف مادے کی بھی صرف چند قسمیں تھیں۔

رفتہ رفتہ حرارت کے زوال کے ساتھ بعض اجزاء نے رقیق صورت اختیار کر لی۔

کے بعد انجماد شروع ہوا جس طرح دودھ میں کھولنے کے بعد بالائی پیدا ہو جاتی ہے، چونکہ اندرونی حصہ میں حرارت اور سیلان اب بھی زیادہ

تھا۔ اس لئے اس میں ہر وقت ایک ہیجان اٹھتا رہتا تھا۔ جس سے بالائی طبقہ ہر وقت متزلزل رہتا اور جلد صورت بدلتا رہتا تھا، کبھی

کوئی حصہ پھٹ جاتا اور بڑے بڑے غار پیدا ہو جاتے۔ جس میں سے بھڑکتے ہوئے شعلے نکلتے رہتے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بلندی و پستی نے زیادہ پائدار صورت اختیار کر لی، اور جابجا بہت اونچے پہاڑ اور انھیں کے مقابلہ میں بڑی بڑی گھاٹیاں اور غار پیدا ہو گئے۔ اگرچہ زمین کا بالائی حصہ سخت ہو کر اب مثل پتھر کے تھا، پھر بھی حرارت کھولتے ہوئے پانی سے زیادہ تھی اور اس وجہ سے پانی کے اجزا اب بھی کثیف ابر کی صورت میں ہوائی غلاف کے ساتھ زمین کو محیط تھے۔ لیکن کہیں بھی ایک قطرہ پانی کا نہ تھا۔

(والقی فی الارض من رواسی ان تمید بکم الخ)

جب زمین اور زیادہ ٹھنڈی ہوئی تو بارش کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن جلتے ہوئے توے پر جو پانی گرتا تھا، پھر بھاپ بن کر اُڑ جاتا تھا، لاکھوں سال بارش ہونے کے باوجود دریا اور سمندر کا کہیں وجود نہ تھا، اس حالت سے گزر کر زمین کی وہ صورت پیدا ہوئی جو ان تمام تغیرات کے ساتھ اب ہمارے سامنے موجود ہے، یعنی پانی نے زمین پر قیام اختیار کیا اور بعض بڑی بڑی گھاٹیوں اور غاروں کو بھر دیا جو سمندر ہو گئے، متواتر بارش اور ہوا کے اثر سے پہاڑوں کے بعض اجزا گھس گھس کر پانی کے ساتھ نشیب میں آکر تہ نشین ہونے لگے اور بعض جگہ غاروں کے پر ہو جانے سے سطح زمین کی صورت پیدا ہو گئی۔

زمین کی یہ آخری صورت بھی اگرچہ کروڑہا سال سے قایم ہے، لیکن اس دوران میں بھی بڑی بڑی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، جو ابتدائی حالت کے مقابلہ میں پھر بھی ادنیٰ خیال کی جا سکتی ہیں، بعض وہ مقامات جو پہلے سمندر تھے، اب خشک ہو کر براعظموں میں تبدیل ہو گئے۔ جیسے افریقہ کا صحرائے اعظم یا ہندوستان کا شمالی حصہ جس میں اب دریائے گنگا اور دریائے انڈس بہتے ہیں، اس طرح بعض حصے جو اب سمندر ہیں پہلے خشک تھے، مثلاً بحر ہند کا وہ حصہ جو برہما اور آسٹریلیا کے درمیان میں ہے اور جس میں گزشتہ زمانہ کی ایک براعظم کی یادگار جزایر ملایا کی صورت میں اب موجود ہے، یا یورپ میں وہ آبنائے جو فرانس اور برطانیہ کے درمیان واقع ہے۔ غرضکہ ابتداء میں زمین کو جلد از جلد اور عظیم حوادث کا سامنا کرنا پڑا .... اور رفتہ رفتہ سکون کی حالت پیدا ہوئی۔

اس طرح گویا جمادات نے سرد و گرم زمانہ کا مقابلہ کر کے روز بروز اپنی ایک زیادہ دیرپا صورت اختیار کرنا شروع کی، نباتات اور حیوانات کا دور اس کے بہت بعد شروع ہوا، لیکن تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قسم کے درخت اور جانور اس دنیا میں پہلے پائے جاتے تھے، اب وہ بالکل مفقود ہیں اور ان کی جگہ دوسرے قسم کے درختوں اور جانوروں نے لے لی ہے مختلف زمانے کے اجسام نامیہ یعنی نباتات اور حیوانات کو جب ہم سلسلہ وار رکھ کر مقابلہ کرتے ہیں تو چند باتیں ان میں پاتے ہیں۔

اول یہ کہ ہر زمانہ کی مخلوق اپنے سے پہلے زمانہ کی مخلوق سے ملتی جلتی ہے اور جو تبدیلیاں ان کی صورت اور شکل میں ہوئی ہیں وہ بہت آہستہ آہستہ ہوئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ نئی صورتیں ایسی پیدا ہوتی گئی ہیں جو حوادثِ زمانہ کا مقابلہ زیادہ قوت کے ساتھ کر سکتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ زمین کے مختلف حصوں میں پھیل جانے کی وجہ سے نباتات اور حیوانات نے اپنی ضرورت کے مطابق چند نسلوں میں اپنی صورت و شکل میں تبدیلیاں پیدا کر لی ہیں۔ اس طرح گو یہ تمام اجسام نامیہ جو اس وقت تک دنیا میں پائے جاتے ہیں، ایک ہی اصل کی شاخ ہیں جو لاکھوں صدیوں کے تغیرات کے بعد اب اپنی موجودہ صورت پر بظاہر قایم ہیں۔ لیکن در اصل قانون قدرت یا اصول ارتقاء اب بھی ان کے اندر کام کر رہا ہے اور ماحول کی مناسبت سے اب بھی ان میں وہی تبدیلیاں برابر جاری ہیں۔

بنی نوع انسان کے وجود کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ کم و بیش ایک لاکھ سال سے اس دنیا میں موجود ہے لیکن دس ہزار سال پہلے کے

جن انسانوں کی لاشیں دستیاب ہوئی ہیں، ان کی ساخت جسمانی، ان کی ہڈیاں اور خاص کر ان کی کھوپڑیاں موجودہ زمانہ کے انسانوں سے کسی قدر مختلف ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو ان کے جسم بمقابلہ ہمارے زیادہ مضبوط تھے، مگر ان کی دماغی حالت اور قوائے ذہنی کمزور تھے اور یہی حالت دوسرے حیوانات کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ زمانۂ سابق کے بعض قوی الجثہ اور جسم کی بناوٹ کے لحاظ سے عجیب الخلقت تھے، مگر دماغ بہت چھوٹا اور کمزور رکھتے تھے اور اسی وجہ سے وہ اپنی نوع کو قائم نہ رکھ سکے بالآخر قدرت نے انکو رفتہ رفتہ دوسرے انواع میں تبدیل کر دیا، جن کے قوائے ذہنی کو بمقابلہ اعضائے جسمانی کے زیادہ ترقی ہوتی گئی اور وہ حوادثِ عالم کا زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے قابل ہوتے گئے۔

پچاس ہزار سال یا ایک لاکھ سال کے قبل کے جو انسان تھے ان میں اور موجودہ زمانہ کے بعض بندروں کی قسموں میں بہ لحاظ جسمانی اور دماغی ساخت کے بہت تھوڑا فرق معلوم ہوتا ہے، اس وجہ سے اکثر یہ قیاس کیا گیا ہے اور یہ قیاس قرینِ عقل بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلسلۂ ارتقاء ذروں سے گزرتے ہوئے انسانیت سے پہلے ایک دورِ میمونیت کا بھی حضرت انسان پر گزرا ہے، یا بالفاظِ دیگر ایک لاکھ سال یا اس سے پہلے کے بندروں میں جو تبدیلیاں بہ تقاضائے ارتقاء ہوئی ہیں، ان کا مجموعی نتیجہ انسان کا وجود ہے۔

اگر ہم کارخانۂ قدرت پر ایک نظرِ وسیع ڈالیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ نہ صرف زمین بلکہ عالم خلق کے چھوٹے چھوٹے ذروں سے لے کر عظیم الشان ثوابت تک کی روشنی ایک لاکھ اسی ہزار میل فی سکنڈ چلنے کے باوجود ہم تک برسوں بلکہ صدیوں اور کبھی ہزاروں برس میں پہونچتی ہے اصول ارتقاء کی حکمرانی ہے اور ہر آن اور ہر لحظہ کے تغیرات اسی ایک قانون کے تحت ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے حالات کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ اس کا تعلق سیاسیات، تمدن، معاشرت، اخلاق، مذہب غرضکہ کسی شے سے ہو ایک نہ ایک تغیر ہر لحظہ رونما ہوتا رہتا ہے اور ہر تغیر کا میلان یہ ہوتا ہے کہ پچھلی صورت کو چھوڑ کر نئی بہتر اور زیادہ پائیدار حالت اختیار کی جائے۔ حتیٰ کہ انسانی ذہن اور انسانی تخیلات میں اصول ارتقاء کے مطابق ترقی جاری ہے۔ ا

نبوّت کا مفہوم اور اس کی ضرورت

نبی کا مفہوم تقریباً تمام سامی زبانوں میں وہی ہے جو عربی میں ہے۔ یعنی خبر دہندہ۔ مجھے اس میں شک ہے کہ آیا نبی مادہ "نبنا" (خبر دینا۔ بتانا۔ اطلاع دینا) سے بنا ہے، یا خود ایک مستقل لفظ جامد ہے اور اس سے نبا کا فعل مشتق ہوا ہے۔ کیونکہ عبرانی لفظ نابی یا "نابیہیم" اور اسوری لفظ "نابو" مرادف الفاظ ہیں اور ان کا کوئی مادہ نہیں۔ اہل بابل کے ایک دیوتا کا نام نبو (NEBO) تھا جو نبیو سے نکلا ہے۔ یہ دیوتا انسانی مقدرات کو ظاہر کرنے والا سمجھا جاتا تھا اور اس کے معنے سے وہی صفات پیدا ہوتے ہیں جو عبرانی لفظ "نابی" سے پیدا ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس قوم نے سب سے پہلے انسان کی ایک جماعت کا نام نبی رکھا تھا وہ اہل کنعان تھے، جن کے ہاں بعل دیوتا کے بڑے پروہت کا لقب نبی ہوتا تھا اور اس کا منصب و مشغلہ دیوتاؤں کی طرف سے غیب کی خبریں دینا تھا، پروہتوں کی جماعت دو درجوں میں منقسم تھی۔ ایک ادنیٰ اور ایک اعلیٰ۔ ادنیٰ جماعت رو... کہلاتی تھی، مگر ان دونوں جماعتوں کے مشاغل وہی تھے جو کاہنوں کے اکثر ہوا کرتے ہیں۔ عبرانیوں نے یہ لفظ یا تو اہلِ بابل سے لیا یا خود کنعانیوں سے جو ان کے ہمسایہ تھے۔ کیونکہ عبرانی لفظ "نبیہیم" کا کوئی مادہ نہیں ہے۔ بعضوں نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ لفظ "منہبو" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی عبرانی میں شوریدہ سر کے ہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے نبی ظاہری حالت میں مسلمانوں کے درویش و مجاذیب سے مماثل ہوا کرتے تھے۔ مگر یہ ایک ناقابل اطمینان توجیہہ ہے اور سب سے بڑی مخالف وجہ یہ ہے کہ یونانیوں نے جب کتب مقدسہ کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا

تو نبی کا ترجمہ پرافیٹس (PROPHITENS) کیا جس سے انگریزی لفظ پرافٹ یعنی غیب کی خبر دینے والا نکلا ہے۔

مشہور یہودی فلسفی فیلو (PHILO) نے سچے نبی کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ صاحبِ جذب و حال ہو اور جو کچھ وہ کہے وہ اس کی طرف سے نہ ہو بلکہ وہ الہامی الفاظ ہوں، جو خود اس کی عقل و حواس کو اپنے اندر جذب کرلیں، جھوٹا نبی وہ ہے جو صرف شگون سے کام لے۔

غیب دانی یا شگون کا اعتقاد تقریباً دنیا کے تمام اقوام میں پایا جاتا ہے۔ انسان ایک مجبور مخلوق ہے اور یہی مجبوری اس کو مذہبی اعتقاد کی طرف لے گئی اور کسی بالاتر ہستی کے تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔

نبوت کی صرف دو صورتیں موجودہ مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ جس میں نبی کو عین خدا اور اس کا اوتار قرار دیا جاتا ہے اور دوسری وہ جس میں اس کو خدا کا پیامبر مانا جاتا ہے۔ مسیحیت، ہنود و بودھ مذہب میں نبوت کی پہلی صورت ہے۔ اور مجوس، یہود اور اسلام دوسری صورت کو تسلیم کرتے ہیں مگر تقریباً تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ نبی انسانوں کا معلم ہو کر دنیا میں آتا ہے اور بقول علامہ شبلی " خدا نے جس طرح انسان کو اور مختلف قوتیں عطا کی ہیں جو بعض افراد میں بالکل نہیں پائی جاتیں اور بعض میں یہ تفاوت درجات پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک روحانی قوت عطا کی ہے جس کا نام قوتِ قدسیہ یا ملکۂ نبوت ہے یہ قوت تزکیۂ نفس اور پاکیزگی اخلاق سے تعلق رکھتی ہے۔ جس شخص میں یہ قوت موجود ہوتی ہے وہ اخلاق میں کامل ہوتا ہے اور اپنے اثر سے اور انسانوں کو کامل بنا دیتا ہے یہ شخص کسی سے تعلیم و تربیت نہیں پاتا بلکہ بغیر تعلیم و تعلم کے اس پر حقایق اشیاء منکشف ہو جاتے ہیں۔"

اب یہ دیکھنا ہے کہ نبوت کی کونسی صورت مذہب فطرت کے مطابق ہے، بادی النظر میں دوسری صورت بہت قرینِ عقل معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس میں الٰہیات کی وہ شان پیدا ہو جاتی ہے، جو توحید کا حصہ ہے اور توحید کا ماننا - - - - - - - - - - - - - - - - انسانی ارتقاءِ عقلی کا مقتضا ہے۔ برخلاف دوسری صورت کے کہ وہ محض شرک و بت پرستی یا انسان پرستی ہے اور خدا کے اکثر صفات کے منافی ہے۔

جب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تجدید اپنے دور میں کی تو وہ ایسا زمانہ تھا جب انسانی عقول پستی سے بلندی کی طرف مائل ہو رہے تھے اس لئے اسلام کا نظریہ الٰہیات اور نبوت کے متعلق وہی ہے جس کو تقریباً آج کل کے یوروپ کے فلاسفر بھی قبول کرنے کو طیار ہو سکتے ہیں۔ اسلام جہاں نبوت کو الٰہیات سے جدا مانتا ہے وہ اللہ کو نور السموٰت والارض بھی مانتا ہے۔ پس اسلامی نبوت کے لئے تنقیح طلب یہ مسایل ہو جاتے ہیں کہ دو متضاد باتیں کیونکر باہمی تعلقات پیدا کر سکتی ہیں اور اگر خدا اپنی قدرت کی وسعت سے ایک بندے سے تعلق پیدا کرتا ہے یا کرنے پر قادر ہے تو پھر ایک مخصوص جماعت نبیوں کی ضرورت ہی کیا ہے اس کا کلام ہر شخص کے دل پر القاء ہو سکتا ہے اور ہر شخص کو فطرتاً برگزیدہ بنا سکتا ہے۔

لیکن صورتِ حال یہ نہیں ہے، اگر ہم مشاہدات و بدیہات سے کام لیں تو انسانوں کے اندر ہم کو بعض ایسے ادراکات کا پتہ چلتا ہے جو طبایع کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے، اور وہ باتیں ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں، یہ مشاہدات اس کثرت سے ظہور میں آتے ہیں کہ ان کی بنا پر اب تفتیش روحانیات (PSYCHICALRESEARCH) ایک خاص علمی مشغلہ ہو گیا ہے، ان مناظر کو جو قدیم الایام سے لیکر آج تک آسیب کے ناموں سے مشہور ہیں اور جن کی تائید میں انجیل کی متعدد روایتیں بھی موجود ہیں، ان سے یہ قیاس بجا طور پر کیا جا سکتا ہے کہ انسان بعض اوقات کسی خارجی و غیر مرئی شے سے ایسا متاثر ہو جاتا ہے کہ اس کے حرکات و سکنات و اقوال ایک دوسرے خارجی و غیر مرئی ہستی میں جذب ہو جاتے ہیں اور جو کچھ انسان کہتا ہے یا کرتا ہے وہ خود اپنی طرف سے نہیں کہتا اور یہیں سے مفہوم نبوت سمجھ میں آسکتا ہے۔

اتنا تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ خود انسان میں ایک مقناطیسی قوت موجود ہے جسکی مدد سے وہ بغیر کسی ظاہری سلسلہ کے اپنے معمول پر اثر ڈال سکتا ہے، پس جب ارواح دنیاوی انسان پر ایسا اثر ڈال سکنے کی قابلیت رکھتی ہیں، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ خدائی روح اس کی قوت ارادہ انسان پر اسی طرح اثر ڈالے جس کو ہم اصطلاح میں القاء یا الہام یا وحی کہتے ہیں ۔

قرآن کے الہامی ہونے کی ماہیت کیا ہے اور یہ کہ وہ مخلوق ہے یا ازلی، ماموں رشید کے زمانہ میں یہ علماء اسلام میں ایک بڑا اہتم بالشان مسئلہ تھا، لیکن وہ حرفاً حرفاً یونانیوں کے افکار سے مسلمانوں میں آیا ہے اور یونانیوں کے قدماء اور مسیحیوں نے لوگس پر جو بحث کی ہے بجنسہ وہی بحث مسلمانوں نے قرآن کے لئے اختیار کی ہے، ان کی تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن خدا کی طرف سے ایک علم ہے اس لئے وہ خدا کی صفت علم سے جدا نہیں، اسی طرح چونکہ خدا ازلی اور غیر مخلوق ہے اس لئے قرآن بھی ایسا ہی ہے۔ معتزلہ نے اس خیال کی مخالفت کی اور انھوں نے قرآن کے بابت کہا کہ ——— وہ انسانی کلام ہے جو ایک خاص اثر سے نبی اپنی زبان سے ادا کرتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ بنی عباس کے زمانہ میں کیا اعتقاد اور کیا شریعت سب پر یہودیت اور نصرانیت و مجوسیت کا اس قدر غلبہ تھا اور اس زمانہ کے مسلمانوں کو ان کی تقلید کا اس قدر شوق غالب تھا کہ اگر آج ہم اس زمانہ کی جمع کردہ احادیث یا اس وقت کے لوگوں کی تفسیر کو غور سے پڑھیں تو اسلام کی بڑی مسخ شدہ صورت ہمارے سامنے آتی ہے، اس شغف نے کلام الٰہی کی بعض آیات سے انکار کرایا (مثلاً رجم زانیہ کی آیت) اور بعض ایسی باتوں کی لچر تاویل پر ان کو متوجہ کیا جس کی تائید وہ یہودیوں کے نوشتوں میں پاتے تھے، جیسے دار الحرب میں سود کا جواز، قرآن شریف نے حضرت ابراہیم کے والد کا نام آذر بتایا ہے، یہودیوں نے ہمارے مفسرین کو سوجھایا کہ یہ صحیح نہیں ۔ بلکہ بقول توریت ابراہیم کے باپ کا نام تیرہ تھا، جھٹ انھوں نے باپ کی تاویل یوں کردی کہ عربی میں "اب" چچا کے معنی میں بھی آتا ہے، لیکن اگر ان کی تحقیق وسیع ہوتی تو وہ خود (EUSEBIUS) کی تحریر میں آذر کا نام پاتے اور قرآن کی نسبت ان کو غیر صحیح ہونے کا گمان نہ ہوتا جس کی وہ تاویل کرنے بیٹھے ۔

انسان کیوں نبی ماننے کے لئے مکلف ہے، حقیقت یہ ہے کہ الٰہیات اور ایک حد تک اخلاق کا علم انسان کے معمولی سمجھ سے بالاتر ہے اور ضروری ہے کہ ان باتوں کا کوئی ایسا معلم خدا کی طرف سے مامور ہو جو حکماً ہم کو اس کا معتقد و پابند بنا دے ۔

محض یہ تصور کر لینا کہ اس دنیا کا خالق ایک غیر مفہوم ہستی ہے، مذہب کے لئے کافی نہیں، وہ خدا پرستی ہے جس پر مذہب کی بنیاد ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خدا پرستی کے لئے خداشناسی شرط ہے مگر فلاسفہ خداشناسی کو خدا پرستی کی شرط نہیں جانتے ۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ، باوجودیکہ بعض حکمائے یونان و مصر و بابل و ہند کو الٰہیات میں خاصہ درک تھا انھوں نے خدا پرستی کا کوئی مسلک نہیں چھوڑا ۔

یہی وہ خدا پرستی ہے جسے اسٹوئک فلاسفہ نے الٰہیات معاشیات سے تعبیر کیا ہے اور نبی کا سب سے بڑا کام یہی تھا کہ انسان کے قلب کو اس خلجان سے مطمئن کردے کہ اس کا انجام کیا ہوگا، کیونکہ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ اپنی ابتدا اور انتہا پر غور کرے یعنی خدا کے اعتقاد کو انسانی اعمال میں داخل کرے ۔ یقیناً اس خیال کو کہ خدا منزہ ازلی اور محض نور ہے انسان کو کسی نتیجہ پر نہیں پہونچاتا ۔ الفاظ و خیالات نہایت ہی ارفع و اعلیٰ ہیں ۔ مگر عملی صورت میں سوا خالی ہاتھ مارنے کے کوئی بات نہیں اس لئے نبی اس حیثیت سے اس ازلی نور کا عکس ہے اور نبی کے بغیر خدا کا ادراک ہم سے نہیں ہو سکتا۔ اب صرف سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ نبی کی شناخت کیا ہے، ہم مانتے ہیں ۔ یہ سوال سب سے زیادہ اہم ہے اور اس کی اہمیت اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جبکہ نبوت کا سرچشمہ عرصے

سے ہم پر بند ہے ۔ حتیٰ کہ اگر ایک شخص اس وقت دنیا میں ان تمام معیار پر پورا اُترے جو ہم نبی کے لئے ضروری جانتے ہیں، بلکہ معجزے پر بھی قدرت حاصل ہو تو ہم اس کو نبی ماننے کے لئے طیار نہ ہوں گے نہ کہ ایسا نبی جس کو ہم صرف روایت سے جانتے ہیں اور کبھی اس کو دیکھا نہیں اور روایت میں واقعیت اور اشتباہ دونوں کی گنجایش ہے جو امتدادِ زمانہ سے بڑھتی ہی گئی ہیں ۔ لامحالہ نبوت کے لئے کوئی اور صورت ہوگی جس کا ثبوت ہر زمانہ میں ممکن ہو سکے اور یہ محض اس کا کلام یا پیغام ہے، چنانچہ آپ قرآن کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی کس نبی کی کتاب ہے جس کی آواز انسان کو صداقت سے موثر کر سکتی ہے اور جس کا حامل نبی کہلانے کا مستحق ہے

معاد - دوزخ و جنت

دُنیا کے تمام مذاہب معاد کی نسبت ان تین خیال پر متفق ہیں :-

(۱) روزِ قیامت ——— (۲) حشر ——— (۳) سزا و جزا ———

یعنی ایک دن تمام انسان خدا کے سامنے حاضر ہوں گے ۔ خدا ان کے درمیان فیصلہ کرے گا کہ ان کے اعمال کے مطابق ان کو بہشت و دوزخ میں بھیجے گا، بہشت وہ جگہ ہے جہاں دُنیا کی تمام مسرتیں جن کا ہم تصور کر سکتے ہیں، نیک انسانوں کو عطا ہوں گی اور دوزخ وہ جگہ ہے جہاں بدکردار سخت عذاب سے دوچار ہوں گے، سب سے زیادہ صراحت قیامت، دوزخ و بہشت کی قرآن کی آیات مکیہ میں ہے، تالمود، بائبل اور مجوسیوں میں بھی یہی خیالات ہیں، اگرچہ فروع میں کچھ فرق ہے اور دوزخ کی سختیوں کو تقریباً ان تمام کتب نے آگ میں جلنے سے مشابہت دی ہے، بلکہ قرآن میں اس کثرت سے جہنم کی آگ کا ذکر ہے کہ اس کے لئے اور کوئی تاویل کی گنجایش باقی نہیں رہتی اور اس کی ہولناکی سے انسان کے بدن میں رعشہ پڑ جاتا ہے اور خدا کی نسبت یہ وہم گزرتا ہے کہ وہ ہماری دُنیا کے ایک جابر اور بدلہ لینے والے خونخوار کینہ پرور شخص کے مانند ہے، جو ہماری کمزوریوں کو اس سختی سے گرفت کرے گا، گویا کہ ہمارے ان اعمال نے اس کو کسی طرح کا نقصان پہونچایا ہے اور اس کے دل میں ہماری طرف سے ایسا بغض پڑ گیا ہے کہ ابدالآباد تک ہم کو جلا کر خاک سیاہ کرنے پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا، جہنم کی ہولناکیوں کا ذکر قرآن میں اگر کوئی اور معنی نہیں رکھتا تو ہم مجبوراً اس بات کا اعتراف کریں گے کہ عقل و فطرت انسانی ایسے بغض رکھنے والے اور ہم کو جلا کر تسکین پانے والے خدا سے ضرور نفرت کرے گی اور اس حیثیت سے یا تو خدا کی صفات رحم و کرم بے معنی ہو جائیں گے یا پھر خدا کی نسبت یہ تصور لامحالہ ہوگا کہ اس کا یہ قہر اس کے خود ضعف و کمزوری کا نتیجہ ہے اور گویا انسان اس کا مدمقابل دشمن ہے ۔

جہاں تک قیامت کا سوال ہے وہاں تک عقل اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی مشکل نہیں پاتی کیونکہ ممکن ہے قدرت کسی وقت دُنیا کو غیر آباد اور ویران بنا دے ۔ جبکہ یہ عظیم الشان پہاڑ ذرے ذرے ہو جائیں ۔ اور ستارے آفتاب و ماہتاب بلکہ تمام نظام عالم درہم برہم یا آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں، اس کے بعد پھر ایک نئے آسمان اور نئے زمین کی بنیاد پڑے اور اس عالم میں پھر نئی زندگی شروع ہو ۔

مگر عقل جس امر سے منحرف ہوتی ہے وہ سزا و جزا کی صورت ہے جو الہام نے بیان کی ہے (اور بروایات احادیث) جن کی بنا پر خدا تعالےٰ ہمارے پائجامے اور ازار کے لانبے ہونے پر بھی آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور محض اس قصور پر ہم کو دوزخ میں جھونکنے کے لئے طیار ہو جاتا ہے اس باب میں علامہ شبلی کی کتاب الکلام کا اقتباس ملاحظہ ہو :-

"سزا و جزا کے متعلق تمام اہلِ مذاہب کا یہ خیال تھا اور آج بھی ہے کہ انسان جب خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا تو خدا اس سے ناراض ہو جاتا ہے، اور چونکہ دنیا دارالعمل ہے اس لئے یہاں تو انسان کو سزا نہیں ملتی، لیکن جب قیامت

میں خدا مسند حکومت پر متمکن ہوگا تو تمام معاملات اس کے حضور میں پیش ہوں گے اور خدا حسب مراتب لوگوں کو ان کی نافرمانیوں کی سزا دے گا، اس طرح جن لوگوں نے اطاعت و فرمانبرداری کی ہے ان کو علی قدر مراتب انعام ملیں گے۔"

یہ خیال عام طبایع کے بالکل مناسب ہے اور عام لوگوں کو نیکی کی طرف مایل کرنے اور برائی سے روکنے کے لئے اس سے بہتر کوئی طرز نہیں ہو سکتا، لیکن یہ عذاب و ثواب کی اصلی حقیقت نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت کے عام فہم کرنے کا ایک پیرایہ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عالم جسمانیات میں اسباب و علل اثر و تاثر کا سلسلہ ہے، مثلاً سنکھیا قاتل ہے، گلاب محرک نزلہ ہے، املتاس مسہل ہے، اسی طرح یہ سلسلہ روحانیات میں بھی قایم ہے، نیک و بد جس قدر افعال ہیں ان کا نیک و بد اثر روح پر مرتب ہوتا ہے، اچھے کاموں سے روح کو انبساط ہوتا ہے، برے افعال سے انقباض اور آلودگی اور نجاست کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ وہ نتایج جو اس سے جدا نہیں ہو سکتے فرض کرو کہ ایک شخص نے کسی کی ایک چیز چرائی، اب اگر وہ شخص جس کی وہ چیز تھی معاف بھی کر دے تو چوری کرنے سے اس کی عزت پر جو داغ آگیا ہے وہ کسی حالت میں ضایع نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ اچھی روح میں جو سعادت کا اثر پیدا ہوتا ہے اور برے کاموں سے جو شقاوت حاصل ہوتی ہے اسی کا نام عذاب اور ثواب ہے اور یہ خود ان افعال کا لازمی اثر ہے۔ امام غزالی مضنون علی غیر اہلہ میں لکھتے ہیں :-

"امر و نہی کی خلاف ورزی پر جو عذاب ہوگا، اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کو غصہ آئے گا اور وہ انتقام لے گا، بلکہ اسکی مثال یہ ہے کہ جو شخص عورت کے پاس نہ جائے گا، اس کے اولاد نہ ہوگی، طاعت و معصیت کی وجہ سے قیامت میں جو عذاب و ثواب ہوگا اس کی بالکل یہی مثال ہے۔ لہٰذا یہ سوال کرنا کہ گناہ سے عذاب کیوں ہوتا ہے، گویا یہ سوال کرنا ہے کہ زہر کھانے سے جاندار کیوں مر جاتا ہے۔"

خدا نے جن باتوں کا حکم دیا ہے، یا جن باتوں سے روکا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ جس طرح ایک طبیب کسی بیمار کو دوا کھانے اور مضر چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مریض اگر طبیب کے حکم کے موافق عمل نہیں کرتا تو اس کو ضرر ہوتا ہے، یہ ضرر صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مریض نے بد پرہیزی کی لیکن عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ مریض نے چونکہ حکیم کی نافرمانی کی، اس لئے ضرر ہوا، حالانکہ ضرر کی اصلی علت بد پرہیزی ہے، فرض کرو کہ طبیب بد پرہیزی سے منع بھی نہ کرتا تاہم بد پرہیزی کرنے سے ضرر ہوتا، اسی طرح خدا گناہوں کے ارتکاب سے منع نہ بھی کرتا، تاہم ان گناہوں کے ارتکاب سے روح کو وہی صدمہ و عذاب ہوتا۔

ملاحدہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ خدا کو گناہوں پر عذاب دینے سے کیا حاصل۔ یا سزا یا انتقام وہ شخص لیتا ہے جس کو کسی قسم کا نقصان پہونچا ہو یا پہونچنے کا اندیشہ ہو اور خدا اس سے بری ہے۔ اگر تمام عالم فسق و فجور میں پڑ جائے یا نماز روزہ بجا نہ لائے تو اس خدا کا کیا بگڑتا ہے۔ اس صورت میں انتقام لینا بے فایدہ ہے، ملاحدہ یہ بھی کہتے ہیں کہ درحقیقت تمام اہل مذاہب نے خدا کا تصور بالکل انسانی حیثیت سے کیا ہے اور چونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بادشاہوں کو احکام کی نافرمانی سے سخت طیش و ملال ہوتا ہے اور وہ مجرم کو نہایت سخت سزائیں دیتے ہیں، اس لئے اہلِ مذاہب نے خدا کی نسبت بھی یہی خیال قایم کیا کہ وہ گناہوں سے ناراض ہوتا ہے اور قیامت میں گنہگاروں کو دوزخ میں گوناگوں عذاب دے گا، لیکن عذاب و ثواب کی جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اس کو ملحوظ رکھئے تو ملاحدہ کا اعتراض خود بخود اٹھ جاتا ہے۔

اسلام نے عذاب و ثواب کے متعلق عام طور پر اگرچہ بیان کا وہی پیرایہ اختیار کیا ہے جو تمام اہلِ مذاہب کا تھا اور عام طبایع کیلئے

وہی طریقہ ناگزیر بھی تھا، لیکن اس باب میں اسلام کو جو ترجیح ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے اصل حقیقت بھی صراحتہً وکنایتہً ظاہر کردی، یہی وہ خصوصیت ہے جو ہر موقع پر اسلام کو تمام مذاہب سے ممتاز کرتی ہے، تمام دیگر مذاہب میں صرف عوام کی تلقین و ہدایت کا لحاظ ہے، اصل حقیقت سے یا خود بانیانِ مذہب بے خبر تھے یا اگر وہ باخبر تھے تو وہ خواص کی تعلیم و تربیت کو اپنا مقصد نہیں قرار دیتے تھے بخلاف اس کے اسلام تمام دُنیا کی ہدایت کے لئے آیا، جس میں عالم وجاہل، احمق و دانا، عارف و عامی، زاہد و صوفی، ظاہر پرست وکلیم سب داخل تھے۔

عذاب وثواب اور معاد کی اصل حقیقت کی طرف قرآن مجید میں جابجا اشارے ہیں، بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں:۔

"کلّا لو تعلمون علم الیقین لترونّ الجحیم"۔ (ہاں اگر تم کو علم ویقین ہوتا تو تم دوزخ کو دیکھ لیتے)

امام غزالی جواہر القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔ "ای انّ الجحیم من باطنکم"۔ (یعنی دوزخ خود تمھارے اندر موجود ہے)

ایک اور مقام پر ہے:۔ "ویستعجلونک بالعذاب وانّ جھنّم لمحیطۃٌ بالکٰفرین"۔ (کفار تجھ سے کہتے ہیں کہ عذاب جلدی آئے، حالانکہ دوزخ نے کافروں کو ہر طرف سے چھپا لیا ہے)

امام غزالی اس آیت کے متعلق جواہر القرآن میں لکھتے ہیں:۔ "ولم یقل انھا ستحیطُ بل قال ہی محیطۃٌ"۔ (خدا نے یہ نہیں کہا کہ دوزخ آئندہ محیط ہو جائے گی، بلکہ یہ کہا کہ ابھی اس وقت محیط ہے۔)

ایک اور جگہ قرآن مجید میں ہے:۔

"انّا اعتدنا للظّٰلمین نارًا احاط بھم سرادقھا"۔ (ہم نے ظالموں کے لئے ایسی آگ مہیا کر رکھی ہے جس کے پردوں نے ظالموں کو گھیر لیا ہے)۔ امام غزالی اس کے متعلق کہتے ہیں:۔ "ولم یقل یحیط بھم"۔ (خدا نے یہ نہیں کہا کہ آئندہ گھیرے گی)

امام صاحب ان آیتوں کی یہ تفسیر لکھ کر کہتے ہیں:۔

"قال لم تفھم المعانی کذالک فنیس لک نصیب من القرآن الا فی قشورہ قشورہ عمالیس فی البھیمہ نصیب من البراۃ فی قشرہ"۔ (تو اگر تم مطالب کو اس طرح نہیں سمجھتے تو تم کو قرآن سے اس کا صرف چھلکا ہاتھ آیا ہے، جس طرح بہائم کو گیہوں میں سے صرف بھوسی ہاتھ آتی ہے"۔ (العباس از الکلام)

مگر امام غزالی کی ان تاویلات سے قرآن مجید کی وہ آیتیں جن میں دوزخ کا نقشہ ایسی صورت میں کھینچا گیا ہے کہ دوزخیوں کے کپڑے تارکول سے پوتے گئے ہیں اور وہ مشعل کی طرح جل رہے ہوں گے اور جب ان کی موٹی کھال جل جائے گی تو اللہ نئی کھال پیدا کردے گا، دوزخ کے اندر وہ شدت عذاب سے چیخیں گے، چلائیں گے، وہ زنجیروں سے بندھے ہوں گے اور ان پر آتشیں گرز پڑ رہے ہوں گے۔ غرضکہ قرآن کا نقشہ ایسا ہے جو اس قسم کی تاویلات سے محو نہیں ہو سکتا، یہ ضرور ہے کہ خود دوزخ، برزخ، بہشت، جہنم، فردوس، عدن وغیرہ کے الفاظ مجوسیوں، اور یہودیوں کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ اور قرآن نے بہشت و جہنم میں نہ صرف پارسیوں اور یہودیوں کی بہشت و دوزخ کی تعریف زیادہ فصاحت سے کی ہے بلکہ انھیں کے اصطلاحی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ جہنم دراصل فلسطین میں ایک مقام تھا، جہاں پچھلے زمانے میں "ملوک" (MALOCH) دیوتا کے سامنے چھوٹے چھوٹے بچے قربان کئے جاتے تھے اور بعد کو یہودیوں کے زمانہ میں وہاں مجرمین کی لاشیں پھینکدی جاتی تھیں۔ یہ ایک مرکب لفظ "جے" یا "گے" بہ معنی وادی اور "ہنام" اسم معرفہ سے بنا ہے۔ دوزخ و برزخ و فردوس

وبہشت تو قطعی عجمی الفاظ ہیں، عدن اس زمین کا نام ہے جو دجلہ اور فرات کے درمیانی نشیب میں واقع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عرب میں بہشت و دوزخ کا تصور اگر پہلے سے موجود تھا تو وہ مجوسیوں، یہودیوں اور نسطوری عیسائیوں کے ذریعہ سے آیا تھا اور قرآن نے اس خیال میں کوئی کمی نہیں کی، بلکہ اس کو اور ہیبت ناک طریقہ سے ظاہر کیا تاکہ اجڈ اور سخت دل میں خشیت پیدا ہو، ایسا ہوا ہے کہ جب تک قوموں کی اصطلاح ان کے پرانے عادات و خیالات کے ذریعہ سے ممکن ہوسکتی تھی یا ان کے وہ خیالات کفر و شرک کو نہیں پہونچتے تھے، یا ان سے اخلاق و نظام معاشرت و تمدن میں کوئی خلل نہ واقع ہوتا تھا تو الہام ان کے افکار و عادات سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا، مثلاً عرب کے لئے حج وعمرہ بیادگار سیدنا حضرت ابراہیم یا حبشیوں کی پسپائی کی قومی یادگار جو وہ ہر سال رمی جمار کی صورت میں مناتے تھے، یا اپنے مورثِ اعلیٰ حضرت اسمٰعیل وحضرت ہاجرہ بیابان مکہ میں پانی کی تلاش میں سرگرداں پھرنا اور چاہ زمزم کا دریافت کرنا جو "سعی صفا و مروہ" کی صورت میں کرتے تھے، یا سور کے گوشت سے پرہیز کرنا، یا عقیقہ وغیرہ، الہام نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا، صرف اتنا کیا کہ جہاں کہیں ان قومی عادات میں شرک و کفر کا میل آگیا تھا ان کو نکال دیا، اسی طرح یہودیوں میں رسم بخور و قربانی جو کفار کنعان کا پرانا طریقۂ عبادت تھا، اس سے کوئی تعرض نہ کیا گیا، بلکہ صرف بتوں کے آگے سے ہٹا کر ان عبادات کو ایک غیر مرئی خدا کی طرف رجوع کر دیا مگر واقعہ یہ ہے کہ: ——— عرب جاہلیت میں حیات بعد الممات کا کوئی عقیدہ نہیں ملتا اور اس خیال کی ابتدا عرب میں اسلام ہی سے ہوئی ہے، اس لئے الہام نے بہشت و دوزخ کے اصطلاحی الفاظ و تعریف میں ان ہی باتوں پر اکتفا کیا ہے، جو عرب یہودیوں اور مجوسیوں سے سُن چکے تھے اور بقول علامہ شبلی روحانیت کو جسمانیت کے پیرایہ میں ادا کیا ہے اور یہ طریقہ تمام مذاہب میں مشترک ہے، انسان صرف انھیں چیزوں کا تصور کر سکتا ہے جو اس نے حواس سے محسوس کی ہوں، اس لئے جب ان چیزوں کا بیان کرنا ہو جو آیندہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور تصور سے بالاتر ہیں تو ضرور ہے کہ ان کو جسمانیات کے پیرائے میں ادا کیا جائے مثلاً موت کے بعد جو رنج و راحت ہوگا، اس کو بجز اس کے کہ باغ و انہار اور کژدم و مار سے تعبیر کیا جائے اور کیا طریقہ ہے۔ ابن تیمیہ ٹھیٹ ظاہر بیں ہیں، لیکن ان کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ " پھر خدائے پاک نے ہم کو اس آرام و رنج کی خبر دی جس کا قیامت میں وعدہ کیا ہے اور وہ اس طرح کہ طعام و شراب، ازدواج وغیرہ کا ذکر کیا تو اگر اس قسم کی خبروں سے ہم دنیا میں واقف نہ ہو چکے ہوتے تو ان موعودہ چیزوں کو کیونکر سمجھ سکتے، تاہم ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ چیزیں دُنیا وی چیزوں کے مانند نہیں ہیں، یہاں تک کہ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ دُنیا و آخرت کی چیزوں میں سوائے نام کے کسی چیز میں مشارکت نہیں"۔

مگر سوال یہ ہے کہ یہ مسرت و اذیت روحانی ہو یا جسمانی، ہنگامی ہوگی یا دوامی، بہشت کیلئے دوامی ماننا تو فطرت انسانی کیلئے قابل قبول ہے مگر دوزخ کو دوامی ماننا خدا کی مصلحت و حکمت کے خلاف معلوم ہوتا ہے، اگر ہم دنیا کی مثالوں سے عالم ارواح کا تصور کریں تو یہ بات نہایت واضح اور بین ہے کہ انسان ابدالآباد تک کرب و تکلیف کا متحمل نہیں ہوسکتا اور نہ اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے، چنانچہ جب انسان پر سختی حد سے زیادہ ہوتی ہے تو موت اس سختی سے نجات دینے کے لئے آموجود ہوتی ہے، اگر عالم مابعد الموت ہماری موجودہ زندگی کے سلسلہ میں ہے تو اس کے عواقب و نتائج یہ ہونے چاہئے کہ جو ہستیاں دنیا میں اپنے افعال خبیثہ و مناہیات و منکرات سے آلودہ تھیں، ان کے لئے دوزخ ایک قسم کی مصلح ہو جہاں وہ روح کو آلایشوں سے پاک کر کے بہشت میں داخل ہونے کے قابل بن سکیں، یہ صورت دل کو بہت لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، مگر قرآن نے دوزخ وبہشت میں " خالدین فیہا " کا ایک ہی جملہ استعمال کیا ہے جس کے معنے ہمیشگی کے ہیں، ایسی صورت میں سب سے پہلا سوال تو یہ ہوگا کہ آیا دوزخ کے مستوجب محض کفار ہی ہیں، یا وہ مسلمان بھی ہیں جن کے اعمال کفار کی طرح

ہیں، اگر محض لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اقرار سے کافر و مسلم میں تفریق ہو سکتی ہے تو کیا وہ کروڑوں انسان جو امریکہ و چین، یورپ و افریقہ میں بسے ہوئے ہیں اور جن کے مقابل مسلمان دس فی صدی بھی نہیں، کیا وہ سب دوزخ کے کندے ہیں؟ ایسی صورت میں تو خدا کا اصل مقصد آفرینش یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انسان کو اس خوبی و حکمت سے بنانا کہ وہ بہترین مخلوقات بلکہ خلیفۃ الارض کہلائے محض اس لئے ہے کہ وہ سب کے سب آگ کے سپرد ہو جائیں، پھر جب غیر مسلم کا آخری ٹھکانا صرف دوزخ ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر مسلم کے درمیان نیکی و بدی کی جزا و سزا کہاں پوری کی جائے گی جب کہ وہ سب بلا تفریق دوزخ میں رہیں گے، اس لئے دل تو یہ کہتا ہے کہ بہشت و دوزخ کی آبادی کے لئے مسلم و غیر مسلم کی تقسیم مناسب نہیں اور نہ قرین انصاف ہے، کوئی اور تقسیم ہونی چاہئے جو محض اعمال پر مبنی ہو اور سب کا آخری ٹھکانا بہشت ہو کسی کو جلد کسی کو بدیر۔

امام جاحظ کا یہ قول قابلِ غور ہے کہ دوزخ کا عذاب مقابلۃً عذاب معلوم ہوگا، یعنی اہل دوزخ کی سختیاں اہل بہشت کو سختیاں معلوم ہوں گی اور اہلِ دوزخ کو اہلِ بہشت کی حالت قابل رشک معلوم ہوگی، اس کی مثال یوں لیجئے کہ:۔ دو شخص ایک پر فضا مقام پر مقیم ہیں۔ جہاں آبشار ہے، ہرے بھرے میدان ہیں، نغمہ ہے اور ہر قسم کے لذائذ جو حواس خمسہ کو بھلے معلوم ہو سکتے ہیں موجود ہیں مگر ایک شخص دنیا کی آلام سے بے فکر ہے اور دوسرے کو یہ فکر ہے کہ چند روز کے بعد اس کو پھانسی ہو جائے گی یا اس کا دیوالہ نکل جائے گا یا اسی قسم کی کوئی اور سخت فکر و پریشانی اس کو دامنگیر ہے تو پہلے شخص کی راحت یقیناً دوسرے شخص کی راحت نہیں، حالانکہ دونوں ایک ہی قسم کے مناظر سے فایدہ اٹھا رہے ہیں، ایک بے غم ہے مگر دوسرا فکر میں ایسا غلطاں و پیچاں کہ اس کو یہ سب مناظر کاٹے کھاتے ہیں۔ تو در اصل کافر کی دوزخ یہی ہے کہ اس میں لطف و مسرت کی صلاحیت ہی باقی نہ رہے گی۔ وہ اپنے اعمال و عقاید کی بھیانک صورتوں کو دیکھکر پیچ و تاب کھا رہا ہے اور جس طرح ہم کشمیر جنت نشان میں بیٹھ کر صحرائے افریقہ و عرب کے بادِ سموم میں جھلسنے والے انسانوں یا برفانی تودوں میں پناہ لینے والی قوموں پر رحم کھاتے ہیں، مگر خود وہ لوگ جو انھیں عناصر سے اٹھے ہیں ان کا احساس راحت و تکلیف یقیناً وہ نہیں ہے جو ہمارا ہے، یا جس طرح ایک نفیس طبیعت انسان اور ایک حلال خور کے حسیات میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ کہ ایک شخص کا کام دوسرے کے لئے عذاب ہے اسی طرح بدکار و بد اعمال لوگوں کی سزا یہی ہے کہ ان کے خود اعمال ان کے احساسات و ذہنیت کو اس طرح خراب کر دیں گے کہ وہ اپنے اندرونی کرب سے اپنے لئے ایک دوزخ بنالیں گے۔

ہم آگ کے کیڑے کو آگ میں دیکھ کر یہ گمان کرتے ہیں کہ اس کو آگ کی وجہ سے تکلیف ہے جیسے ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کو کوئی تکلیف نہیں۔

معاد کے بارے میں نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس زمین پر دوزخ اور بہشت کا وجود ہوگا اس کا جغرافیہ کیا ہوگا، اس کے حدود اربعہ کیا ہوں گے، اس کا رقبہ کیا ہوگا، دونوں ایک دوسرے سے کس طرح جدا ہوں گے کہ بہشتی اپنے آرام کی جگہ سے دوزخی کی حالت کا موازنہ نہ کر سکے گا، تکوین سے لیکر آخر تک جتنے انسان دنیا میں گزرے ہیں ان کی جماعت کہاں سمائے گی

اسلامی عبادات

نماز، روزہ اور زکوٰۃ اسلام کے رکنِ عظیم ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان کے عملی طریقوں کے لئے قرآن نے اس قدر اختصار و ابہام سے کام لیا ہے کہ سوا اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ قرآن کا مقصد صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کے سامنے اسلام پیش کرنے کا ہے، کیونکہ دنیا کی مختلف قوموں کے طبائع ایسے واقع ہوئے ہیں کہ ان پر ایک

مخصوص زبان وطریق کے ساتھ عبادت شاق ہوگی اور اگر وہ بجا بھی لائیں گے تو بغیر رجوع قلب کے۔ آرکٹک کا رہنے والا اسکیمو جو برف کے مکان اور نصف سال کی رات میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ یقیناً عرب کے طریقہ پر عبادت کرنے، نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے معذور ہے، اس لئے قرآن کا صاف وصریح منشاء عملی طریقوں پر سکوت اختیار کرنے کا یہی تھا کہ عبادت محض خدائے واحد کی ہو کیونکہ وہ مذہب کا ایک رکنِ عظیم ہے۔ خواہ وہ کسی طریقہ سے ہو۔ اس خیال کی تائید خود قرآن کی ان آیتوں سے ہوسکتی ہے:-

(۱) "ان الذین آمنو والذین ہادو والنصاریٰ والصائبین والمجوس من آمن باللہ و عمل صالحاً فلاخوف علیہم ولاہم یحزنون"۔

(۲) "لکل امتہ مناسکم فاسکوہ فلاتنازعنک فی الامر وادع الیٰ ربک انک لعلی ہدی مستقیم"۔

(۳) "قل یااہل الکتاب تعالوا الیٰ کلمتہ سواء ابیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولانشرک بہ شیئاً ولایتخذ بعضنا بعض ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولو اشہد بانا مسلمون"۔

برخلاف اس کے دنیاوی ومعاشرتی احکام جن کا مقصد عربوں کو اصول تمدن سکھانے کے سوا دوسرا نہ تھا، مثلاً طلاق، وراثت وحجاب واعتاق وغیرہ، ان کی نسبت قرآن نے کافی وضاحت سے کام لیا ہے۔ لہٰذا کوئی قومی مذہب، قومی شریعت کے تھا عمومیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور نہ کبھی وہ ایک قوم سے باہر پھیل سکتا ہے، جب تک وہ سب مل کر خود علٰحدہ ایک قوم نہ بن جائیں اور اگر یہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ جس زمانہ میں قرآن نازل ہوا تھا اس وقت کے عرب عموماً سوتے وقت اپنے سارے کپڑے اُتار کر برہنہ سوتے تھے اور اس زمانہ کی عرب کی عورتیں بالکل اسی طرز پر رہتی تھیں جس طرح موجودہ زمانہ کی بدوی عورتیں، ان کو جھانجھ یا پازیب پہننے کا شوق تھا اور اس کے ساتھ وہ اپنا سینہ کھلا رکھتی تھیں۔ اب دیکھو قرآن کا اگر ہر ایک حکم ہر زمانے اور ہر قوم پر فرض سمجھا جائے تو ان احکام کی تعمیل کہ سوتے وقت بلا اذن کسی کی خلوت میں نہ جاؤ، یا عورتوں کے لئے جب وہ چلیں تو اپنی پازیبوں میں آواز پیدا کرتی ہوئی نہ چلیں اور اپنے سینوں کو دوپٹوں سے بند رکھیں، ان قوموں کے لئے جن کی یہ قومی عادتیں نہیں ہیں ایک فضول حکم ہوگا۔ اسی پر وضو وطہارت کے دوسرے احکام کو قیاس کرلو۔ اسی اصول سے یہ بات بھی واضح ہوجائے گی کہ شریعت اسلامی میں، چوری، زنا، قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان میں کہاں تک عرب کی رسم ورواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ موجودہ صورت میں اختلاف زمانہ کے لحاظ سے کہاں تک اجتہاد کی ضرورت ہے۔

غالباً حضرت شاہ ولی اللہ نے متاخرین میں سے اس نکتہ کو ایک حد تک سمجھا ہے، چنانچہ وہ حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"ولہذا المعنے اختلف شرائع الانبیاء، والراسخ فی العلم یعلم ان الشرع لم یجی فی النکاح والطلاق والمعاملات والزینۃ واللباس والقضاء والحدود۔ بما لم یکن لہٗ بہ علم او تیر دون فیہ اذکلفو، نعم انما وقع اقامۃ المسموع والصحیح السقیم"۔

(حجۃ البالغہ)

اور اسی وجہ سے انبیاء کی شریعتیں مختلف ہیں اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ جانتے ہیں کہ شریعت نے نکاح، طلاق ومعاملات آرائش، لباس، قضا اور تعزیرات وغیرہ میں کوئی ایسی بات پیش نہیں کی جسکو وہ لوگ پہلے سے نہ جانتے ہوں یا ایسے مسئلے جنکو قبول کرنے میں ان کو پس وپیش ہو، ہاں یہ ضرور ہوا کہ جو کجی تھی وہ سیدھی کردی گئی اور جو خرابی تھی رفع کردی گئی۔

آگے پھر فرماتے ہیں :-

" فکذالک یعتبر فی الشرائع علوم مخزونتہ فی القوم و اعتقادات تنجاری فیہم ولذالک نزل تحریم اللحوم الابل و البانہا علیٰ بنی اسرائیل دون بنی اسمٰعیل ولذالک کان الطیب والخبیث والمطاعم مفوضاً الیٰ عادات العرب ولذالک حرمت نبات الاخت علینا ودون الیہود "

اسی طرح شریعت میں ان علوم واعتقادات وعادات کا لحاظ کیا جاتا ہے جو قوم میں جاری وساری ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل پر حرام ہوا، اور بنی اسمٰعیل پر حرام نہ ہوا، اور یہی وجہ ہے کہ کھانوں میں پاک اور نجس کی تفریق عرب کے مذاق پر محمول کی گئی اور یہی وجہ ہے کہ بھانجی سے شادی کرنا ہمارے مذہب میں حرام ہے اور یہود کے ہاں نہیں۔

اسی بحث میں آگے چل کر لکھتے ہیں :-

" واعلم ان کثیراً من العادات والعلوم الکامنتہ یتفق فیہا العرب والعجم وجمیع سکان الاقالیم المعتدلۃ واہل الامزجتہ القابلۃ الاخلاق الفاضلۃ کالحزن لمیتھم والاستحباب الرفق بہ کالفخر بالاحساب والانساب فتلک العادات والعلوم احق الاشیاء بالاعتبار ثم بعدہا عادات وعقاید تختص بالمبعوث علیہم فتغیر تلک ایضاً "

جاننا چاہئے کہ بہت سے مراسم اور علوم ایسے ہیں جن میں تمام عرب وعجم اور تمام معتدل ممالک کے رہنے والے اور تمام وہ لوگ جن میں اخلاق فاضلہ کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے سب متفق ہوئے ہیں، مثلاً مردہ کا غم کرنا اور ان پر رحم کھانا یا مثلاً حسب ونسب پر فخر کرنا تو یہ مراسم اور یہ اصول سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں، ان کے بعد وہ مراسم ہیں جو خاص اسی قوم میں جاری ہیں جس پر وہ پیغمبر مبعوث ہوا ہے تو ان مراسم کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔

پیغمبر جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے اس کی شریعت میں اسی قوم کے عادات اور خصوصیات کا خاص طریقے پر لحاظ ہوتا ہے، لیکن جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہو اس کے طریقہ تعلیم میں یہ اصول چل نہیں سکتا، کیونکہ نہ تو وہ تمام دنیا کی قوموں کے لئے الگ الگ شریعتیں بنا سکتا ہے اور نہ تمام قوموں کی عادات اور خصوصیتیں باہم متفق ہو سکتی ہیں۔ اس لئے وہ پہلے اپنی قوم کی تعلیم وتلقین شروع کرتا ہے اور اپنے آپ کو محاسن اخلاق کا نمونہ بنا دیتا ہے اور یہ قوم اس کے اعضا اور جوارح کا کام دیتی ہیں، اور اسی کے نمونہ پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرنا چاہتا ہے۔ اس کی شریعت میں اگرچہ زیادہ تر قواعد اور اصول عام ہوتے ہیں جو تقریباً تمام دنیا کے لوگوں میں مشترک ہوتے ہیں۔ تاہم اپنی قوم کی عادات اور خصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کی بنا پر قایم ہوتے ہیں، ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ اس پر چنداں زور دیا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے صفحہ ۱۲۳ میں اس اصول کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے :-

"وہذا الامام الذی یجمع الامم علی ملة واحدة تحتاج الی اصول الاخری غیر الاصول المذکورة فیما سبق منہا ان یدعو قوما الی السنة الراشدة ویزکیہم ویصلح شانہم ثم تتخذہم بمنزلة جوارہ"۔
"وذالک لان ہذا الامام نفسہ لا نہایٰ منہ مجاہدة امم غیر محصورة و اذا کان کذالک وجب ان یکون مادة شریعتہ ماہو بمنزلة المذاہب الطبعی لاہل الاقالیم الصالحة عربہم و عجمہم ثم ماعند قومہ من العلم و الاتفاقات و یراعی فیہ حالہم اکثر من غیرہم ثم یحمل الناس جمیعاً علی اتباع تلک الشریعة لانہ لاسبیل الی ان یفوض الامر الی کل قوم اوالی ائمتہ کل عصر ان لایحصل منہ فائدة التشریع اصلاً و لا الی ان ینظر ماعند کل قوم ویمارس کلا منہم فیجعل لکل شریعة فلا احسن ولاایسر من ان یعتبر فی الشعائر والحدود والارتفاقات عادة قومہ المبعوث منہم فلا یضیق کل التضیق علی الآخرین الذین یاتون بعد"۔

یہ امام جو تمام قوموں کو ایک مذہب پر لانا چاہتا ہے اسکو اور چند اصول کی "جو اصول مذکورۂ بالا کے علاوہ ہیں" حاجت پڑتی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست پر بلاتا ہے اسکی اصلاح کرتا ہے اس کو پاک بناتا ہے ....
یہ اس لئے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ تمام قوموں کی اصلاح میں جان کھپائے اس لئے ضرور ہوا کہ اسکی شریعت کی اصلی بنیاد تو وہ ہو جو تمام عرب و عجم کا فطری مذہب ہو اسکے ساتھ اس قوم کی عادات اور مسلمات کے اصول بھی لئے جائیں اور ان کے حالات کا لحاظ بہ نسبت اور قوموں کے زیادہ تر کیا جائے۔ پھر تمام لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی تکلیف دیجائے، کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم اور ہر پیشوائے قوم کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی شریعت آپ بنالیں ——— ورنہ تشریع محض بے فایدہ ہوگی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادات و خصوصیات کا تجسس کیا جائے اور ہر ایک کیلئے الگ الگ شریعت بنائی جائے اس بناء پر اس سے بہتر اور آسان کوئی طریقہ نہیں کہ شعائر تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کی عادت کا لحاظ کیا جائے جس میں امام پیدا ہوا ہے، اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔

عبادات - نماز نماز عجمی لفظ ہے اور اس کے ہم معنے و مشابہ سنسکرت کا لفظ نمستے ہے۔ عربی میں اس کو صلوٰۃ کہتے ہیں، اور انگریزی میں پریر (PRAYER) جو لاطینی لفظ پریکاری (PRECARIS) سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی عاجزی کرنے کے ہیں صلوٰۃ کے لفظی معنے "سرینوں کا ملانا" ہے اور شاید یہ عربوں کی اصطلاح میں عاجزی کرنے کے مترادف ہو۔ نماز کا مفہوم بھی غالباً وہی ہے جو نمستے کا ہے۔ اور اس سے بھی انسان کی اس خاص حالت کا اظہار مقصود ہے، جو خشیت و تضرع کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کے مذاہب خواہ الہامی ہوں یا اوہامی سب میں کسی نہ کسی صورت سے یہ طریقہ عبادت کا پایا جاتا ہے۔ بلکہ مذاہب سامیہ میں اور خصوصاً اسلام میں تو نماز دین کا رکن عظیم ہے۔ اور ہر بالغ مومن پر اوقات معینہ میں نماز ادا کرنا فرض ہے۔ نماز کا اصل مقصد یہ ہے کہ اپنے معبود کے آگے اپنی بھلائی کے لئے اس سے مدد مانگی جائے اور اس کے ساتھ اس کی عظمت اور بڑائی کا اقرار کیا جائے۔ اور زبان

سے جو الفاظ ادا کئے جائیں اس کے ساتھ اپنے اعضاء کو ایک خاص معمول کا پابند کیا جائے۔

قرآن سے نماز کا مقصد یہ ثابت ہوتا ہے:۔ "انّ الصّلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء" یعنی نماز کا مقصد یہ ہے کہ وہ تم کو برائی اور بدیوں سے بچائے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ نماز پڑھنے سے ہم کیونکر بدکاریوں و برائیوں سے بچ سکتے ہیں، کیونکہ بادی النظر میں انسانی اعمال اور ارادے انسان کے اس فعل پر موقوف نہیں تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ نماز کے وقت جب انسان کھڑا ہوتا ہے تو وہ اس وقت کم سے کم یہ خیال اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی کے آگے دست بستہ کھڑا ہو رہا ہے جو ربّ العالمین و مالک یوم الدین ہے۔ دل میں کئی بار اس یاد دہانی سے بہ اصول نفسیات یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی عظمت اور خشیت ہر وقت ہمارے پیش نظر ہو جاتی ہے اور ہم اس بات کو فراموش نہیں کر سکتے کہ ہم جو کام کر رہے ہیں اس کا دیکھنے والا ایک خدا موجود ہے۔ جس کے سامنے وہ اپنے ہر ایک کام کا جواب دہ ہے۔ تو ہمارا مقصد در اصل اس ذہنیت کا پیدا کرنا ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ کسی وقت نماز نہیں پڑھتے اُن کے دل سے خدا کی ہستی کا اعتراف تقریباً محو ہو جاتا ہے اور وہ بے باکی سے ہر کام کو اس طرح کرنے لگتے ہیں گویا خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دن بھر دنیاوی زق زق بق بق میں ان کا دل اس قدر سخت ہو جاتا ہے کہ آخر میں وہ عام اخلاقی اعمال سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ ایسے لوگوں کے ذہن میں خدا کا محض فلسفیانہ تخیل رہ جاتا ہے اور وہ الٰہیات کے تحت اسٹوئک فلاسفہ اور ارسطو نے الٰہیات معاشرت سے تعبیر کیا ہے وجود معطل ہو جاتا ہے

اس لئے ضرور ہے کہ انسان اپنے کاموں سے تھوڑا وقت نکال کر دن رات میں کئی بار خدا کی یاد کرے اور اسی میں اس کی فلاح ہے اور چونکہ نفسیات کا قول ہے کہ خیال کی یکسوئی ہمیشہ کچھ نہ کچھ حرکات جسمانی سے ہوتی ہے، اس لئے نماز میں جسم کو ایسی حرکت دینا جو ایک ہی وقت میں یکسوئی کا باعث بھی ہو اور انسان میں عجز و فروتنی پیدا کرے۔ ضروری ہے۔

یکسوئی کی ایک صورت قدیم مذاہب میں یہ بھی تھی کہ اپنے سامنے اپنے معبود کی ایک تمثالی صورت رکھ لیتے تھے اور اس کے آگے مراقب ہوتے تھے۔ مگر از بس کہ یہ تمثالی صورتیں خود خدا کی تو ہوتی نہیں۔ اور انسان ایسی عادت سے رفتہ رفتہ خدا کو اس تمثال کا نمونہ سمجھنے لگتا ہے اس لئے اس کی جگہ قبلہ رُخ ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے جس کا مقصد وہی ہے۔

روزہ

روزہ "یا صوم" بھی تقریباً تمام مذاہب کا معمول رہا ہے۔ اگرچہ اس کے طریقوں اور مقاصد میں اختلاف ہو۔ شاید کنفوشیس کے مذہب میں روزہ رکھنے کا حکم نہیں پایا جاتا، ورنہ کیا الہامی کیا دوامی غرض جتنے مذاہب ہیں ان میں روزہ ایک فریضہ مذہبی سمجھا گیا ہے حتیٰ کہ مذہب زردشت میں جس کے متعلق عام طور سے خیال ہے کہ اس میں روزہ کا حکم نہیں ہے۔ اس میں بھی کم سے کم موبدوں کو سال میں پانچ بار روزہ رکھنے کا حکم ہے۔ مذہب میں اس کی ابتدا کیونکر ہوئی اس کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ صوم عربی زبان میں ختم سے نکلا ہے، جس کے معنی چپ رہنے کے ہیں اور مذاہب سامیہ میں ایک قسم کا روزہ چپ رہنے کا تھا جیسا قرآن میں بھی ذکر ہے۔ انگریزی کا لفظ فاسٹنگ (FASTING) قدیم جرمنی زبان فاستنجان سے نکلا ہے اور لاطینی میں اس کو ججونا بری (IEJUNARI) کہتے ہیں۔ روزہ بھی زبان کا لفظ ہے مگر مجھے علم نہیں کہ اس کے لفظی معنے کیا ہیں۔ بہرحال کچھ بھی ہوں روزہ رکھنے کی عام تعریف یہ ہے کہ وقت مقررہ کے اندر جو اکثر صبح سے شام تک ہوتا ہے۔ کھانے پینے سے (اور اسلام میں مباشرت سے) قطعی پرہیز کیا جائے۔

فلسفی ہربرٹ اسپنسر (HERBERTSPNSOR) نے بعض اقوام وحشیہ کی عادت مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

شاید روزہ کی ابتدا یوں ہوئی ہے کہ مرے ہوئے لوگوں کو غذا پہونچانے کے خیال سے اس کے پسماندگان اپنا کھانا پینا وقت معینہ کے لئے چھوڑ دیا کرتے تھے اور اس کے بعد وہ قربانی کا لازمی نتیجہ قرار دیا گیا اور رفتہ رفتہ اصل غایت روزہ کی فراموش ہوگئی۔ لیکن اسپنسر کا نظریہ یوں معقول نہیں کہ عموماً اقوام وحشیہ میں روزہ، موت اور قربانی کے بعد نہیں بلکہ اس کے پہلے رکھے جانے کا رواج ملتا ہے اور اس لئے اسپنسر کو خود اپنی اس توجیہ پر اطمینان نہیں اور آخر میں جب اس کو کوئی غایت نہ معلوم ہوسکی تو اس کو اقرار کرنا پڑا کہ روزہ کے کئی وجوہ ہوسکتے ہیں، مثلاً طبی خیال سے محض جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے یا اپنے ابنائے جنس سے ہمدردی کا احساس پیدا کرنے کے لئے کہ بھوک کی تکلیف کو عموماً معلوم کیا جائے جو ایک بھوکے اور غریب انسان پر گزرتی ہے اور اس کی امداد کی طرف انسان مائل ہو۔

ایک توجیہ یوں بھی ہوسکتی ہے کہ انسان کا وہی خوف مرگ جس نے قربانی مجبور اور عاجزی پر آمادہ کیا، روزہ اس نیت سے رکھایا ہو کہ وہ اپنے خونخوار معبودوں کو دھوکا دے سکے کہ وہ کمزور و نحیف ہے اور اس کی جان لینے سے معبودوں کو کوئی اچھی غذا بہم نہ پہونچے گی۔ ای بی ٹائلر (E-B-TYLER) کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا غالباً اس خیال سے ہوئی کہ بھوکے رہنے سے انسان کے اعصاب پر ایک ایسا اثر پڑتا ہے جس سے وہ روحانیت کا مشاہدہ بہتر صورت سے کرسکتا ہے۔

بہر حال اصل وجہ روزہ رکھنے کی خواہ کچھ ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دُنیا کی قوموں نے اس کو بھی ایک طریقہ عبادت سمجھا ہے اور اس پر عامل رہے حتیٰ کہ دنیا کے اعلیٰ مذاہب خصوصاً اسلام نے روزہ رکھنا فرض مذہبی تصور کرکے اس کی سخت تاکید کی ہے۔ برہمنوں نے چاند نکلنے اور چاند کے کامل ہونے کے گیارھویں روز ساٹھ گھنٹے تک ہر چیز سے پرہیز رکھنے کا حکم دیا ہے اور ہر سال نومبر کے مہینے میں سوموار کے روز برت رکھنے کا حکم ہے۔ قدیم مصریوں میں بقول ہرڈوٹس آئی سس (ISIS) دیوتا کے جشن مولود میں روزہ رکھا جاتا تھا، یونانیوں میں بعض مذہبی نسلوں کے سلسلہ میں بالخصوص عورتوں کو تین دن روزہ رکھنے کا حکم تھا۔ لیوی (LEVY) قدیم مورخ رومہ نے بھی روزہ رکھنے کی رسم کا ذکر اپنی قوم میں کیا ہے، مگر اس سے یہ بات صاف نہیں معلوم ہوتی کہ عوام و خواص سب روزہ رکھتے تھے، یا محض مندر کے پروہت۔ یہودیوں میں سالانہ ایک دن روزہ رکھنے کا حکم ہے، جو ایام تشرین یعنی ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو مقرر ہے۔ شریعت یہود میں، جیسا کتاب استثناء کے ابواب ۱۶ (آیات ۲۹ تا ۳۴) ۲۲ (آیات ۲۷ تا ۳۲) اور کتاب اعداد باب ۱۹ (آیات ۷ تا ۱۱) سے ظاہر ہوتا ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ اس دن یہودیوں پر روزہ رکھنا کیوں فرض ہوا تھا۔ ابن عباس کی طرف سے ایک قول حدیثوں میں نقل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جب ہجرت کی تو آپ نے یہودیوں کو محرم کی دسویں تاریخ روزہ رکھتے ہوئے دیکھا۔ اور آپکے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ یہ وہ ہے جس دن حضرت موسیٰ، بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تھے۔ مگر یہ حدیث اس وجہ سے ناقابل اعتبار ہے کہ خود موجودہ یہود میں اس کی غایت پر اختلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ ابن عباس کا قول مرفوع و مستند نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ سال ہجرت میں پیدا ہوئے ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں کا روزہ سالانہ عید سے پہلے ہوا کرتا تھا، تاکہ لوگ اپنے گناہوں کا کفارہ دے کر خوشیاں منائیں۔ یہود کی شریعت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں ایام سبت کو روزہ رکھنا منع تھا اور کتاب اعداد کے تیئسویں باب کے ۱۴ آیت میں لکھا ہے کہ عورت اپنی روح کو ایذا دے (یعنی روزہ رکھے) تو اس کے شوہر کو اختیار ہے کہ وہ اس روزہ کو توڑوا دے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ علاوہ سالانہ روزہ کے یہودیوں میں اور بھی نفل روزے رکھے جاتے تھے اور خصوصاً بعض قومی میلوں یا عید کے کے زمانہ میں قید بابل کے زمانہ میں اور اس کے بعد تو یہودیوں میں روزے رکھنا ان ایام صعوبت کی یاد تازہ کرنے کے لئے کثرت سے ہوا کیا ہے، انبیاء بنی اسرائیل کے نوشتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک روزہ دسویں۔ چوتھے ... یں۔ اور ساتویں مہینوں میں القدس

کے محاصرہ و تباہی کی یاد میں رکھے جاتے تھے۔

اگرچہ موجودہ اناجیل سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت مسیح نے روزہ کا حکم خصوصیت سے اپنے متبعین کو دیا ہے، لیکن خود مسیح نے روزہ کی جو تاویل اپنے مشہور وعظ کوہی میں کی ہے اور شیطان کی آزمایش کے دوران میں چالیس روز کا خود روزہ رکھا ہے اور فریسیوں کے اعتراض پر کہ آپ کے حواری اکثر روزے کیوں نہیں رکھتے، حضرت مسیح کا یہ جواب دینا کہ روزے ایام خوشی میں جبکہ وہ خود موجود ہیں کیوں رکھے جائیں، یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ چونکہ حضرت مسیح خود کسی شریعت کے موجد نہ تھے۔ خود ان کا اور ان کے متبعین کا عمل یہود کی شریعت پر تھا، جیسا کتاب اعمال الرسل کے ابواب سترہ اور تیرہ سے پتہ چلتا ہے چنانچہ سوائے پروٹسٹنٹ کے مسیحیت کے دوسرے کلیساؤں میں روزہ رکھنا ایک فرض دینی سمجھا جاتا ہے۔ حتی کہ ازمنہ وسطی میں اگر روزہ کے ایام میں کوئی گوشت کھائے تو بھی قتل کر دیا جاتا اور کبھی اس کے دانت توڑ دئے جاتے تھے، یہودیوں میں بھی فرض روزہ نہ رکھنے کی سزا قتل ہے۔

اسلام میں بھی روزہ ایک فرض مذہبی ہے اور روزہ کا فرض مذہبی ہونا علاوہ دوسرے مقاصد کے اس حیثیت سے بھی ضروری تھا کہ مسلمانوں کو جفاکشی کی تعلیم و مشق کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

یہ اس قدر صاف اور صریح حکم ہیں کہ کسی تاویل کی گنجایش نہیں، اور اس لئے شریعت نے روزہ کو مذہب کا دوسرا رکن قرار دیا ہے البتہ روزہ فرض کرنے والی آیت میں چند الفاظ ضرور قابل توجہ ہیں، اول تو "ایام معدودات"۔ دوسرے "وعلی الذین یطیقونہ" تیسرے "فمن شہد منکم الشہر"۔

"ایام معدودات" (یعنی گنتی کے چند روز) نہ عربی میں اور نہ ہماری زبان میں کبھی مہینہ بھر کے لئے گنتی کے چند روز بولے جاتے ہیں۔ گنتی کے چند روز کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ جو شمار میں بہت کم ہوں۔ اور چونکہ اس زمانہ کے عرب اور اب بھی اقوام وحشیہ میں دس سے زیادہ عدد گننا نہیں جانتے تھے، اس لئے کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کا شمار دس تک ہوتا ہے اور اسی کو عربی میں عقدۃ الانامل کہتے ہیں۔ اس لئے گنتی کے دن اتنے ہی ہوں گے جو شمار میں دس تک ہوں، ورنہ اگر اس سے ۳۰ یا ۲۹ دن مراد لئے جائیں تو ایام معدودات کے بجائے شہر کہنا زیادہ صحیح ہوتا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ اگر روزے کے دن گنتی کے چند روز ہیں تو ان کی تعداد کیا ہے، اب آخری آیت پڑھو "شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن"۔ رمضان کے مہینہ میں جبکہ قرآن نازل ہوا تھا، مورخین و اہل سیر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ۲۱ یا ۲۳ رمضان کو قرآن کی پہلی آیت نازل ہوئی تھی۔ بس اس تاریخ سے آخری مہینہ رمضان تک قرآن شریف کی رو سے روزہ فرض معلوم ہوتا ہے، البتہ فقہ کی رو سے سارا مہینہ رمضان روزہ رکھنا چاہئے، مگر میں فقہی مسایل کا اس وقت تک پابند نہیں ہوتا جب تک کہ قرآن یا متصل بالاسناد صحیح حدیث جو بہت ہی شاذ ہے) اس کی تائید میں نہ ہو۔

بہر حال یہ بات قطعی ثابت ہے کہ ایام معدودات کا عمل سارے مہینہ پر نہیں ہوتا اور مفسرین نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ مگر مفسرین کیا جانتے تھے کہ دنیا ان کے بعد کتنی کروٹیں لے گی اور سوائے قرآن کے کوئی لٹریچر ایسا باقی نہ رہے گا جو غیر وقتی پرانا اور ناموزوں نہ ہو جائے۔ چونکہ سامی مذاہب میں کل سال میں گنتی کے چند روز کے روزے تھے۔ اور ہمیشہ کسی بڑی یادگار کے روز اور اسکے بعد تک رکھتے تھے نہ کہ اس کے قبل، اس سے اس قیاس میں اور مدد ملتی ہے کہ ہمارے روزے اتنے سخت نہیں ہیں جتنے ہم خود اپنے نفس پر ظلم کر کے رکھ لئے ہیں اور جو رہبانیت اور نفس کشی کی حد تک پہونچ جاتے ہیں۔

"وعلی الذین یطیقونہ" (اور وہ لوگ جن کو طاقت ہے) اس لفظ نے بہت سے مفسرین کو مشکل میں ڈالا ہے، اور بعض مفسرین نے تو اس مشکل کو اس طرح حل کیا ہے کہ آخر میں انھوں نے بروایت ابن عباس (جو مفسرین و محدثین کا سب سے بڑا سہارا ہیں) یہ تسلیم کیا ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں روزہ رکھنا فرض عام نہ تھا، بلکہ جو لوگ چاہتے روزہ رکھتے اور جو لوگ چاہتے مساکین کو کھانا کھلا دیتے اس حدیث کو بھی میں تسلیم کر لیتا اگر بعد کے جملے سارا بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ دیتے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد یہ اجازت دوسری آیت سے منسوخ ہو گئی۔

ملا جیون استاد عالمگیر نے عربی میں احکام قرآنی کی ایک تفسیر لکھی ہے جو عربی زبان میں ہے اور انھوں نے اس لفظ کی تاویل یوں کی ہے کہ اس میں "لا" محذوف ہے اصل میں "لا یطیقونہ" تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میں سے جو روزہ نہ رکھ سکیں، مثلاً بوڑھے لوگ یہ تاویل اچھی تھی۔ کیونکہ نحو میں بھی اکثر یہ قاعدہ تسلیم کیا گیا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ ایک شخص جو نہ روزہ کی طاقت رکھتا ہے اور نہ فدیہ کی، وہ کیا کرے، اور کیوں نہ ہم اس سے یہی لوگ مراد لیں، کیونکہ روزہ کی استطاعت کے لئے صرف صحت و حضر شرط ہے نہ کوئی اور چیز جب صحت نہیں تو مریض، و مسافر سے یونہی روزہ ساقط ہو جاتا ہے اس لئے قرآن کی آیت سے صاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ کا بدل فدیہ و اطعام مساکین ہے۔ اور وہ خدا کے نزدیک ایسا ہی محبوب ہے جیسے روزہ۔ ایک شخص چاہے فدیہ دے چاہے روزہ رکھے، چاہے دونوں کرے۔ یہ قیاس اس سے بھی قوی ہو جاتا ہے کہ بعض گناہوں کے کفارے میں یہ بھی حکم ہے کہ روزہ رکھا جائے یا مساکین کو کھانا کھلایا جائے یا غلام آزاد کیا جائے۔

"فمن شہد منکم الشہر" (اور تم میں سے جو رمضان کے مہینہ کو پائے) سوال یہ ہے کہ کیا ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جن کو رمضان کا مہینہ ملتا ہی نہیں، اس کا جواب انیسویں صدی سے قبل کوئی مفسر نہیں دے سکتا تھا، مگر آج اس کا جواب ہم دے سکتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ دکھلا سکتے ہیں کہ قرآن کسی انسان کا بنایا ہوا ہرگز نہیں، وہ ایسی ہستی کا کلام ہے جس کی نظر انسانی نظر سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ بے شک ایسے لوگ دنیا میں موجود ہیں اور وہ قطب شمالی اور جنوبی کے رہنے والے ہیں اور اس لئے جس طرح حج و زکوٰۃ کی فرضیت غیر مستطیع پر سے ساقط ہو جاتی ہے یا جہاد کی فرضیت بغیر آمر و خلیفہ کے۔ اسی طرح روزہ کی فرضیت وہاں ساقط ہے۔

زکوٰۃ یا صدقہ

زکوٰۃ یا صدقہ دونوں عربی الفاظ ہیں۔ زکوٰۃ کے معنی پاک کرنے کے ہیں اور صدقہ کے معنی مجھے ٹھیک معلوم نہیں، زکوٰۃ وصدقہ کے ہم معنی لفظ عربی میں خیرات اور انگریزی میں چیریٹی (CHARITY) یا نیکی کرنے کے ہیں۔ صدقہ سے مراد یہ ہے کہ فقرا اور مساکین کی مالی امداد کی جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فعل اخلاق و معاشرت کے ضمن میں آتا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ اس کے کنہ و فیہ پر مورخانہ حیثیت سے نظر ڈالی جائے، چونکہ اسلام نے زکوٰۃ کو ایک رکن دین قرار دیا ہے، اس واسطے ہم نے اس کو اپنی عبادات میں شامل کر لیا ہے۔ ورنہ عام طور سے یہ ایک اخلاقی فعل ہے، اور دوسری نیکیوں کے ساتھ تمام اعلیٰ مذاہب نے اس کی تائید کی ہے، البتہ اسلام ہی کو صرف دنیا کے تمام مذاہب میں امتیاز حاصل ہے کہ اس نے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کی اس درجہ تاکید کی ہے کہ وہ ایک فریضۂ مذہبی میں شمار ہونے لگا۔ اور اس کی تشریح بھی بعد کو دوسرے ارکان دین کی طرح کی گئی ہے۔ ہم اس میں صرف دو تین باتوں پر اکتفا کریں گے۔ زکوٰۃ کے متعلق عام طور سے فقہی مسئلہ یہ ہے کہ سال بھر میں آدمی کے پاس سے جو کچھ بچ رہے اور جو ایک معین مقدار سے کم نہ ہو اس کا چالیسواں حصہ نکال کر مستحقین کو دے دو۔ بالکل یہی طریقہ یہودیوں کے یہاں تھا، اور کہا جاتا ہے کہ

تعیین حضرت ابوبکرؓ نے اپنے خلافت کے زمانہ میں کی تھی، اور اس کی سند میں ان کا مشہور خطبہ پیش کیا جاتا ہے، جو حدیثوں میں منقول ہے تو اسلامی زکوٰۃ در اصل ایک قسم کا انکم ٹیکس ہے اور جب مذہب کے ساتھ سیاست شامل تھی تو اسلامی زکوٰۃ کا مقصود درحقیقت وہ کبھی نہیں ہو سکتا جو خیر و خیرات اور رحمدلی کا ہو سکتا ہے، ہم کو زکوٰۃ کے اس مفہوم کے ماننے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا اگر اسلامی سلطنت دنیا میں محدود نہ ہوتی اور ایسے زمانہ میں جبکہ اسلام اسلامی سلطنتوں کی حدود سے کہیں دور نکل گیا ہے، زکوٰۃ کی سیاسی تعیین ان قوموں میں جہاں کہ سلطنت اسلامی نہیں یا تو منسوخ ہو جائے گا، یا اس کی دوسری صورت پیدا کی جائے گی، کیونکہ اس قسم کی زکوٰۃ آدمی خود بخود اپنی خوشی سے نہ دے گا۔ اور جس طرح انکم ٹیکس دینے والے بہت سے بہانے ٹیکس دینے کے نکال لیتے ہیں اور اپنی آمدنی چھپاتے ہیں۔ مسلمان بھی یہ کرنے لگیں گے کہ سال میں جب زکوٰۃ فرض ہونے لگے گی تو روپیہ اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیں گے اور وہاں تو زکوٰۃ کا نام بھی نہ لیں گے جہاں کوئی اسلامی سلطنت نہیں ــــــــــــــ لیکن اگر زکوٰۃ کا نام رافت و رحمدلی ہے اور اپنے ہم جنس غریب بھائیوں کی امداد بطیب خاطر مقصود ہے تو ہم اس کو بھی نہ بھولیں کہ قرآن نے جس کی نظر ہر زمانہ اور ہر ملک پر تھی ۔ نہ زکوٰۃ کا کوئی نصاب مقرر کیا ہے، اور نہ یہ بتایا ہے کہ زکوٰۃ دینے کا سال میں صرف ایک ہی وقت ہے برخلاف اس کے قرآن نے جب کہیں نماز کی تاکید کی ہے تو اس کے ساتھ زکوٰۃ کو بھی تاکید کر دی، یعنی جس طرح نماز روزانہ ہو اسی طرح زکوٰۃ بھی روزانہ ہو۔ آنحضرت سے لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ وہ کس قدر زکوٰۃ دیں ۔ اس کا قرآن نے یہ جواب دیا ہے :۔

(۱) "یسئلونک ماذا ینفقون ۔ قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم"۔ (بقر رکوع ۲۵)

تم سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہدو کہ جو مال بھی خرچ کرو وہ تمھارے ماں باپ کا حق ہے، اور قریب کے رشتہ داروں کا، اور یتیموں اور محتاجوں کا، اور مسافروں کا، اور تم کوئی سی بھلائی کروگے تو اللہ اسے جانتا ہے۔

(۲) "ویسئلونک ماذا ینفقون ۔ قل العفو ۔ کذالک یبین اللہ لکم الآیات لعلکم تتفکرون"۔ (البقر رکوع ۲۶)

اور تم سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں، کہدو جتنا تم سے ہو سکے۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم کو غور کرنے کا موقع ملے۔

یا تو اس صریح آیت کو مسائل فقہی کے مقابلہ میں پس پشت ڈال دیا جائے یا نعوذ باللہ یہ سمجھا جائے کہ یہ احکام مبہم ہیں، اور فقہ میں اس کی صراحت زیادہ ہے، مگر زکوٰۃ دینے والوں اور لینے والوں سے پوچھو کونسی صورت دل کو تسکین دینے والی ہے یہ ضرور ہے کہ تعیین زکوٰۃ سے ایک کام مقررہ عادت پڑ جاتی ہے، مگر خیرات کے معاملہ میں تعیین کیا معنی "اللہ یعطی وانا قاسم" مسلمانوں کا شیوہ ہونا چاہئے۔ جب ہم کو اللہ مقدرت دے خوب دل کھول کر زکوٰۃ دی جائے اور مسلمانوں کے کاموں میں اسقدر فراخدلی سے چندہ دیا جائے جو نصاب زکوٰۃ سے ہزار گنا ہو۔

قربانی۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ جانور جو ایک خاص طریقہ سے ذبح نہ کئے جائیں اور ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر نہ پڑھا جائے تو ایسے جانور کا پیٹ میں اترنا اور ایمان کا سلب ہونا لازم و ملزوم ہے، مگر یہ ساری غلط فہمی اس بات سے پیدا ہوئی کہ قرآن شریف میں مسلمانوں کو بتوں کی قربانی کے گوشت کی ممانعت ہے، یعنی ایسے تمام جانوروں کے گوشت سے جو خدا کے نام پر ذبح نہ کئے جائیں

اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان بے جھاں بغیر ذبح کئے ہوئے گوشت کو کھایا اور اس کا ایمان بگڑا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اہلِ کتاب کا کھانا ہر طرح حلال ہے اور اہل کتاب کے ذبح کا طریقہ ہمارا سا نہیں اور نہ وہ خدا کا نام لیتے ہیں اور اسی لئے بھی کہ اگر کتا شکار کو پکڑ کر مار ڈالے تو اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

ڈاکٹر ٹائلر (TYLOR) کا خیال ہے کہ قربانی کا مقصد سوا اس کے کچھ نہ تھا کہ اقوام وحشیہ نے موت و بیماریوں کا سبب ایک قسم کا خونخوار دیوتا خیال کیا تھا ——————— اور ان کو خوش کرنے یا ان کی بھوک کو رفع کرنے کے لئے جانوروں کے ذبح کرنے کے لئے عام طریقہ اختیار کیا۔ یہ تو اس قربانی کا اصل منشا تھا جس کا مترادف انگریزی میں سیکری فائس (SECRIFICE) اور ہندوؤں میں بھینٹ اور پرشاد ہے، مگر خود قربانی کا لفظ اقوام سامیہ کی ایک ایسی اصطلاح ہے، جس کے معنی سے یہ خیال پیدا نہیں ہوتا، قربانی کے معنی نزدیکی کے ہیں اور یہی معنی عربی زبان میں بھی ہیں، چنانچہ قرآن میں آیا ہے:۔ ”واتل علیہم نباء ابنی آدم اذ قربا قرباناً فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الآخر“۔ (المائدہ رکوع ۵)

جن لوگوں نے یہود، ہنود و پارسیوں کے کتب مذہبی کا مطالعہ کیا ہے وہ غالباً اس بات کو حیرت کی نظر سے دیکھیں گے کہ یہ مذاہب جو الہامی ہونے کے مدعی ہیں، رسم قربانی میں عام وحشیوں کے ہمنوا ہیں، گویا قربانی کا ان مذاہب میں ایک رسم مذہبی اور عبادت قرار پانا صرف اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ مذاہب بھی اپنے اندر بہت سے ایام وحشت و جہالت کی یادگار رکھتے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم کسی مذہب کے الہامی اور غیر الہامی ہونے کا معیار مقرر کر سکتے ہیں تو ہمارے لئے اس قدر کافی ہے کہ یہ جانچ کر لیں کہ اس مذہب میں قربانی کرنا ایک فریضہ ہے یا نہیں۔ اور اگر اس کے مذہب میں قربانی مناسک مذہب میں سے قرار پائی ہے تو ہم یقیناً یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ مذہب خدا شناسی سے قاصر ہے اور اس نے موت کے خوف سے بچنے کے لئے قربانی کا طریقہ ایجاد کیا، کیونکہ یہ فعل اسی خیال پر مبنی ہوگا کہ دیوتاؤں کی خونخواری کے لئے تازہ خون بہم پہونچایا جائے ورنہ اگر ان کو بھوک نے ستایا تو وہ ہماری جان کو لے کر رہیں گے اور یہ اعتقاد ہرگز الہامی اعتقاد نہیں ہو سکتا۔

اسلام سے قبل تمام دنیا کا یہی مسلک رہا ہے اور اگر قربانی کا طریقہ الہامی مذاہب میں پایا جاتا ہے تو اس کی صرف دو ہی توجیہہ ہو سکتی ہیں یا تو یہ طریقہ بعد کو اوہامی خیالات کے فروغ سے متاثر ہوا یا پھر قربانی کا مقصد یہ تھا کہ انسان اس خالق رزاق کے سامنے چند ہدایا گزران کر اپنی عبدیت اور ممنونیت کا اظہار کرے، غالباً اسی وجہ سے مسلمانوں میں قربانی کا گوشت غربا کو تقسیم کر دیا جاتا جو ایک قسم کی خیرات ہے اور یہودیوں کی طرح وہ قربان گاہ پر جلا کر چہ اہمنہ پیدا نہیں کرتے

اب سوال یہ ہے کہ جانور کا ذبح کیا جانا کیوں قربانی کی شرط ہے، حالانکہ اگر بلا ضرورت جانور کو ذبح کیا جائے تو یہ ایک قسم کی سنگدلی اور شقاوت ہے اور اس سے خونخوار دیوتا خوش ہو تو ہو لیکن خدائے اسلام کو کوئی مسرت نہیں حاصل ہو سکتی، خود قرآن شریف میں ہے:۔ ”لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقویٰ“۔ اور یہ کہ کسی جانور کو بلا وجہ ایک وہم پر ذبح کر دیا جائے ایک عبث و برا فعل ہے وہ اس مشہور حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں کسی عورت کے پاس ایک اونٹ تھا، اس اونٹ نے اس کو ایک خطرہ سے اور جنگ میں گھر جانے کے وقت بچا لیا تھا، اس شکر گذاری میں اس عورت نے چاہا کہ وہ اس اونٹ کو کعبہ میں قربانی کر دے، آنحضرت نے جب اس کے اس ارادہ کو سنا تو فرمایا ”سبحان اللہ اونٹ کی خدمت کی جزا کیا اچھی دی گئی“ اور آپ نے فوراً اس اونٹ کو لے لیا“ اس لئے اگر

یہودیوں کا مذہب الہامی سمجھا جائے تو اس کی تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ یہودیوں نے امتداد زمانہ اور مشرکین کنعان کی صحبت بد سے یہ رسم اختیار کر لی، اور اس سے یہ ثابت ہے کہ یہودیوں نے حضرت موسٰی اور انبیاء کے زمانہ میں بت پرستی اختیار کر لی تھی، کم سے کم ان کا بعل دیوتا کو پوجنا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ باقی رہا اسلام، سو اس کے متعلق سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ عید الضحٰے یا ایام حج میں خصوصاً منا کے روز جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں وہ کس اعتقاد پر مبنی ہیں، ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی سنت دیرینہ ہے جب وہ حضرت اسمٰعیل کی قربانی دینے چلے تھے تو خدا نے ان کے ایمان کی آزمایش میں ان کو پورا پاکر بہشت سے ایک موٹا تازہ دنبہ بھجوا دیا اور حضرت ابراہیم نے اس کو پکڑ کر اپنے بیٹے کی جگہ اُس کی قربانی کر دی، حضرت ابراہیم کا اپنے بیٹے کی قربانی کرنا یا اس کی جگہ کسی دُنبہ کی قربانی کرنا کوئی خلاف واقعہ بات نہیں، حضرت ابراہیم خود عرصہ تک اور ان کے آباء اجداد بابل کے قدیم مذہب کے پابند تھے، جس میں قربانی کی رسم تھی، حضرت ابراہیم نے جب اپنے آبائی مذہب اور وطن کو ترک کیا اور نبوت و رسالت کو پہونچے تو شیطان نے ان کو پرانی مذہبی رسم یاد دلاکر دھوکا دیا کہ یہ رسم تم کو اب بھی کرنا چاہیے، وہ اس دھوکے میں پڑے تھے کہ خدا کے فرشتے نے ان کو وقت پر آگاہ کر دیا، چونکہ حضرت ابراہیم ایک بہت بڑی غلطی سے بچائے گئے تھے، ممکن ہے انھوں نے اس کی یادگار میں ایک دُنبہ اس وقت ذبح کر دیا ہو، یا ہر سال دنبہ ذبح کر دیا کرتے تھے، جو اس یاد کو تازہ کرنے کے ساتھ ان کی خوراک کے کام آتا تھا اور یہ یادگار مکہ میں قایم رہ گئی، شاید "وفدیناہ بذبح عظیم" میں اس کا حوالہ ہو، اب رہا ارکان حج میں قربانی کا ضروری ہونا تو ارکان و واجبات حج کی تفصیل حسب ذیل ہے:

احرام[1] - طواف[2] - سعی[3] - وقوف عرفات[4] -

رمی جمار[1] - قیام مزدلفہ[2] - قیام منا[3] - طواف وداع[4] -

اور فقہانے واجبات کے ترک پر قربانی کرنے کا حکم دیا ہے ایام حج میں - حالانکہ یہ ان کا محض قیاس ہے -

مردوں کو سلا ہوا کپڑا[1] پہننا، عورتوں[2] کو منھ ڈھانکنا، خوشبوؤں[3] کا استعمال کرنا، عورتوں سے ہم بستر ہونا یا شکار کرنا ممنوع ہے اور ان میں سے کسی کی عدم پابندی پر فقہانے قربانی کا حکم دیا ہے، مگر یہ بھی ان کا قیاس ہے، قرآن تو علٰحدہ رہا حدیث بھی اس سے خاموش ہے، فقہانے ان صورتوں کے علاوہ اور بہت سی صورتوں میں قربانی کی ہدایت کی ہے مگر ہم کو کوئی ایسی مرفوع اور متصل الاسناد حدیث نہیں ملی جس سے ثابت ہو کہ فقہا کی تجویز کی ہوئی صورتوں میں قربانی کرنا ضروری ہے -

قرآن مجید میں صرف چار صورتوں میں فدیہ دینے کا حکم ہے تین صورتیں تو آیۂ "واتموا الحج والعمرۃ للہ" میں مذکور ہیں جو عنوان حج کی پہلی آیت ہے اور ایک ساتویں پارے کے دوسرے رکوع میں یعنی قتل صید میں واجبات کا ترک یا اگر آنحضرت نے کی ہے اور مناہیات سے منع کرنے کا اگر حکم نہیں دیا ہے تو قربانی کے ذریعے سے فدیہ دینے کا حکم کم سے کم میری نظر سے نہیں گزرا، ایک حدیث میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں خوشبو سے لتھڑا ہوا کپڑا پہن لے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ کپڑے کو تین مرتبہ دھو ڈالے اور اسی پر اور صور ممنوعہ کو سمجھ لینا چاہیے، الغرض اس حدیث سے بھی کہیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ آنحضرت نے ان صورتوں میں فدیہ کا

---

[1] "عن یعلی بن امیہ قال کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعمرۃ اذ جاء رجلٌ اعرابی علیہ مجلبۃ وھو متضمخ بالخلوق، فقال یا رسول اللہ انی احرمت بالعمرۃ وھذا علیّ فقال انا الطیب الذی بک فاغسلہ ثلث مراتٍ واما الجلبۃ فانزعھا ثم اضع عمرتک کما تضع فی حجک" (صحیحین)

حکم فرمایا ہے اور جب یہ ہے تو دعاؤں میں انھیں پر اکتفا کرلینا چاہئے جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں، پھر جو لوگ یوم النحر میں کثرت سے قربانیاں کرتے ہیں، یہاں تک کہ ایک شخص سو سو دو دو سو جانور ذبح کر ڈالتا ہے، وہ محض بے سود اور نہ محض بے سود بلکہ اسراف میں داخل ہے۔

قرآن میں ایک جگہ ہے "فصلِّ لربک وانحر" اور انحر کے معنے قربانی کرنے کے عام طور سے سمجھے جاتے ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ یہاں پر اس کے معنی وہ نہیں ہیں جو عام طور سے سمجھے جاتے ہیں اور نہ سیاق عبارت سے یہاں پر اس کی مراد لی جاسکتی ہے، نحر کے عربی میں کئی معنی ہوتے ہیں اور ایک معنی دل کی توجہ کے ہیں، جو یہاں پر زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

غرض کہ جہاں تک میں نے غور کیا ایام حج میں جانور ذبح کئے جانے کا کوئی مذہبی فریضہ اسلام میں نہیں پایا جاتا، البتہ اس کے قومی رسم ہونے میں کوئی کلام نہیں اور اگر یہ عبادت عرب میں باقی رکھی گئی یا رکھی جائے تو اس کا مقصد جاہلیت میں جو کچھ بھی ہو اب صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ ایام عید و جشن و اجتماع میں ضیافتیں و دعوتیں ہوں اور لوگ سیر ہو کر کھائیں اور اس کے لئے جانور ذبح کئے جائیں، خصوصاً ایسے زمانہ میں جبکہ ایام حج میں دس روز تک ہر قسم کی قربانی کی ممانعت کر دی جاتی ہے، لیکن یہ کس قدر شرم اور افسوس کی بات ہے کہ باوجودیکہ قرآن ہی دنیا کی ایک ایسی مذہبی کتاب ہے جس نے سب سے پہلے اس تصریح کو ضروری سمجھا کہ جانوروں کا خون و گوشت خدا کو نہیں پہونچتا لیکن اب مسلمان ہی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ قیامت کے روز قربانی کے جانور اس کی سواریوں کے کام آئیں گے اور فقہاء نے تو بیہودیوں کی اس حد تک نقل کی ہے کہ اگر جانور عیب دار ہو یا اس کے کان کٹے ہوں یا کوئی سا عیب اس میں ہو تو اللہ میاں کو وہ پسند نہ آئے گا اور اس کی قربانی بے سود ہوگی۔

رعایتی اعلان

من ویزداں ـــــ مذہبی استفسارات و جوابات ـــــ نگارستان ـــــ جمالستان ـــــ مکتوبات نیاز تین حصے ـــــ

مہ/ ـــ ۳/ ـــ ۳/ ـــ للعہ/ ـــ عہ۱۲/

مالہ و ماعلیہ ـــــ حسن کی عیاریاں ـــــ مذہب ـــــ مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم ـــــ قول فیصل ـــــ شہاب کی سرگزشت ـــــ

عا/ ـــ عا/ ـــ عہ/ ـــ سے/ ـــ عا/ ـــ عا/

نقاب اٹھ جانے کے بعد ـــــ فراست الید ـــــ

۸/ ـــ عہ/

میزان = ۴۸ عہ/

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول صرف چالیس روپیہ میں مل سکتی ہیں

منیجر "نگار" لکھنؤ

حروف مقطعات

کلام مجید کی بعض سورتیں حروفِ مقطعات سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی ایسے چند مفرد یا مرکب حروف سے جن کا کوئی لغوی مفہوم متفقہ طور پر متعین نہیں ہے، مثلاً الم۔ حم وغیرہ اکثر مفسرین نے ان کا کوئی مفہوم نہیں ظاہر کیا اور صرف یہ کہکر خاموشی اختیار کی ہے کہ ان کا مفہوم صرف خدا کو معلوم ہے۔

مفسرین کی یہ رائے بہت عجیب و غریب ہے، قرآنِ پاک ایک کھلا ہوا صحیفۂ ہدایت ہے اور اس میں کسی ایسے فقرہ یا لفظ کا پایا جانا جس کا مفہوم عام طور پر نامعلوم ہو، سمجھ میں نہیں آتا۔

اگر کہا جائے کہ خود رسول اللہ کو بھی ان کا مفہوم معلوم نہ تھا یا یہ کہ انھوں نے قصداً اس کی وضاحت نہیں کی تو یہ اور زیادہ عجیب بات ہوگی، کیونکہ اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی لفظ یا اصطلاح کا مفہوم بتانا ہی مقصود نہ تھا تو اس کے استعمال کی ضرورت کیا تھی۔

اسی خیال کے پیشِ نظر بعض مفسرین نے حروفِ مقطعات کا مفہوم متعین کیا ہے، گو وہ کوئی صحیح توجیہ اس کی نہیں کرسکے کہ ان حروفِ مقطعات کا تعلق خود متنِ قرآن سے کیا ہے اور ان کے استعمال کی ضرورت کیا تھی جبکہ اسی مفہوم کو صاف صاف الفاظ میں بھی ظاہر کیا جاسکتا تھا۔

بعض کا خیال ہے کہ حروفِ مقطعات ان لوگوں کے نشانِ ملکیت تھے جن کے پاس قرآن کی نقلیں پائی جاتی تھیں، لیکن اگر یہ بات صحیح ہوتی تو ان نشانات کو اصل متنِ قرآن میں کیوں شامل سمجھا جاتا اور کیوں انھیں قرآن کا جزو سمجھ کر پڑھا جاتا۔

بہرحال امام رازی اور بعض دیگر مفسرین نے جو مفہوم حروفِ مقطعات کا ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے:-

الم ــ "الف لام میم" سے سورۂ بقر کا آغاز ہوتا ہے۔ ان حروف کو حروفِ مقطعات کہا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ ان کا مفہوم صرف خدا کو معلوم ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ حروف قایم مقام ہیں مخصوص الفاظ کے اور اہلِ عرب اس طرح کے مخففات کا استعمال کرتے تھے جیسے "قلت لہا قفی فقالت قاف" (میں نے اس سے کہا ٹھہر جا پس اس نے کہا قاف یعنی میں ٹھہر گئی)۔ (ابوحیان۔ بحر المحیط)۔

ایک مثال اور ملاحظہ ہو:- بالخیر خیرا، ت و ان شر، فا- ولا ارید الشر الا ان تا، یہاں ت، تشا کی جگہ استعمال ہوا ہے اور فا فشر کی جگہ۔ (ابوحیان)

اہلِ عرب عام گفتگو میں بھی ایسے مخففات استعمال کرتے تھے۔ ابوحیان اور ابن مسعود کا بیان ہے کہ الم مخفف ہے "ان بعض نے ظاہر کیا ہے کہ یہ مخفف ہے "امر المحمد" (بہ حکم محمد) کا، لیکن یہ درست نہیں کیونکہ صحیح عربی "امر محمد" ہے۔

آلرا ــ (الف، لام، را) سورۂ یونس کے علاوہ گیارھویں، بارھویں، چودھویں اور پندرھویں سورت میں بھی پایا جاتا ہے۔ تیرھویں صورت میں "المر" (الف، لام، میم، را) ہے۔

الٓر، مخفف ہے "انا اللہ رائی" (میں ہوں اللہ، دیکھنے والا) ۔ یہاں ر، رائی (دیکھنے والے) کا مخفف ہے ۔

الٓمر میں بھی ر یہی معنی رکھتا ہے اور مخفف ہے "انا اللہ اعلم الرائی" کا ۔

الٓمٓصٓ ۔ الٓم کے بعد حرف صاد مخفف ہے لفظ صادق کا ۔ اور مفہوم ہے "انا اللہ اعلم الصادق"

طٰسٓمٓ ۔ (سورۂ الشعراء) ان حروف سے بعض صفات خداوندی کا اظہار کیا گیا ہے ۔ حرف ط، لفظ لطیف (بہ معنی فیاض و کریم) کی جگہ استعمال ہوا ہے ۔ حرف س لفظ سمیع کی جگہ اور حرف م، لفظ علیم کی جگہ ۔

صٓ ۔ (سورۂ صاد) ۔ حرف ص، مخفف ہے لفظ صادق کا ۔

عٓسٓقٓ ۔ (سورۂ الشوریٰ) ۔ حرف ع، علیم کی جگہ استعمال ہوا ہے، س، سمیع کی جگہ اور ق، قادر کی جگہ ۔

حٰمٓ ۔ (سورۂ المومن) ۔ ایک بار رسول اللہ سے کسی نے پوچھا کہ حٰم سے کیا مراد ہے، آپ نے فرمایا کہ یہ "اسماء و فواتح سُور" ہیں یعنی یہ سورتوں کے نام ہیں ۔ رسول اللہ کا ایک ارشاد ہے کہ "ان بیتم فقولوا حٰم لاینصرون" (اگر رات کے وقت تم پر حملہ ہو تو حٰم کہو، وہ کامیاب نہ ہوں گے) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حروف مقطعات خدا کے بعض ناموں کا مخفف ہیں ۔ یعنی ح سے مراد حمید، م سے مجید ۔

طٰہٰ ۔ (سورۂ طٰہٰ) ۔ ابن عباس، قتادہ، مجاہد، حسن، سعید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی یا رجل (اے انسان) کے ہیں (رازی) ۔ ابوحیان کا بیان ہے کہ بعض شعراء نے طٰہٰ کا استعمال یا رجل کی جگہ کیا ہے ۔ اس لئے اس صورت میں طٰہٰ کہکر رسول اللہ سے خطاب کیا گیا ہے اور بجائے یا رجل کہنے کے طٰہٰ استعمال کیا گیا ہے ۔

قٓ ۔ (سورۂ قاف) ۔ ق الفاظ قدیر یا قادر کی جگہ استعمال ہوا ہے یا قضی الامر کی جگہ ۔

کٓھٰیٰعٓصٓ ۔ (سورۂ مریم) ۔ ک، کافی کی جگہ، ہ، ہادی کی جگہ، ی درمیان میں ۔ یا (حرف ندا) کی جگہ آیا ہے، ع، علم کی جگہ اور ص، صادق کی جگہ مستعمل ہوا ہے ۔ ان حروف سے خدا کو خطاب کیا گیا ہے اس معنی میں کہ :۔ اے کافی و ہادی، اور اے علیم و صادق!

یٰسٓ ۔ (سورۂ یاسین) ۔ ابن عباس کا بیان ہے کہ قبیلۂ طے کے محاورہ میں یٰس سے مراد "اے انسان" ہے ۔ یعنی اس سورۃ میں رسول اللہ سے یٰس (اے انسان) کہکر خطاب کیا گیا ہے ۔

"نگار" کے بعض نایاب سالنامے

داغ نمبر = (چھ روپیہ) —— مصحفی نمبر = (پانچ روپیہ بارہ آنے) —— ریاض نمبر = (تین روپیہ بارہ آنے) ۔ مع محصول

قیمت پیشگی —— وی، پی روانہ نہیں ہوگا

منیجر "نگار" لکھنؤ

عہدِ حاضر کے منکرینِ خدا و مذہب کیا کہتے ہیں

مذہب کے ماننے والوں کو ہمیشہ ایک ایسے دور سے بھی گزرنا پڑا ہے جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ ہم ان کے عقاید کو کیوں تسلیم کریں اور وہ اس کا کچھ نہ کچھ جواب بھی دے دیتے تھے۔ پھر اکثر تو یہی ہوا کہ جواب تیغ و خنجر کی صورت میں دیا گیا، لیکن کبھی کبھی عقلیت سے بھی کام لیا گیا اور اس باب میں اسلام کا نام سب سے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے، جس نے نہ مذہبی مناظروں کو ممنوع قرار دیا اور نہ تبلیغ و تفہیم کے سلسلہ میں عقل سے کام لینے کو بُرا سمجھا۔ یہاں تک کہ الٰہیات اور علم کلام ایک مستقل فن قرار پایا اور متعدد کتابیں اس سلسلہ میں لکھی گئیں۔

مذہب اسلام کی یہ خصوصیت کہ اس نے مذہب کے بنیادی خیال "وجودِ باری" کو بھی عقل سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی، ہمیں دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں خدا کے وجود اور اس کے تصور کے متعلق ایک خود ساختہ فلسفہ تو ضرور ملتا ہے، لیکن منطقی دلائل کا کہیں پتہ نہیں۔ اسلام نے بے شک اس کمی کو بھی پورا کیا لیکن مخصوص حدود کے اندر رہکر۔ یعنی ان کے سامنے منطقی دلایل تو تھے جن کے ذریعہ سے وہ فریق ثانی کو خاموش کر سکتے تھے، لیکن عام اخلاقی، معاشرتی و تمدنی پہلو سے جو اعتراض ان کے عقاید پر ہو سکتے تھے وہ ان کے سامنے نہ تھے۔ لیکن آج جبکہ دُنیا میں ہر چیز کو حقیقت و واقعیت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور مسایل تمدن و معاشرت سے ہٹ کر کسی امر کی حقیقت و صداقت متعین نہیں کی جا سکتی۔ ایک بڑی جماعت منکرینِ خدا و مذہب کی ایسی پیدا ہو گئی ہے جو انھیں نئے زاویوں سے گفتگو کرتی ہے اور اہلِ مذاہب کو انھیں زاویوں کو سامنے رکھ کر جواب دینا ہے۔ اس مضمون میں ہم انھیں کے اعتراضات پیش کرتے ہیں، جن پر ہمیں غور کرنا ہے اور آخر میں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ خدا کے تصور کی وہ کون سی صورت ہے جس پر اس قسم کے اعتراضات وارد نہیں ہو سکتے۔

---

(۱)

مذہب کیا ہے؟

"خدا ہی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ان کا مدبر ہے، اس لئے مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کا مطیع رہے، یعنی اگر اسکی طرف سے کوئی حکم نافذ کیا جائے تو اس کی تعمیل کرنا ہر شخص پر لازم ہے۔"

یہ ہے اصل مفہوم مذہب کا جو صدیوں سے رائج چلا آتا ہے اور تمام قوموں نے اسی اعتقاد کے تحت یقین کر لیا کہ خدا ہم سے قربانیاں

چاہتا ہے چنانچہ اول اول لوگوں نے اپنی اولاد تک کو بھینٹ چڑھانے میں عذر نہ کیا اور پھر صرف بیل، بھیڑ، بکری کے خون سے خدا کو راضی رکھنے کی کوشش کی گئی کیونکہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو خدا ان کی فصلیں خراب کر دیتا، پانی برسانا بند کر دیتا۔ بیماریاں پھیلاتا، زلزلے لاتا اور قحط و وبا کی مصیبت میں مبتلا کر دیتا۔ اس اعتقاد قربانی کی آخری جھلک عیسوی مذہب میں بھی پائی جاتی ہے اور اسلام میں بھی وہاں خدا اپنے بیٹے کی قربانی قبول کر کے ہمیشہ کے لئے چین سے بیٹھ گیا اور یہاں ابراہیم خلیل اللہ کے تہیۂ قربانی سے خوش ہو کر آیندہ کے لئے صرف جانوروں کی قربانی پر راضی ہو گیا۔

اہل مذاہب کا یہ اعتقاد بھی بہت قدیم ہے کہ خدا ہماری التجائیں سنتا اور ان کو پورا کرتا ہے، اس لئے ان اعتقادات کے پیش نظر۔ قدرتاً چند سوال پیدا ہوتے ہیں :-

۱ - کیا مذہب کی بنیاد کسی حقیقت معلومہ پر قایم ہے ؟

۲ - کیا واقعی کوئی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جسے خدا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ؟

۳ - کیا واقعی خدا خالق کل ہے ؟

۴ - کیا واقعی اس نے کبھی ہماری دعاؤں کو سنا ہے ؟

۵ - کیا واقعی قربانیوں سے خوش ہو کر اس نے کسی قوم کے ساتھ کوئی خاص رعایت روا رکھی ہے ؟

اور اسی کے ساتھ یہ شبہات سامنے آتے ہیں کہ :-

۱ - اگر واقعی اسی نے انسان پیدا کیا ہے تو کیوں ایسے افراد اس نے پیدا کئے جو مفلوج و محتاج ہیں اور ذہنی حیثیت سے صد درجہ پست

۲ - مجرموں، دیوانوں اور بے عقل لوگوں کو پیدا کرنے میں اس کی کیا مصلحت تھی۔ کیا کوئی ایسی قوت کی طرف سے جسے فراست کل اور قوت مطلق کہتے ہیں، ان نقایص تخلیق کی کوئی معقول توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے۔

۳ - اگر خدا تمام امور عالم کا مدبر و منظم ہے تو کیا وہ ان بادشاہوں کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے جنھوں نے دنیا میں سوا ظلم کے اور کچھ نہیں کیا ؟ کیا وہ ان تمام لڑائیوں کا ذمہ دار نہیں ہے جن میں لاکھوں بے گناہوں کا خون بہایا جاتا ہے ؟

۴ - کیا وہ دور غلامی اس کی مرضی کے موافق نہ تھا جب صدیوں تک ہزاروں بیگناہ انسانوں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان بنی رہی اور بے شمار ماؤں کے مضطرب سینوں سے اُن کے بلکتے ہوئے بچے جدا جدا کر کے قتل و ذبح کر دئے گئے۔

۵ - کیا وہ اُن مذہبی تعذیبات کا ذمہ دار نہیں جو بے گناہ انسانوں کے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دینے اور شکنجے میں تان تان کر ایک ایک جوڑ علحدہ کر دینے پر مشتمل تھے۔

۶ - خدا نے کیوں ظالموں اور بدکرداروں کو مہلت دی کہ وہ بہادروں اور نیک کرداروں کو پامال کریں۔

۷ - خدا نے کیوں کافروں کو اس کا موقع دیا کہ اس کے خاص بندوں کو عذاب میں مبتلا کریں۔ اگر ایک رحم و کرم والا خدا واقعی کائنات کا مدبر ہے تو یہ آئے دن کے طوفانوں، زلزلوں، وباؤں اور خشک سالیوں کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے ؟۔ سل و دق، سرطان و خناق اور اسی طرح سیکڑوں بیماریاں پیدا کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے، جن سے نہ معصوم بچے جاں بر ہو سکتے ہیں نہ زاہد و مرتاض انسان۔

درندوں کا انسانوں کو پھاڑ کر کھاتے رہنا، زہریلے سانپوں کا لوگوں کو ڈستے رہنا اور خدا کا کچھ نہ کہنا عجیب معمہ ہے۔

۸۔ کیا اس نے ناخن و چنگال اسی لئے پیدا کئے کہ وہ گوشت کے ریشے جدا کرتے رہیں، کیا اس نے پر و بال اسی لئے بنائے ہیں کہ معذور و بیکس آسانی سے گرفت میں آسکیں، کیا اس نے جراثیم اسی لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ انسانوں کو اندھا، کوڑھی، مسلول و مدقوق بناکر اپنی بھوک مٹائیں۔

۹۔ کیا کائنات کی تنظیم اسی طرح ممکن تھی کہ ایک جاندار کی زندگی دوسرے جاندار کے گوشت و خون پر منحصر ہو، اور کیا تدبیر عالم آہ اور کراہ کا ہنگامہ پیدا کئے بغیر محال تھی؟ پھر ان واقعات و حالات پر غور کرو اور سمجھو کہ مذہب کیا ہے؟

وہ دراصل نام ہے صرف ایک بے بنیاد خوف کا، وہ خوف جو خود ہی ایک قربانگاہ بناتا ہے اور خود ہی اس پر قربانیاں چڑھاتا ہے۔ خود ہی ایک معبد طیار کرتا ہے اور خود ہی وہاں جھک جاتا ہے۔

مذہب ہمیں وہی باتیں سکھاتا ہے جو صرف ایک غلام ہی کے لئے موزوں ہیں۔ اطاعت، فرمانبرداری، نفس کشی، صبر و تحمل، عدم مقاومت اور اپنے آپ کو مٹا دینا۔

خودمختاری، سرفرازی، خود اعتمادی، جرأت و اقدام کا وہاں کوسوں پتہ نہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ خدا مالک ہے اور انسان اس کا غلام، لیکن مالک چاہے کتنا ہی بڑا ہو غلامی کو خوشگوار نہیں بنا سکتا۔

اگر خدا کا وجود ہے تو ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ وہ رحم و کرم والا بھی ہے وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں، کروڑوں غریب و جفاکش انسان ہل چلا رہے ہیں، کھیتیاں بو رہے ہیں اور ان کی زندگی کا انحصار صرف اسی محنت پر ہے لیکن وہ پانی نہیں برساتا، کھیتیاں مرجھا رہی ہیں لیکن پانی کا ایک قطرہ نہیں گرتا، کروڑوں انسان اپنی مایوس و منتظر آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں، لیکن سوا جھلسا دینے والے آفتاب کے بادل کا ایک ٹکڑا بھی انھیں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔ خدا ان کے دل کے اضطراب کو دیکھتا ہے اور رحم نہیں کھاتا، ان کی اشک آلود آنکھوں کو دیکھتا ہے اور خاموش ہے، بچے ماؤں کی خشک چھاتیوں سے لگے ہوئے بلک رہے ہیں اور دودھ نہیں پاتے، مائیں آنچل پھیلا پھیلا کر اپنے بھوکے بچوں کا واسطہ دے دے کر دعائیں مانگ رہی ہیں، لیکن کوئی سننے والا نہیں، پھر کیا خدا کا رحم و کرم ثابت کرنے کے لئے باد سموم کے ان جھونکوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو بستیوں کی بستیاں تباہ کر جاتے ہیں اور میدانوں کو لاشوں سے بھر دیتے ہیں، کیا اس کی شفقت و محبت کے ثبوت میں زلزلوں کو پیش کیا جا سکتا ہے، جب زمین ہزاروں انسانوں کو نگل جاتی ہے کیا آتش فشاں پہاڑوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کے شعلے بچے بوڑھے کی بھی تمیز نہیں کرتے۔

کیا اگر یہ تباہکاریاں نہ پائی جائیں تو ہم کو یہ شک کرنے کا موقع ملے گا کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے غافل ہے، کیا اگر زلزلہ و طوفان قحط و وبا کی مصیبتیں نازل نہ ہوں تو ہم کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ خدا مہربان نہیں ہے۔

الٰہیات والے کہتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو یکساں پیدا نہیں کیا، اس نے قد و قامت، رنگ و صورت، ذہن و فراست کے لحاظ سے قوموں کو ایک دوسرے سے متمایز کر دیا ہے، تو کیا بلند قوموں کو خدا کا شکر نہ ادا کرنا چاہئے کہ اس نے انھیں پست نہیں بنایا۔ یقیناً شکر کی بات ہے، لیکن اس صورت میں کیا پست قومیں اس بات کا شکریہ ادا کریں گی کہ خدا نے انھیں جانور نہیں بنایا؟

جب خدا نے بلند و پست قوموں کو بنایا تھا تو کیا یہ بات اس کے علم میں نہ تھی کہ بلند قومیں پست قوموں کو اپنا غلام بنائیں گی ان کو ایذا پہونچائیں گی اور تباہ و برباد کر دیں گی۔

کیا وہ نہ جانتا تھا کہ یہ بلند و پست کا امتیاز دُنیا میں کتنا خون بہائے گا، نوعِ انسانی کو کن کن مصائب میں مبتلا کرے گا، کتنے میدان لاشوں سے پاٹ دے گا، کتنے غلاموں کے جسم کا گوشت کوڑوں کی ضرب سے پارہ پارہ کرے گا، کتنے ماؤں کے دل ان کے بچّے جدا کر کرکے تڑپائے گا، پھر اگر یہ سب کچھ اس کے علم میں ہوا تو کیا اس کا رحم و کرم اس سے زیادہ دلدوز مناظر کا منتظر تھا۔

وہ قید خانے جن کی سنگین دیواروں سے سر ٹکرا کر دنیا کے بہت سے بلند اخلاق والے انسانوں نے اپنی جانیں دیدیں، وہ سولیاں جو مقدس انسانوں کے خون سے رنگین بنائے جانے کے لئے نصب کی گئیں، وہ غلاموں کی جماعتیں جن کی پیٹھ کے زخموں کو خشک ہونے کا کبھی موقع نہیں دیا گیا، وہ مقدس ہستیاں جن کا ایک ایک جوڑ شکنجہ میں تان تان کر علٰحدہ کیا گیا، جن کی کھالیں کھنچوا کھنچوا کر بھس بھروایا گیا، وہ بے شمار انسان جو قحط و وبا کا شکار ہوئے، جن کو زمین نے نگل کر ڈکار تک نہ لی، جن کو سانپوں نے ڈسا، آتش فشاں پہاڑوں نے جھلسایا اور وہ لاتعداد بدکار ظالم انسان جنھوں نے دُنیا میں تمام مظالم توڑے اور کامیاب زندگیاں بسر کیں۔ کیا یہ اور اسی طرح کے تمام سمجھ میں نہ آنے والے واقعات رحم و کرم والے خدا کے علم سے باہر تھے اور یہ سب کچھ بغیر اس کی مرضی کے ہوا؟

انسان نے ہمیشہ کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی کا دامن پکڑنا پسند کیا۔ اگر اس نے پتّھر کو پوجنا چھوڑا تو ایک اور غیر معلوم قوت کے سامنے جھک گیا۔ جس کو وہ صحیح راہ دکھانے والا باور کرتا ہے، لیکن حقیقت کیا ہے؟

انسان فطرتاً اقدام پسند واقع ہوا ہے، وہ ہمیشہ آگے قدم بڑھاتا ہے اور تجربات اس کو بتاتے ہیں کہ اس نے جو قدم اُٹھایا تھا وہ صحیح تھا یا غلط؟

ایک آدمی کسی جگہ کا ارادہ کرکے چل پڑتا ہے وہ ایک ایسی جگہ پہونچتا ہے جہاں دو راستے پھٹتے ہیں، وہ بایاں راستہ اختیار کر لیتا ہے لیکن اسے کچھ دور چل کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستہ غلط تھا، وہ واپس آتا ہے اور داہنے ہاتھ کا راستہ اختیار کرکے منزل تک پہونچ جاتا ہے اس کے بعد وہ اس جگہ پہونچنے میں غلطی نہیں کرتا اور ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قوت نے کیا رہنمائی اس کی کی۔

ایک بچہ شعلہ کی چمک دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جل جاتا ہے، اس کے بعد پھر یہ جرأت وہ کبھی نہیں کرتا۔ تو کیا یہ سبق اس کو اس قوت نے دیا یا خود اس کے تجربہ نے۔

حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کے تجربات میں وہ خود وہ قوت پنہاں ہے جو صحیح راستہ بتانے والی ہے، یہ قوت ادراک و ارادہ سے بالکل معرا ہے اور اس کا نام ہے تجربہ۔

بہت سے لوگ ضمیر اور احساس اخلاق کے وجود کو وجود خدا کی دلیل بتاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرتاً تمدن پسند واقع ہوا ہے اور خاندانوں، قوموں اور قبیلوں کی صورت میں ہمیشہ زندگی بسر کرتا چلا آیا ہے، پھر قبیلہ کے جن افراد نے خاندانی دعائی مسرتوں میں اضافہ کیا وہ اس کے اچھے اعضاء شمار کئے گئے اور جنھوں نے تکلیفیں پہونچائیں انھیں بُرا سمجھا گیا اور یہیں سے اخلاق کے اچھے بُرے ہونے کا معیار قایم ہوا۔

وحشی قوموں میں ہمیشہ فوری نتایج پر غور کیا جاتا ہے، لیکن ترقی یافتہ قوموں میں نتایج بعیدہ کو سامنے رکھا جاتا ہے اور اس طرح اخلاق کا معیار بلند تر اور فرض شناسی کا احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی مافوق الفطرت قوت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مذہب کبھی انسان کے دل میں جذبۂ رافت و اُلفت پیدا نہیں کر سکا اور اس کے ثبوت میں مذہبی تاریخ کے وہ اوراق پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔

مذہب، علم و تحقیق کا ہمیشہ دشمن رہا ہے اور اس نے کبھی ذہنی آزادی کا ساتھ نہیں دیا۔

مذہب کبھی انسان کو محنتی، جفاکش اور ایماندار بنانے میں کامیاب نہیں ہوا، چنانچہ وحشی اقوام کی بُرائیوں کا سبب صرف ان کی مذہبی واہمہ پرستی ہے۔

وہ لوگ جو فطرت کی یکسانیت کے قایل ہیں، ان کے لئے مذہب کا خیال کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

کیا انسان، فطرت اور صفات مادہ کو اپنی دعاؤں سے متاثر کر سکتا ہے، کیا ہم طوفانوں کو پوجا پاٹ کے ذریعہ سے کم و بیش کر سکتے ہیں، کیا ہم قربانیاں پیش کر کے ہواؤں کا رخ بدل سکتے ہیں، کیا ہم الحاح و زاری سے بیماری کا علاج کر سکتے ہیں۔ کیا عزت و سربلندی ہمیں بھیک مانگنے سے مل سکتی ہے ؟

وہ چیز جسے ہم نفس کہتے ہیں، کیا وہ قانون قدرت کا اسی طرح پابند نہیں جس طرح ہمارا جسم ؟

مذہب کی بنیاد اس خیال پر قایم ہے کہ عالم فطرت کا کوئی ایک مالک ہے جو دعاؤں کو سنتا ہے، اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے اور جزا و سزا دیتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ واقعات کی دنیا میں کوئی ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ہمیں ان اعتقادات کی تصدیق ہو سکے۔

جب ہم کوئی نظریہ قایم کرتے ہیں تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی بنیادی حقیقت ضرور ہوا کرتی ہے، محض وہم و قیاس پر کوئی اصول مرتب نہیں ہو سکتا اس لئے انکار خدا کے لئے چند بنیادی حقایق بھی ہیں۔

مثلاً ایک یہ کہ مادہ و قوت فنا نہیں ہو سکتے، دوسرے یہ کہ مادہ و قوت ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں ہو سکتے، تیسرے یہ کہ جو چیز غیر فانی ہے وہ غیر مخلوق ہے، قدیم ہے۔

دُنیا میں ذہانت و ذکاوت کا وجود صرف قوت کی وجہ سے ہے اور قوت بغیر مادہ کے ممکن نہیں اس لئے معلوم ہوا کہ ذکاوت صرف قوت و مادہ کی ممنون ہے اور اس باب میں کسی ایسی مافوق الفطرت ہستی کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے جسے مدبر کائنات کہا جائے !

اگر مادہ و قوت ازلی و ابدی ہیں تو جو کچھ ممکنات میں تھا وہ واقع ہوا، جو ممکنات میں ہے وہ ظاہر ہو رہا ہے اور آیندہ بھی رونما ہوتا رہے گا۔ کائنات میں اتفاق کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور پایا جاتا ہے، جس چیز کو ہم حال کہتے ہیں وہ ماضی کی پیداوار ہے اور جس کا نام مستقبل ہے وہ نتیجہ ہوگا حال کا، انسان سے لیکر رینگنے والے کیڑے کی حرکت تک سب اسی قانون کے جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف کسی بات کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔

ہزاروں سال سے دُنیا کی اصلاح کی کوشش جاری ہے اور اس غرض کے لئے دیوتا، دیویاں، بہشت و دوزخ، الہامات و معجزات، کلیسا و خانقاہ، قید خانے اور شکنجے، سیکڑوں چیزیں پیدا کی گئیں، ایک بادشاہ کو تخت سے اُتار کر دوسرے کو بٹھایا، ایک ملکہ کی گردن مار کر دوسری کو تخت نشین کیا، آدمیوں کو زندہ جلایا، فوج کشیاں کی گئیں، دُعائیں مانگی گئیں، ڈرایا گیا، لالچ دی گئی، الغرض مذہب نے سبھی کچھ کیا لیکن مقصد آج تک پورا نہ ہوا۔ کیونکہ مذہب غلامی ہے ذہن و دماغ کی اور جب تک انسان کا ذہن آزاد و بیدار نہ ہو

نوعِ انسانی کی فلاح مجموعی حیثیت سے ناممکن ہے۔

(۲)

سیدھا راستہ

ہمارے سامنے دو راستے ہیں، ایک وہ جو فطرت اور عالم اسباب کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے اور دوسرا وہ جو مافوق الفطرت باتوں کی جانب مایل کرتا ہے۔

ان دونوں راستوں میں کیا فرق ہے؟

ایک بتاتا ہے کہ زندگی نام ہے اپنے اور دیگر ابناءِ جنس کے ساتھ ہمدردی رکھنے اور ان کے لئے اسباب راحت وسکون فراہم کرنے کا۔ دوسرا کہتا ہے کہ حیاتِ انسانی کا مقصد خداؤں اور دیوتاؤں کی پرستش ہے جو دوسری دنیا میں ہمارے اس تمام عجز و انکس[ار] کا ابدی معاوضہ دیں گے۔ ایک کہتا ہے کہ اپنے حواس و ادراک کی اس روشنی سے کام لو جو خود تمہارے اندر پائی جاتی ہے، دوسرا کہتا ہے اس مقدس روشنی کو گل کردو۔

ایک زمانہ تھا جب لوگ یقین کرتے تھے کہ خدا ایک مستبد بادشاہ ہے جس کو ذرا ذرا سی بات ناگوار ہوجاتی ہے اور وہ سزا دینے پ[ر] اُتر آتا ہے، ان کی حیات کا کوئی لمحہ خوف سے خالی نہ گزرتا تھا اور ہر وقت وہ اسی ڈر سے کانپتے رہتے تھے کہ مبادا کوئی ان سے خفیف سی خفیف گستاخی سرزد ہوجائے اور خدا ناراض ہوکر انھیں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دے۔

طوفان آتا تھا تو وہ سمجھتے تھے کہ یہ نتیجہ ہے انھیں کی بداعمالیوں کا، زلزلہ آتا تھا تو وہ یقین کرتے تھے کہ خدا ان پر برہم ہو رہا ہے وبائی بیماریاں پھیلتی تھیں تو وہ اسے بھی اپنے ہی گناہوں کی پاداش جانتے تھے، اور جب چاند، سورج کو گہن لگتا تھا تو اسے بھی اپنی ہی خطاؤں کا نتیجہ باور کرتے تھے۔

آخرکار ایک زمانہ آیا جب بعض افراد سوچنے والے دماغ کے پیدا ہوئے، انھوں نے سمجھا کہ طوفانوں اور زلزلوں کے اسباب طبیعی کچھ او[ر] ہیں۔ سورج گرہن کے لئے ایک زمانہ معین ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ سیاروں کی گردش، کرۂ زمین کے جغرافی حالات، آب و آتش کے خواص، مظاہر فطرت کے اسباب، حیاتِ انسانی کی خصوصیات، اعضاءِ جسم کے وظائف معلوم کئے گئے اور واہمہ پرستی کی زنجیر کی کچھ کڑیاں ٹوٹیں۔

اس کے بعد کچھ زمانہ اور گزرا یہاں تک کہ مدارس کی بنیادیں پڑیں، کتابیں تصنیف کی گئیں، مفکرین کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی، علم[ی] انکشافات نے انسان کے دماغ کو منور کرنا شروع کیا، فکر و خیال کی آزادی بڑھی اور مافوق الفطرت کی جگہ فطرت اور اصولِ فطرت نے لے لی۔

ظاہر ہے کہ مفکرین کے مقابلہ میں "معتقدین" کوئی علمی و عقلی دلیل تو پیش نہ کرسکتے تھے، اس لئے اہلِ علم کے خلاف جہل و تعصب کے جتنے گندے حربے موجود ہیں، ان سب کا استعمال بیک وقت شروع کردیا گیا۔ ان کو ذریاتِ شیطان بتایا گیا، خدا کا دشمن ظاہر کیا گیا، ان کے مٹادینے کا نام مذہبی جہاد قرار پایا اور تعذیب و تذلیل کی جتنی مہیب صورتیں ہیں وہ سب بروئے کار لائی گئیں۔

پھر یہ سب کچھ چند دن کا ہنگامہ نہ تھا، بلکہ یہ خون آشامیاں صدیوں تک جاری رہیں اور اس سلسلہ میں کوئی جرم ایسا نہ تھا جس کا ارتکا[ب] [illegible] ہم پر جائز و مستحسن نہ قرار دیا گیا ہو۔

ان کا فلسفۂ حیات یہ تھا کہ مال و دولت کو ٹھکرا دیا جائے، راحت سے نفرت کی جائے، یہ لوگ فنون لطیفہ کے دشمن تھے، اچھی غذا، اچھے لباس، اچھے مکانوں سے متنفر تھے، گویا یوں سمجھئے کہ حکماء تھے غربت و افلاس کے، تشنگی و گرسنگی کے جھونپڑوں کے، چیتھڑوں کے، برہنہ پائی کے اور ایک ایسے آہستہ رد عمل خودکشی کے جو نعتاً نہیں بلکہ تدریجاً قوم کی قوم ہلاک کر دینے والا ہے۔

الغرض یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے دنیا کو ویران و غیر دلچسپ رکھنے کے لئے صدہا سال تک جہاد کیا اور کچھ زمانہ تک انھیں کامیابی بھی حاصل رہی لیکن ذہنی و عقلی آزادی بجائے خود ایسی زبردست لذت ہے کہ ایک بار چکھ لینے کے بعد اس کا چھوڑنا محال ہے، اس لئے اس کا ذوق رفتہ رفتہ عام ہوتا گیا اور ذہن و خیال کی دنیا ہی بدل گئی۔

چنانچہ یہ اعتقاد کہ بادشاہ کو خدا بنا کر بھیجتا ہے اور رعایا کا کام صرف اس کی اطاعت ہے، اب ختم ہو گیا، عقیدہ کہ مذہب خدا کی بنائی ہوئی چیز ہے اور اس کے بتلائے ہوئے اصول و عقاید کو بغیر چون و چرا تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے بہت کچھ مٹ گیا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے بادشاہ بھی رفتہ رفتہ فنا ہو رہے ہیں اور مذہبی حکومتیں بھی محو ہوتی جا رہی ہیں۔

آپ کسی مذہب والے سے دریافت کیجئے وہ اپنے سوا تمام دنیا کو گمراہ بتائے گا اور اسی خدا کو قابل پرستش قرار دے گا جو اس نے وضع کیا ہے، دوسرے مذاہب و اقوام کے خداؤں کو جھوٹا بتائے گا۔ وہ سوا اپنے معبد کے کسی اور عبادت گاہ کی عزت نہ کرے گا سوا اپنے طریق عبادت کے وہ کسی اصول بندگی کا احترام نہ کرے گا، وہ اپنی قربانیوں کے مقابلہ میں دوسرے مذہب کی قربانیوں کو لغو و بیکار بتائے گا۔ گویا اسی کا خدا، خدا ہے اور اسی کا پیغمبر پیغمبر۔ اسی کی کتاب الہامی صحیفہ ہے اور اسی کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

الہامی مذاہب خدا کو قادر مطلق، بے نیاز اور کسی چیز سے متاثر نہ ہو سکنے والا بتاتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ کتب مقدسہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو غصہ بھی آتا ہے، وہ انتقام بھی لیتا ہے اور اپنے بندوں میں سے ایک کے ساتھ رعایت اور دوسرے کے ساتھ ظلم بھی کر سکتا ہے۔

عدن میں آدم و حوا کو خود ہی پیدا کرتا ہے اور نافرمانی و سرکشی نہیں بلکہ معمولی سی غلطی پر خود ہی اس قدر برہم ہو جاتا ہے کہ عدن سے انھیں اٹھا کر زمین پر پھینک دیتا ہے اور نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کی اولاد کے لئے بھی تمام عمر غم و غصہ میں مبتلا رہنا مقسوم کر دیتا ہے۔ خدا اور اتنا غصہ، خالق اور اپنی مخلوق پر اتنی برہمی! اگر وہ جانتا تھا کہ ان سے یہ غلطی ضرور ہو گی تو پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی اور اگر پیدا کیا تھا تو کیا اسکے اختیار میں نہ تھا کہ وہ غلطی نہ کر سکنے والی مخلوق پیدا کرتا۔ خود ہی ان کو پیدا کیا، خود ہی برہم ہو کر انھیں مبتلائے آلام کر دیا، عجیب تماشہ ہے۔

الہامی صحایف خدا کے غصے اور جنگ و قتال کے احکام سے بھرے پڑے ہیں۔ قوموں کو اس نے برباد کیا، بستیوں کو اس نے ویران کیا، وبائیں اس نے مسلط کیں، آسمانی عذاب اس کے نازل کئے، حالانکہ انسان کی سرکشی یا نافرمانی بھی اس کی پیدا کی ہوئی چیز تھی اور خود اسی کی مرضی تھی کہ وہ ایسا کرے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جب انسان کو (جن میں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے) تباہ کرنا مقصود تھا تو ان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور پیدا کیا تھا تو کیا اسکے اختیار میں نہ تھا کہ انھیں معصوم پیدا کرتا ایک بار وہ ساری دنیا کو سوا آٹھ آدمیوں کے طوفان میں غرق کر دیتا ہے اور تمام زمین کو لاشوں سے پاٹ دیتا ہے اس کے بعد وہ صرف یہودیوں کو لطف و کرم کا مستحق سمجھتا ہے اور باقی تمام مخلوق کو بغیر کسی سبب کے مردود قرار دیتا ہے نہ وہ اہل مصر کی طرف

متوجہ ہوتا ہے نہ اہلِ ایران کی طرف، نہ اسیریوں کو قابلِ اعتناء خیال کرتا ہے نہ یونانیوں کو (حالانکہ ان سب کا خالق بھی وہی تھا) اور صدیوں تک صرف ایک فرقہ کا خدا بنا رہتا ہے ———— کیوں ؟

خدا ایک قوم کو حکم دیتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے جنگ کرکے ان کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرے اور جو زندہ ہاتھ آجائیں انھیں لونڈی، غلام بنائے۔ اس کے علاوہ وہ ادارہ غلامی قایم رکھنے کے لئے ان کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دیتا ہے بادشاہوں کے جرایم کے عوض میں رعایا کو ہلاک کرنا مناسب سمجھا جاتا ہے اور بغیر کسی وجہ کے اپنے بندوں میں سے کسی ایک جماعت سے خوش ہوجاتا ہے اور دوسری سے برہم ۔ اس کا سبب ؟

صحت و امراض کے متعلق بعض مذاہب کا نظریہ یہ ہے کہ بیماریاں ارواحِ خبیثہ سے پیدا ہوتی ہیں جو جسم انسانی میں حلول کر جاتی ہیں اور ان ارواحِ خبیثہ کو مذہب کے نفوس مقدسہ ہی دور کر سکتے ہیں۔

جب تک مسیح زندہ رہے ان کی عمر شیاطین اور ارواحِ خبیثہ کے دور کرنے میں بسر ہوئی اور بعد کو ان کے مقدس راہبوں نے صدیوں تک یہ خدمت انجام دی، چنانچہ ازمنۂ وسطیٰ میں لاکھوں کروڑوں شیاطین اسی طرح بھگائے جاتے رہے اور امراض کا علاج جھاڑ پھونک، دُعا، تعویذ اور گنڈوں سے ہوتا رہا۔

آخر کار جب علم بڑھا تو آہستہ آہستہ امراض کے طبیعی اسباب کا بھی علم ہوا اور ان کے دور کرنے کی طبیعی تدابیر بھی رائج ہوئیں چنانچہ اس وقت سوا جاہل ممالک کے جنات یا شیاطین یا ارواحِ خبیثہ کا عقیدہ بالکل اٹھ گیا۔

مذاہبِ عالم اور کتب مقدسہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بالکل الہامی ہیں اور انسانی فکر کو ان میں دخل نہیں، اور ہم کہتے ہیں کہ صحفِ مقدسہ سب انسانوں کے دماغ کا نتیجہ ہیں اور مذہب رونما ہوا ہے صرف اس جذبۂ خوف سے جو حوادثِ طبیعی و مظاہر قدرت کو دیکھ کر انسان کے دل میں پیدا ہوتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب خود انسانوں نے وضع کئے تھے اور خدا و الہام خداوندی سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا جن کتابوں کو وہ الہامی کہتے ہیں وہ بھی انسان ہی کے دماغ کا نتیجہ تھیں اور اسی لئے ہر قوم و زمانہ کے لحاظ سے ان میں مختلف خیالات و تعلیمات پائی جاتی ہیں۔ نہ خدا کو طاعت و عبادت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کی دُعا سُنتا ہے، اہل دنیا پر ہزاروں مرتبہ قحط و وبا، طوفان و سیلاب کی مصیبتیں نازل ہوئیں اور کوئی دُعا انھیں دور نہ کر سکی، زلزلے آتے رہے۔ جوالا مکھی آگ برساتے رہے، ہزاروں معصوم نفوس فنا ہوتے رہے اور انسان کی کسی گریہ و زاری نے خدا کو اس ہلاکت باری سے باز نہ رکھا۔ کھیتیاں سوکھتی رہیں اور انسانوں کی دعائیں ایک قطرہ پانی کا نہ حاصل کر سکیں، وبائیں پھیلتی رہیں اور خدا کے نام پر لکھے ہوئے تعویذ کسی ایک متنفس کو بھی ہلاکت سے نہ بچا سکے، غلاموں کی پیٹھ کوڑوں سے لہولہان ہوتی رہی، عورتوں کی عصمت دری کو علی الاعلان جائز رکھا گیا، شیر خوار بچے ماؤں کی آغوش سے چھین چھین کر بازاروں میں فروخت کئے گئے اور ان کی فریاد و زاری ایک لمحہ کے لئے خدا کو متوجہ نہ کر سکی۔

اخلاقیات کے باب میں اہلِ مذہب کا عقیدہ ہے کہ خدا نے جس فعل سے باز رکھا ہے وہ بری ہے اور جس کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ اچھا ہے

خود بندہ کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ خود کسی فعل کے مستحسن یا قبیح ہونے پر رائے زنی کرے، گویا مذہبی انسان کسی اچھے کام کو خود اچھا سمجھ کر انجام نہیں دیتا بلکہ فرمانِ خداوندی کی تعمیل سمجھ کر اس کو اختیار کرتا اور صرف اس خوف سے کہ مبادا خدا برہم ہو جائے اور اسے عذاب میں مبتلا کرے۔

تقریباً تمام اہلِ مذاہب کا عقیدہ ہے کہ ایک انسان اچھے اخلاق کا ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ وجودِ خدا کا قایل نہ ہو اور اگر کسی میں یہ صفت پائی بھی جائے تو بغیر خدا کو مانے ہوئے وہ بالکل بیکار ہے۔

علماءِ اخلاقیات کا نظریہ یہ ہے کہ نیکی و بدی اشیاء کی فطرت میں موجود ہے، بعض افعال ایسے ہیں جو انسانی مسرت کا باعث ہوتے ہیں اور بعض آزار و مصائب کا سبب بن جاتے ہیں، چنانچہ اول الذکر افعال کو ہم اخلاق حسنہ کہتے ہیں اور موخر الذکر کو افعال قبیحہ یا معصیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اخلاق انسانی کا تعلق اسی دُنیا سے ہے اور یہیں ان کے نتائج دیکھ کر اُن کے بُرے یا اچھے ہونے کا اُصول قایم کیا گیا ہے، نہ خاندان سے متاثر ہوتا ہے اور نہ دوسری دنیا میں ان کا محاسبہ کر کے جزا و سزا دینے کی ضرورت، چوری کو بُرا سمجھنے کے لئے کسی الہام کی ضرورت نہ تھی، انسان کے تجربے نے اس کے نقصانات دیکھ کر خود اسے بُرا قرار دیا۔ تمام وہ جرایم جو انسان کو جسمانی اقتصادی و عمرانی نقصان پہونچاتے ہیں، ان سے اپنے آپ کو محفوظ رہنے کا احساس ہر شخص فطری طور پر پایا جاتا ہے اور یہی وہ احساس تھا جس نے اسے بتایا کہ نیکی کسے کہتے ہیں اور بدی کس کو۔

پھر جو چیز اس لحاظ سے بُری ہے وہ یقیناً بُری سمجھی جائے گی، خواہ مذہب کے نزدیک اچھی ہو۔ واقعات و تاثرات کو کوئی قوت بدل نہیں سکتی، جس طرح قدرت ایک مربع کو دائرہ ثابت کرنے سے عاجز ہے، اسی طرح وہ کسی بُری بات کو اچھی اور اچھی کو بُری نہیں بنا سکتی — الغرض اہلِ مذہب نے جو نظریۂ اخلاق قایم کیا ہے اس پر ایک انسان کبھی فخر نہیں کر سکتا، ایک شخص نیک کام کرتا ہے صرف اس ڈر سے کہ خدا کا حکم ہے اور اس طمع سے کہ اس کا انعام دوسری دُنیا میں ملے گا، دوسرا اچھے اخلاق اختیار کرتا ہے صرف اس بنا پر کہ یہ اس کا انسانی فرض ہے اور نیکی آپ اپنی جزا ہے اور دونوں کے فرق کو ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔

الغرض اس وقت دو راستے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک وہ جو مذہب کی طرف ہم کو لے جاتا ہے اور دوسرا وہ جو عقل کی طرف رہبری کرتا ہے سو اول الذکر کا تجربہ بہت کافی ہو چکا ہے اور ہمیشہ اس کا نتیجہ ایک ہی نکلا ہے۔

فلسطین میں اس کا تجربہ کیا گیا لیکن اہلِ فلسطین کی مذہبیت اُن کو تباہ و برباد ہونے سے نہ بچا سکی، وہ مفتوح و مغلوب ہو کر خارج البلد کئے گئے، صدیوں تک امدادِ خداوندی کا انتظار کرتے رہے اور اس توقع پر زندہ رہے کہ خدا انھیں پھر مجتمع کرے گا، ان کی بستیوں، ان کے معبدوں اور قربانگاہوں کو از سرِ نو تعمیر کرے گا، لیکن صدیوں پر صدیاں گزرتی گئیں اور ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔

اس کا تجربہ سوئٹزرلینڈ میں کیا گیا لیکن وہاں بھی سوا غلامی کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں اور صرف انھیں لوگوں کو آزادی کے ساتھ بولنے کا حق حاصل رہا جو صاحبِ ثروت تھے، عوام سے ان کی تمام راحتیں چھین لی گئیں اور راستے لئے ہنسنا ممنوع قرار پایا اور سوا رنج و غلامی کے کچھ نہ ملا۔ ان لوگوں نے اوراد و وظایف، روزہ، صلوٰۃ، وعظ و پند کو بھی آزما کر دیکھ لیا لیکن کوئی چیز انھیں مسرت و راحت سے آشنا نہ کر سکی۔

اسکاٹ لینڈ میں بھی مذہب کا تجربہ ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی ماننے والی تمام آبادی کو خوش قسمت لیکن ظالم کرکوں کا غلام بن کر رہنا پڑا۔ پادری ہر خاندان میں گھس جاتے تھے اور خوف و واہمہ پرستی پھیلا پھیلا کر لوگوں کی عقلیں سلب کر لیتے تھے، وہ اپنی ہدایات کو الہام ربانی کہتے تھے اور ان سے انحراف کرنے والے کو عذاب خداوندی کا مستوجب قرار دیتے تھے۔ پھر اس مذہبی حکومت میں بھی وہی ہوا جو ہونا چاہئے۔ انسان غلام تھا اور غلامی کے ناقابل برداشت بار سے اس کی پیٹھ جھکی جا رہی تھی۔

انگلستان میں مذہبی حکومت نے جو گل کھلائے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں، اس زمانہ کے قانون، اس زمانہ کے اوہام و تعصبات اسقدر سخت تھے کہ خدا کی پناہ، پادری خدا کے بیٹے بنے ہوئے آسمان و زمین کی ملکیت کا دعوے کر رہے تھے، بہشت و دوزخ کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں تھیں اور جس کو جہاں جی چاہتا تھا ڈھکیل دیتے تھے، نہ ان کے دلوں میں رحم تھا نہ آنکھوں میں مروت، ادنیٰ ادنیٰ سی غلطیوں پر خارج البلد کر دینا، کوڑے لگوانا اور قید و بند میں ڈال دینا معمولی بات تھی۔

ازمنۂ مظلمہ میں مذہبی زندگی کا جو نتیجہ ہوا وہ اور زیادہ بادم انسانیت تھا۔ ہزاروں سولیاں ہر وقت خون سے تر رہتی تھیں اور بے شمار تلواریں انسانی سینے میں پیوست۔ قید خانے کھچا کھچ بھرے رہتے تھے اور سیکڑوں انسان دہکتی ہوئی آگ کے اندر پڑے ہوئے تڑپا کرتے تھے۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو خدا کے نام پر روا نہ رکھا گیا ہو اور کوئی معصیت ایسی نہ تھی جس کا ارتکاب مذہب کے پردہ میں نہ ہوتا ہو۔ الغرض یہ تھا مذہبی حکومتوں کا رنگ جو اہل مذہب نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اب اس کے مقابلہ میں اس راستہ کو دیکھو جس کی رہنمائی عقل نے کی ہے، کیسا صاف و ہموار راستہ ہے، کیسی کھلی ہوئی فضا ہے، کیسی پُر بہار زمین ہے، ہر شخص دوسرے کا بوجھ ہلکا کرنے کی فکر میں ہے اور ہر دماغ اسی فکر میں ہے کہ بنی نوع انسان کی راحت و مسرت کا ساماں بہم پہونچائے، نہ وہاں سولیاں ہیں، نہ قیدخانے، نہ جہنم کے اژدہے ہیں، نہ فرشتوں کے کوڑے۔ قدرت کی وسیع فضا ہے جس سے ہر شخص یکساں فایدہ اٹھا رہا ہے، عقل و فراست کا ایک آفتاب ہے جو سب کو برابر مستفید کرنا چاہتا ہے، انسانیت کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، غلامی کا داغ اشرف المخلوقات کی پیشانی سے مٹ چکا ہے، ذہنی آزادی نے مختلف قسم کے چمن کھلا رکھے ہیں اور ہر فرد دوسرے سے ہم آغوش اور بغلگیر نظر آتا ہے۔

جس وقت ہم تاریک ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو جسم کا ریشہ ریشہ کانپ اٹھتا ہے۔ سب سے پہلے وہ تنگ و تاریک غار نظر آتے ہیں جہاں مقدس اژدہے کنڈلیاں مارے ہوئے قربانیوں کا انتظار کر رہے ہیں، ان کے جبڑے کھلے ہوئے ہیں، اُن کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں، آنکھیں چمک رہی ہیں اور زہریلے دانت خون آلود ہیں۔ جاہل ماں باپ اپنے معصوم بچوں کو اس افعی دیوتا کے حضور میں پیش کرتے ہیں وہ اس چیختے تڑپتے ہوئے بچے کو اپنے بل میں لپیٹ کر میں ڈانتا ہے اور بے رحم والدین اس ہدیہ کے قبول ہونے پر خوش خوش واپس جاتے ہیں اس کے بعد وہ عبادت گاہیں نظر آتی ہیں جن کو بڑے بڑے پتھروں سے طیار کیا گیا ہے، لیکن یہاں ان کی قربانگاہیں بھی خون سے رنگین ہیں اور مقدس پجاریوں کے خنجر معصوم لڑکیوں کے سینوں میں یہاں بھی پیوست نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور معبد سامنے آتے ہیں جہاں مقدس آگ کی روشنی کو انسانی گوشت و خون سے قایم رکھا جاتا ہے، پھر چند عبادت گاہیں اور دکھائی دیتی ہیں جن کی قربانگاہیں بیلوں اور بھیڑوں کے خون سے تر ہیں اس کے بعد کچھ اور معبد، کچھ اور پجاری، کچھ اور قربانگاہیں نظر آتی ہیں جہاں انسانی آزادی کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔ خدا کے معبد تو نہایت عظیم الشان ہیں، لیکن کسانوں کے پاس جھونپڑا تک نہیں، پجاریوں اور بادشاہوں

کے جسم زرکار عباؤں سے آراستہ ہیں، لیکن رعایا کے پاس جسم ڈھانکنے کو بوسیدہ سا چیتھڑا بھی نہیں، اور کیا دیکھتے ہیں؟ یہ کہ قیدخانے انسانوں سے بھرے ہوئے ہیں، خارج البلد خانماں برباد بوڑھے بچے، عورتیں پہاڑوں اور صحراؤں میں سر ٹکرا رہے ہیں، آلات تعذیب حرکت میں آ رہے ہیں اور لاکھوں انسانوں کی چیخ سے ناں فضا ہیں گونج رہی ہیں ۔۔۔ اُف، وہ تاریک قیدخانے، وہ زنجیروں کی جھنکار، وہ آگ کے بلند شعلے، وہ جھلسے ہوئے سیاہ چہرے، وہ اینٹھنے والے اعضاء وہ شکنجوں میں کسے ہوئے ہزاروں معصوم انسان اور وہ ان رگوں کے ٹوٹنے کی آوازیں، اس کے بعد جو میری نگاہ اُٹھتی ہے تو افق میں مجھے ایک نئی روشنی نظر آتی ہے، انسانی جسموں کے راکھ کے ڈھیر سے ایک نیا آفتاب طلوع کرتا ہوتا ہے یعنی عقل و مذہب آزادی، اب غلامی کی زنجیریں آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی ہیں، قربانگاہیں فنا ہوتی جا رہی ہیں، عبادت گاہیں مسمار ہو رہی ہیں، زبان کی بندشیں جاتی ہیں اور ذہن و عقل کے قفل ٹوٹتے جا رہے ہیں، اب ہم پھر دیکھتے ہیں لیکن ماضی کی طرف نہیں بلکہ مستقبل کی طرف اور ہمیں نظر آتا ہے کہ پجاری اور بادشاہ ختم ہو چکے ہیں، قربانگاہیں اور تخت و تاج خاک میں مل چکے ہیں، امارتیں نیست و نابود ہو چکی ہیں اور تمام دیوتا مفقود ۔۔ ان کی جگہ ایک نیا مذہب ایجاد ہوا ہے جس کا نام آزادی ضمیر ہے اور ایک نئی سلطنت قائم ہوئی ہے جس کی ملکہ حریت فکر و رائے اور جس کی رعایا اخوت عامہ ہے، ہر جگہ امن و سکون ہے اور ہر شخص مطمئن ۔ نہ کوئی قیدخانہ ہے، نہ بیمارستان، نہ عدالت گاہیں ہیں، نہ جرم و معاصی کی داستان ۔ ایک ایسی دُنیا ہے جہاں سوا صداقت کے کسی چیز کا گزر نہیں، سوا حسن و جمال کے کوئی شے پیش نظر نہیں ۔ جدھر دیکھو نور کی بارش ہے اور انسانی دماغ کی کھیتیاں لہلہا رہی ہیں عقبیٰ کا خوف دُنیا کی مسرتوں میں تبدیل ہو چکا ہے اور خدا کا ڈر انسانیت کی محبت میں ۔

---

(۳)

روایت و معجزہ کی حقیقت

زندگی کا صحیح مقصود حصول مسرت ہے اور ذہن انسانی مجبور ہے کہ وہ مسرت کے واقعی اسباب و شرائط معلوم کرے، واضح رہے کہ مسرت سے مراد میرا صرف کھانا پینا نہیں، محض جسمانی راحت و آسائش نہیں، بلکہ بلند قسم کی وہ مسرت ہے جو ادائے فرایض کے بعد حاصل ہوتی ہے جو لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کے بعد محسوس ہوتی ہے جو فطرت کے مطالعہ اور حسن مجرد کے احساس سے پیدا ہوتی ہے اور جو آزادی ذہن و ضمیر کی پیداوار ہے ۔

لیکن آپ دیکھیں گے کہ دُنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مسرت کی خواہش کو ٹھکراتا ہے جو حریت فکر و رائے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، یہ گروہ اپنے آپ کو اہل مذہب اور "روحانیت پرست" کہتا ہے ۔ یہ وہ گروہ ہے جو احساسات مسرت کو وسوسۂ شیطانی کہتا ہے اور اس کی تمام خواہشات کا تعلق کسی دوسری دنیا سے ہے ۔ جس کا اصطلاحی نام اس نے "حیات بعد الموت" رکھا ہے، وہ کہتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنی "تسبیح و تحلیل" کے لئے منتخب کر لیا ہے، پیام ربانی کے لئے اُس کی زبان مخصوص ہے اور صداقت و حقیقت کا نام ہے صرف اس چیز کا جو اُس کے دل و دماغ سے پیدا ہو ۔

یہ جماعت اپنا ایک لٹریچر بھی رکھتی ہے، جسے مختلف ناموں سے مختلف قوموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس لٹریچر میں وہ سب کچھ ہے

جسے عقلِ انسانی کبھو تسلیم نہیں کر سکتی، اس میں تخلیق کائنات کا بھی ذکر ہے اور آفرینش انسانی کا بھی، اس میں تاریخ قدیم کے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں اور اخلاق کے درس بھی لیکن بایں ہمہ یہ محض روایت و داستان ہے جس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، یا پھر ان ہدایات کا مجموعہ ہے جو محض تعصب و تنگ نظری کی پیداوار ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ خدا کا ڈر دکھا کر اپنا اثر قایم کیا، انھوں نے ہمیشہ دنیا کو یہی یقین دلایا کہ اگر ان کی دعائیں شاملِ حال نہ ہوں تو نوعِ انسانی تباہ ہو جائے، پھر انھوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ جب کبھی انھیں اقتدار حاصل ہوا آزادی کو مٹایا گیا، مفکرین عالم کو قید میں ڈالا گیا، اربابِ فضل و کمال کو ذبح کیا گیا اور خدا کے نام پر ہر ظلم کو روا رکھا گیا۔

لیکن مذاہب کا ظہور، مذہبی کتابوں کی پیداوار، خانقاہوں کی تعمیر اور اہل خانقاہ کا وجود کوئی غیر فطری بات نہ تھی، بلکہ عہدِ وحشت کے غاروں سے لیکر موجودہ دورِ تہذیب تک انسان نے جو تدریجی ترقی کی ہے، اسی کے یہ لازمی مظاہر تھے۔

دُنیا کی تاریخ میں اتفاق کوئی چیز نہیں ہے نہ اس میں معجزہ و خرق عادات کو کوئی دخل حاصل ہے اور نہ غیبی مداخلت کو۔ ہر شے اور ہر حالت واقعات سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے اگر ہمارے اسلاف کے دلوں میں مذہب و روحانیت کا خیال پیدا ہوا تو وہ بالکل فطری خیال تھا کیونکہ ان کی عقل زیادہ سے زیادہ یہیں تک پہونچ سکتی تھی اور وہ اس کو سچ سمجھ کر پیش کرتے تھے۔

پھر اقوام عالم کی روایات مذہبی یا "اساطیر الاولین" پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد یکسر شاعرانہ تعبیروں اور قیاسات ضعیفہ پر قایم تھی۔ چنانچہ باغ عدن کی روایت کو دیکھئے کہ وہ دُنیا کی ہر قوم میں پائی جاتی ہے، کیونکہ جب وہ مصائب سے گھبرا اُٹھی تو اپنی تسکین کے لئے اس نے ایک ایسی دنیا کا تخیل پیدا کیا جہاں راحت ہی راحت ہے۔

اسی طرح طوفان کی روایت ایشیا و یورپ کے تمام قدیم قوموں میں پائی جاتی ہے، انھوں نے گھونگھے، سیپیاں اور لہروں کے نشانات، پہاڑوں، وادیوں اور میدانوں میں دیکھ کر خیال کیا کہ کسی وقت ضرور ساری دُنیا پر طوفان آیا تھا جس سے سوا چند مقبول بندوں کے کوئی جانبر نہ ہو سکا، توریت، انجیل اور کلام مجید کے علاوہ ہندوؤں میں بھی یہ روایت موجود ہے، منو نے ایک بار گنگا میں کوئی ظرف ڈبو کر پانی لیا۔ جس میں ایک مچھلی بھی آگئی، مچھلی نے التجا کی مجھے پھر پانی میں چھوڑ دیجئے، منو نے رحم کھا کر اسے پھر پانی میں چھوڑ دیا، لیکن مچھلی نے اس احسان کے عوض میں ان کو بتایا کہ ایک بڑا زبردست طوفان آنے والا ہے، آپ ایک کشتی بنا کر اس میں اپنے ساتھیوں کو بٹھا لیجئے، میں بروقت پہونچکر آپ کی مدد کروں گی۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے زندگی اور موت کے اسرار کو کس کس طرح سمجھنے کی کوشش کی اور ان کوششوں میں اس کے کتنے اندیشے، کتنی امیدیں، کتنی مسکراہٹیں اور کتنے آنسو شامل تھے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کا اولین مذہب "آفتاب پرستی" تھا اور یہ بالکل فطری بات تھی کیونکہ روشنی ہی زندگی ہے اور اسی سے زندگی میں حرارت قایم رہتی ہے، اپالو بھی سورج تھا، اگنی بھی سورج تھا، کرشن بھی سورج تھے، ہرقلس بھی سورج دیوتا تھا، جونا (یونس) بھی وہی تھا، اور یہ سب کے سب ۲۵ دسمبر ہی کے لگ بھگ پیدا ہوئے، سب نے چالیس دن کا روزہ رکھا، سب غیر طبعی موت سے مرے اور پھر زندہ ہوئے۔

الغرض جب ہم امم سابقہ کی مذہبی روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کوئی نئی بات نہیں پائی جاتی، ان کے تمام مراسم و عبادات کا رشتہ عہدِ قدیم ہی سے جا کر مل جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ عیسائیوں میں بپتسمہ یا اصطباغ کی رسم پائی جاتی ہے، لیکن یہ عیسویت سے بہت پہلے کی چیز ہے، ہندوؤں، مصریوں

یونانیوں اور رومیوں میں بھی مقدس پانی کا وجود پایا جاتا تھا۔ صلیب کا خیال بھی نہایت قدیم خیال ہے یہ علامت تھی غیر فانی ہونے کی، زندگی کی اگنی کی، قبر انسانی کی، اٹلی کی تمام آبادی (رومیوں سے بہت پہلے کی) قبروں پر صلیب ہی کا نشان قایم کرتی تھی۔ وسطی امریکہ کے قدیم معبدوں میں صلیبی نشان کثرت سے دریافت ہوئے ہیں، بابل کی سرزمین سے جو اسطوانے یا ٹکڑے دریافت ہوئے ہیں ان پر بھی صلیب کا نشان موجود ہے، اسی طرح تثلیث کا خیال بھی بہت پرانا ہے اور قدیم مصر میں پایا جاتا تھا۔

ہم کو سمجھ لینا چاہئے کہ اساطیر و معجزات میں بہت فرق ہے، اساطیر نام ہے کسی بات کی خیالی تصویر پیش کرنے کا اور معجزہ کہتے ہیں کوئی بات گھڑ کر بیان کرنے کو۔

اگر تم کسی سے کہو کہ دو ہزار سال قبل مُردے زندہ ہو گئے تھے، وہ غالباً کہے گا "ہاں ہوا ہوگا" اگر تم اس سے کہو کہ ایک لاکھ سال بعد تمام مُردے زندہ ہو جائیں گے تو وہ کہے گا "دیکھو کیا ہوتا ہے" لیکن اگر تم یہ کہو گے کہ تم نے خود قبر کے اندر سے کسی مُردے کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو وہ تمھیں دیوانہ سمجھ کر کوئی جواب نہ دے گا۔

مذہبی کتابیں اسی قسم کے بیانات سے معمور ہیں۔ خدا نے یہودیوں کے لئے جتنے معجزات سے کام لیا وہ سب کو معلوم ہیں۔ ان کو غلامی سے آزاد کرانا بھی معجزوں ہی کے ذریعہ سے ہوا، جب وہ مصر سے باہر نکلے ہیں تو دن کو بادل اور رات کو روشنی کا ایک ستون آگے آگے رہنمائی کے لئے ہوتا تھا، دریائے نیل ان کے لئے شق کیا گیا، من و سلویٰ ان کے لئے نازل کیا گیا۔

اسی طرح مسیح نے بہت سے معجزے پیش کئے لیکن بالکل بے نتیجہ، وہی مُردے جن کو انھوں نے زندہ کیا، وہی اندھے جن کو انکھیارا بنایا اور وہی کوڑھی جنھیں چنگا کیا ان پر ایمان نہ لائے، آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا سبب تھا، صرف یہ کہ معجزے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوئے بلکہ یہ سب داستانیں ہیں جو صدیوں بعد گھڑی گئیں۔

پانی کو شراب بنا دینا، سیکڑوں آدمیوں کو صرف ایک روٹی سے سیر کر دینا، اندھے کو مٹی لگا کر بینا بنا دینا، طوفان کو خاموش کر دینا، یہ وہ سب باتیں ہیں جنھیں انسان سوچتا تھا، جن کے پورا ہونے کی تمنائیں رکھتا تھا اور انھیں کی تکمیل کو سب سے بڑی نعمت سمجھ کر اظہار عظمت و تقدس کے لئے اس نے پیغمبروں سے منسوب کر دیا۔

جب ایک زمانہ، ایک غیر محدود زمانہ انسان پر اسی جہل و بے خبری کی حالت میں گزر گیا تو کچھ لوگ سوچنے والے پیدا ہوئے اور انھوں نے روایات و معجزات کو شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ انھوں نے غور کیا کہ کسوف و خسوف کیوں مقررہ وقفہ کے بعد ہوتا ہے اور آخر کار انھوں نے اس کی وجہ معلوم کر کے سمجھ لیا کہ اجرام فلکی کی گردش اولاد آدم سے بالکل بے نیاز ہے اور انسان خود بھی مظاہر طبیعی کا ایک معمولی مظہر ہے۔

گلیلیو، کوپرنکس اور کیپلر نے مذہب کی بتائی ہوئی ہیئت کو درہم برہم کر دیا۔ زمین چپٹی ہونے کے بجائے گول اور ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہو گئی، آسمان بجائے ٹھوس ہونے کے خلا محض بن گیا اور سارا بنا بنایا کھیل مذہب والوں کا بگڑ گیا۔

ظاہر ہے کہ مذہب اپنی روایات کی اس تکذیب و توہین کو برداشت نہ کر سکتا تھا وہ تاریکی جو ہزارہا معلوم سے دماغوں پر مسلط تھی یوں آسانی سے دور نہ ہو سکتی تھی۔ آخر کار جہل نے علم کے خلاف ایک محاذ جنگ قایم کیا اور مذہب کے درندے نے جس کے پنجے ہمیشہ خون سے رنگین رہے ہیں، برونو (BRUNO) کے خلاف اپنا چنگل بڑھایا اور محض اس خطا پر کہ وہ اس کرہ کے علاوہ اور کروں کا بھی قایل تھا۔

اسے کافر و ملحد قرار دے کر سات سال کے لئے قید کر لیا گیا اور کہا گیا کہ اگر وہ اپنے الحاد سے باز آ جائے تو رہا کیا جا سکتا ہے، لیکن اس نے کہا کہ ایک حق بات سے انکار کیونکر ممکن ہے اور آخر کار اسے پابہ زنجیر قصاص گاہ میں لے گئے اور بہت سی لکڑیاں جمع کر کے چتا میں آگ لگا دی گئی اور وہ جل کر راکھ ہو گیا، الغرض مذہب نے عقل و علم کو شکست دینے کی ہر امکانی کوشش کی لیکن جہل کے پاؤں جب ایک بار اُکھڑ جاتے ہیں تو مشکل سے جمتے ہیں، عقل کی روشنی پھیلتی رہی اور مذہب کی تاریکی سمٹتی رہی۔

جانبازانِ علم والے اُٹھے اور انھوں نے سمندروں، پہاڑوں اور وادیوں میں جانیں دے دیکر وہ وہ باتیں دریافت کیں جو مذہب کی دسترس سے باہر تھیں انھوں نے بخار و برق کی قوت دریافت کر کے انسان کو دیوتا بنا دیا، لیکن اہلِ مذہب بدستور دیوتاؤں کے غلام ہی بنے رہے۔ مذہب والے مفروضہ معجزے بیان ہی کرتے رہے اور انھوں نے انھیں پورا کر کے دکھا دیا، یعنی انسان کی جن تمناؤں کو دیوتا پورا نہ کر سکتے تھے اسے علم و عقل نے پورا کر دیا۔

سائنس بتاتی ہے کہ نہ تخلیق کوئی چیز ہے نہ فنا کوئی چیز، ایک لامحدود ہستی کا وجود ایک لامحدود استحالۂ عقلی ہے، کائنات کے تمام مظاہر و مآثر اسباب و نتیجہ سے وابستہ ہیں اور اشیاء کے اسی فطری رابطہ کو ایک نے نہ سمجھا اور مذہب بن گیا، دوسرے نے سمجھ لیا اور علم کہلایا۔

مذہب کا تجربہ انسان نے ہزاروں سال کیا لیکن کوئی آسمانی مدد اسے نہ پہونچی، خدا کا رحم حاصل کرنے کے لئے ماؤں نے اپنے بچوں کی قربانیاں پیش کیں، لیکن اسے ان پر رحم نہ آیا، برہنہ وحشی انسان کو لاکھوں کی تعداد میں درندوں نے کھایا، سانپوں نے ڈسا، طوفانوں نے ڈبویا، زلزلوں نے تباہ کیا، لیکن خدا نے اپنا اُصولِ کار نہ بدلا، انسان نے لاکھوں مندر بنائے، رات دن اس کی پوجا کی، لیکن ظالموں کا ظلم بدستور قایم رہا اور غلاموں کی پیٹھ پر جو کوڑے پڑا کرتے تھے بدستور پڑتے رہے، یہاں تک کہ انسان نے لاکھوں سال کے تلخ تجربات کے بعد سمجھا کہ خدا انسانی معاملات میں دخل نہیں دیتا، اور اس کے نزدیک گھاس کی پتی اور انسان سب برابر ہیں، اس لئے اس کی ترقی کا انحصار صرف اس کی محنت و کاوش اور رہبری عقل پر ہے، آخر کار رفتہ رفتہ معجزات کا زمانہ گزر گیا، روایاتِ مذہبی کا دور ختم ہو گیا اور اب انسان اس کے لئے طیار نہیں کہ وہ مذہب کے بتائے ہوئے اصولِ نجات پر یقین رکھکر اپنی دنیا کو تباہ کرے اور بیوقوف کہلائے۔

---

(۴)

مذاہب کی ظالمانہ دارو گیر

ترقی کرنا انسان کا فطری حق ہے، لیکن ترقی کا مفہوم کیا ہے؟ اس کو سمجھ لینا ضروری ہے، اس باب میں دو متضاد رائیں پائی جاتی ہیں کیونکہ وہی ایک حالت ہے جسے ایک جماعت ترقی تہذیب سے تعبیر کرتی ہے اور دوسری وحشت و جہل سے، ایک گروہ کہتا ہے کہ ہر وہ چیز جو قدیم ہے، پرانی ہے، قابلِ احترام ہے گویا جب تک کسی چیز کے جھاڑنے سے صدیوں کی جمی ہوئی خاک نہ اُڑے قابلِ اعتنا نہیں، ان کے نزدیک حکومتیں وہی تھیں جو ختم ہو گئیں، فرمانروا وہی تھے جو گزر گئے، ایسے مصلح وہی تھے جو مر گئے، نہ ویسے شاعر اب پیدا ہوتے ہیں نہ ویسے ادیب نہ ویسے سیاست داں اب نظر آتے ہیں، نہ ویسے حکماء نہ فلاسفہ۔

دوسرا گروہ قدیم و قدامت کا دشمن ہے اور موجودہ زمانہ کا مداح، ان کے نزدیک زمانۂ قدیم میں کوئی بات معقول تھی ہی نہیں اور قدرت نے اپنے تمام برکات زمانہ حال ہی کے لئے وقف کردئے ہیں۔ دونوں غلطی پر ہیں۔ نہ قدیم زمانہ کی ہر چیز بُری تھی، نہ زمانہ حال کی ہر بات اچھی، صداقت ہمیشہ ایک ہی رہی ہے اور اسے ہم قدیم و جدید نہیں کہہ سکتے، وہ ہر زمانہ میں یکساں رہی اور ہمیشہ اس کی جستجو کرنا چاہئے۔

اگر ہم اصولاً اس بات کو تسلیم کرلیں کہ "فکر و عمل" ہی ملک کی ترقی و مسرت کی بنیاد ہے اور یہ عمومی مسرت ہی فی الحقیقت فطری صداقت ہے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا کے "فکر و عمل" کو بالکل آزاد ہونا چاہئے۔

آپ اس عہد قدیم کو دیکھئے جب ایشیا ترتیب تاریخ سے پہلے بھی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا ہوا تھا، بلکہ عہد وسطیٰ کو لیجئے اور غور کیجئے کہ اس وقت یورپ کی (جو اس وقت سب سے بڑا مدعی تہذیب و آزادی ہے) کیا حالت تھی، طبقۂ عمال کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا تھا، جہل کی تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی اور فکر انسانی نام تھا صرف اوہام پرستی کا۔ فضا میں ہر طرف ملائکہ و عفاریت چھائے ہوئے تھے اور ہر سمجھ میں نہ آنے والی بات معجزۂ خداوندی قرار دی جاتی تھی۔ اعتقادات نے عقل انسانی کو بے کار کر رکھا تھا اور مذاہب نے غور و فکر کو۔ انسان کے لئے وجہ امتیاز صرف یہ تھا کہ یا تو وہ سپاہی ہو یا پادری یعنی سوائے لڑنے اور جھوٹ بولنے کے اور کوئی صورت انسانیت کی موجود نہ تھی۔ صنعت و حرفت کو ذلیل سمجھا جاتا تھا اور اس ذریعہ سے ایک شخص بھی اپنا پیٹ آسانی سے نہ بھر سکتا تھا، قومیں خرید و فروخت کے ذریعہ سے ضروریات زندگی حاصل نہ کرتی تھیں بلکہ لوٹ مار سے اور ہر مسیحی ملک غیر مسیحی قوم کے مال کو لوٹ لینا ثواب جانتا تھا، لکھنا پڑھنا نہایت خطرناک بات سمجھی جاتی تھی اور اگر کوئی شخص بدقسمتی سے سیکھ لیتا تھا تو اسے ساحر یا کافر سمجھا جاتا تھا، اُس وقت انسان کے جسم و دماغ دونوں مقید تھے۔ ایک کے لئے لوہے کی زنجیریں تھیں اور دوسرے کے لئے وہم پرستی کی۔

پندرھویں صدی میں انگلستان کا قانون یہ تھا کہ اگر کوئی شخص انجیل مقدس کا ترجمہ اپنی مادری زبان میں کرے گا تو اس کی جائداد اور اس کے مویشی ہمیشہ کے لئے ضبط ہو جائیں گے اور وہ حکومت کا باغی قرار دیا جائے گا، چنانچہ اس قانون کے نفاذ کے بعد ایک دن ۳۹ آدمی پھانسی پر لٹکائے گئے اور ان کی لاشیں سر بازار جلائی گئیں۔ پھر یہ جہل صرف انگلستان ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ یورپ کے ہر حصہ میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ سولھویں صدی میں فرانس کی حکومت نے ایک شخص کو اس خطا پر آگ میں تڑپا تڑپا کر ہلاک کر ڈالا کہ وہ راہبوں کے ایک جلوس کے سامنے دوزانو نہ ہوا تھا۔

عہد وسطیٰ کے تمام انسان جاہل و عالم، آقا و غلام، پادری و غیر پادری سب کے سب جادو، ٹونا اور ٹوٹکے کے قایل تھے، انھیں یقین تھا کہ شیطان نہ صرف انسان بلکہ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے اندر بھی حلول کر جاتا ہے اور کسی ایسے شخص کو جس کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ وہ شیطان کا ہمزاد و ندیم ہے۔ مار ڈالنا یا زندہ جلا دینا بہت معمولی بات تھی۔

جیمس اول کے زمانہ میں ایک شخص اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا اس جرم میں جلایا گیا کہ وہ شاہی خاندان کو ڈبو دینے کے لئے سمندر میں طوفان پیدا کر رہا تھا۔

ایک بار سر میتھو ہیل کے سامنے جو انگلستان کا مشہور قانون داں جج تھا، ایک عورت پیش کی گئی کہ بچوں سے سوئیوں کی قے کراتی ہے اور شیطان سے ساز باز رکھتی ہے، چنانچہ جج صاحب نے اس کو مجرم قرار دے کر زندہ جلوا دیا اور فیصلہ میں لکھا کہ یہ جادوگری ہے اور جادو کا از روئے مذہب حق ہونا ثابت ہے۔ عام عقیدہ ایک یہ بھی تھا کہ بعض آسیب زدہ انسان بھیڑئے کی شکل اختیار کر سکتے ہیں، ایک مرتبہ کسی شخص پر بھیڑئے نے حملہ کر دیا، اس نے مقابلہ کر کے اس کا ایک پنجہ کاٹ لیا اور جیب میں رکھ کر گھر پہونچا، یہاں پہونچ کر دیکھا کہ اس کی بیوی کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے

اور اس کے خون نکل رہا ہے، اس سے یہ یقین کیا گیا کہ اس کی بیوی بھیڑیا بن کر گئی تھی، چنانچہ اس نے اقرار کیا اور جلادی گئی۔

اس طرح لوگوں پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ گرمیوں میں پالا گراتے ہیں، اولے برسا کر فصلیں تباہ کرتے ہیں، شرابیں ترش کر دیتے ہیں، اور گایوں کو بانجھ بنا دیتے ہیں۔ پھر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہ الزام صرف انسانوں ہی پر عاید نہ کیا جاتا بلکہ جانور بھی اس سے محفوظ نہ تھے۔ سنہ ۱۴۷۴ء میں ایک مرغ پر یہ الزام قایم کیا گیا کہ اس نے انڈا دیا ہے اور چونکہ مرغ عام طور پر انڈا نہیں دیتا، اس لئے یقیناً اس میں شیطان حلول کر گیا ہے، چنانچہ یہ مرغ معہ انڈے کے عدالت گاہ میں پیش کیا گیا اور اس کو سر راہ جلا دئے جانے کا حکم صادر ہوا، اسی طرح ایک سور پر یہ الزام قایم کیا گیا کہ اس نے آدمی کو مار کر کھا لیا ہے اور اسے بھی جلا دیا گیا، سنہ ۱۴۸۶ء میں ایک گائے پر بھی آسیب زدہ ہونے کا الزام قایم کر کے اسے سزا دی گئی۔ جانوروں کو بطور شاہد کے طلب کرنا بھی اس وقت کا دستور تھا۔

پانی اور آگ کے ذریعہ سے بھی گناہ و بے گناہی کی جانچ ہوتی تھی۔ یعنی مجرم آگ میں تپایا ہوا سرخ لوہا ہاتھ میں لیتا تھا اور عقیدہ یہ تھا کہ اگر وہ گناہ گار نہیں ہے تو اس کو کوئی ضرر نہ پہونچے (ہندوستان کے بھی بعض سید خاندان مدعی ہیں کہ آگ ان پر اثر نہیں کر سکتی کیونکہ وہ معصوم ہیں، یہ جاہلانہ عقیدہ بھی اسی نوع کی مذہبی تاریکی کا نتیجہ ہے) اسی طرح مجرم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پانی میں ڈال دیا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اگر وہ بے گناہ ہے تو ڈوبے گا نہیں۔

ان مثالوں کے دیکھنے سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان قوموں میں جو مذہب کی جاہلانہ گرفت میں مبتلا تھیں یا ہیں، کیا کیا بدتمیزیاں پائی جاتی ہیں اور عقل انسانی کا خون کرنے میں معتقدات مذہبی نے کتنا حصہ لیا۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی اس لعنت میں صرف جاہل انسان ہی مبتلا نہ تھا، بلکہ پڑھے لکھے، ذی فہم و ذی ہوش افراد بھی مبتلا نظر آتے تھے۔

کیپلر دنیا کے مشہور بڑے آدمیوں میں سے تھا اور ہیئت دانی میں تو اس کا نظیر نہ تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ احمقانہ عقیدہ میں بھی مبتلا تھا کہ ستاروں کو دیکھ کر ایک شخص کے مستقبل کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ عقیدہ اس کے دل میں مذہبی بنیاد رکھتا تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ ایسے ہی ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی۔ نیچو براہی بڑا زبردست ہیئت داں تھا یہ بہت سے مہمل الفاظ ایک جگہ لکھ کر پیشین گوئیاں کیا کرتا تھا اور ان کے پورا ہونے کا منتظر رہتا تھا۔

لوتھر کو یقین تھا کہ اس کی ملاقات شیطان سے ہوئی تھی اور بعض مذہبی مسایل پر اس سے مباحثہ بھی ہوا تھا۔ چارلس پنجم شہنشاہ جرمنی کے زمانہ میں اسٹوفلر بڑا مشہور ہیئت داں گزرا ہے، اس نے ایک بار ستاروں کو دیکھ کر حکم لگایا کہ ایک بہت بڑا طوفان آنے والا ہے، اور اس کا اتنا یقین ہو گیا کہ ہزاروں آدمیوں نے جو نشیبی حصۂ زمین میں رہتے تھے، ترک وطن کر دیا اور خانماں برباد ہو گئے، فرانس میں لوگوں نے دوسری کشتی نوح طیار کر لی اور ذخائر سے اسے بھر دیا، "تاکہ طوفان میں کام آسکے، لیکن طوفان نہ آنا تھا نہ آیا۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہن انسانی کس درجہ غلامی میں مبتلا تھا اور مذہب کا مفہوم سوائے شیطان کی پرستش کے اور کچھ نہ تھا۔

الغرض ان کی مذہبی روایات اسی طرح کی لغو باتوں سے بھری ہوئی تھیں اس کا سبب یہ تھا کہ انسانی معلومات کا ذریعہ صرف مذہبی ادارے تھے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ ادارے تھے وہ قصداً جھوٹ بولتے تھے اور ارادتاً خلاف عقل باتیں گھڑ لیتے تھے تاکہ لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں۔ اور وہ اس کے جواب میں معجزات و کرامات وغیرہ بیان کر کے عوام کو مرعوب کر لیں اور اپنا اقتدار جمائیں۔

الغرض مذہب کے تاریک دور میں انسان کا جسم و ذہن دونوں انتہائی ذلیل غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور انسانیت کا مستقبل سخت تاریک تھا ۔ لیکن چونکہ حقیقت و صداقت کو عرصہ تک دبایا نہیں جا سکتا اور فراست انسانی وہ چنگاری نہیں جو کسی نہ کسی وقت بھڑک نہ اٹھے ۔ اس لئے رفتہ رفتہ ایک زمانہ آیا کہ علم کی روشنی پھیلی، مذہب نے اس کے لئے جگہ چھوڑی اور اس طرح انسانیت جو ہزاروں سال سے وحشت و درندگی کے بوجھ کے نیچے پڑی کراہ رہی تھی، آزاد ہوئی۔

پرانے جغرافیے بدلے، تاریخ بدلی، معتقدات بدلے اور آخرکار انسان مذہب کی گرفت سے چھٹ کر آزاد ہو گیا۔ علم و فن کسی کی ملکیت نہ رہا، سوچنے سمجھنے کا ہر شخص کو مجاز ہو گیا، غور و تدبر ہر شخص کا فطری حق قرار پایا، اختراعات و ایجادات کا دروازہ کھل گیا، آزادیٔ فکر و رائے کے لئے کوئی مانع حایل نہ رہا اور انسان کو اس طرح سب سے پہلے ترکِ مذہب ہی کے بعد معلوم ہوا کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے

ترقی کا مفہوم کیا ہے، اس سوال کا مطالعہ آپ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی کیجئے اور مذہب سے علحدہ ہو کر بھی آپ کو بالکل دو مختلف جواب ملیں گے، مذہب کے نزدیک ترقی کا مفہوم دوسری دنیا سے تعلق رکھتا ہے، جہاں دنیاوی افعال و اعمال کے نتائج سے واسطہ پڑے گا اور عمل کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے، پھر کیا یہ امر حیرت ناک نہیں کہ جس عالم کے کردار سے مذہب نے جزا و سزا کو متعلق بتایا ہے اسی کو اندھوں کی طرح بسر کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

اب ذرا مذہب کی پابندیوں سے ہٹ کر انسانیت کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کتنی وسعت ہے، جدوجہد کا کتنا پھیلاؤ ہے اور اس کے مقاصد کتنے بلند ہیں۔

---

(۵)

انحراف مذہب کا تدریجی ارتقاء

اُس دور میں جس کو ہم دورِ "نشائۃ ثانیہ" (.RENAISSANCE) یا "یورپ میں تہذیب و تمدن کی دوبارہ پیدائش" کے نام سے یاد کرتے ہیں، زندگی کے مختلف مسایل پر بحث کرنا ایک عام تفریح ہو گئی تھی، اس زمانہ میں علمی تحقیق و تجسس کا وہ جوش و ولولہ پایا جاتا تھا جو یورپ میں روم کی قیصریت کے فنا ہونے کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھا گیا۔ لوگوں کو اس وقت یہ پتہ چلا کہ دنیا میں ایسے بھی مسایل پائے جاتے ہیں جن کا نہ انجیل میں تذکرہ ہے اور نہ جن کے متعلق پادریوں کی زبانیں کھلتی ہیں، چنانچہ ایسے ہی مسایل زندگی پر لوگ اکثر آپس میں بحث کیا کرتے تھے۔ اس چیز کی ابتدا سب سے پہلے اٹلی میں ہوئی اور پھر یہ مباحث انگلستان اور فرانس تک پھیل گئے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ تحقیق و جستجو صرف اُن لوگوں تک محدود تھی جن کے پاس فرصت تھی، دولت تھی اور جو تمام دنیاوی علایق سے بے نیاز ہو کر اپنا سارا وقت اسی قسم کی تحقیق و تجسس میں صرف کرتے، ورنہ قوم کے زیادہ افراد جاہل تھے و مطلق نہیں جانتے تھے کہ تحقیق جدید کیا ہے اور جب کسی بے دین یا ملحد کو زندہ جلتے ہوئے دیکھتے تھے تو خوش ہوتے تھے، الغرض تعلیم یافتہ لوگ تو مذہب کو ناپسند کرتے تھے اور اس کے اصول سے انھیں اختلاف تھا لیکن قومی مصالح کے خاطر انھیں اپنے مذہب پر قایم رہنا پڑتا تھا۔

لیکن اب ہماری نگاہوں میں زیادہ وسعت پیدا ہو گئی ہے اور ہم ان مسایل کو ایسی صداقت کے معیار پر پرکھتے ہیں جس سے پہلے ہم لاعلم تھے۔

مذہب کی داستان ہزاروں سال کی پرانی داستان ہے اور مذہب کی ابتدا تلاش کرنے کے لئے ہم کو "عہدِ حجری" سے بھی قدیم تر زمانہ کی طرف نظر دوڑانی پڑتی ہے، لیکن یہاں کسی مدت پر بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ اپنے ابتدائی دور ہی سے مذہبی خیالات میں تدریجی ارتقاء ہوتا رہا ہے۔ اس ارتقاء میں کوئی تحریک جذبات شامل نہ تھی بلکہ تفکر کا ایک منطقی تسلسل تھا۔

اگر تمام نسل انسانی برابر رفتار سے چلتی تو آج ہم مذہب کی ابتدا اور اس کے ارتقاء کے بارہ میں کچھ نہ جانتے ہوتے مگر انسان نے اپنے تجربات صرف ۵ - ۶ ہزار برس پیشتر سے محفوظ رکھنا شروع کئے یہاں تک کہ فرضی داستانیں بھی بہت پرانی نہیں ہیں لیکن انسانوں کی یہ داستان ہر واقعہ سے اتنا متاثر ہوئی ہے کہ نسل انسانی کے مختلف حصّوں نے عام ارتقاء میں ہر منزل پر ترقی نہیں کی بہر حال آج ہم دو انسانی سلسلے شمار کرا سکتے ہیں ایک تو قبل تاریخ قوموں کا سلسلہ جو لاکھوں برس پہلے گزری ہیں، دوسرے وحشیوں کا زمانہ یہ دونوں مدتیں تقریباً یکساں ہیں کیونکہ دونوں زمانہ قبل تاریخ میں گزری ہیں اور ان قوموں کے خیالات سے تفکر انسانی کے ارتقاء کے گزشتہ منازل ہم کو معلوم ہو سکتے ہیں، اس کے بعد قدیم مذہب کا پتہ پرانی عمارتوں سے چلتا ہے اور پھر ادبیات سے۔

مذہب کی ابتدا کا حال بالکل ایسا ہے جیسے پرانے زمانہ کے حبشی کا تصور اپنے سایہ کے بارہ میں، میں نے دیکھا ہے کہ اگر کسی کتے کو عمر میں پہلی مرتبہ ژالہ باری سے سابقہ پڑے تو وہ بے انتہا حیرت زدہ ہو جاتا ہے یا اگر کوئی بلی پہلی مرتبہ کسی کچھوے کو رینگتے ہوئے دیکھتی ہے تو وہ بہت متعجب ہو جاتی ہے، اسی طرح زمانۂ قدیم کے انسان میں ممکن ہے ایسے ردعمل ہوئے ہوں مگر ان کا مذہب سے اس وقت تک کوئی تعلق نہیں ہوا جب تک وہ یہ خیال نہ کرنے لگا کہ ان باتوں کا تعلق ایک غیبی طاقت سے ہے۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ انسان نے پہلے ایک مبہم طاقت کا تصور کیا اور پھر یہی چیز روحوں میں تبدیل ہو گئی، ہم دیکھ چکے ہیں کہ روح کا سب سے پرانا نام "سایہ" ہے اور جب ہم اپنے آپ کو ایک قدیم وحشی کی جگہ دیکھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ غالباً سایہ کے حیرت انگیز رویہ پر غور و فکر پہلی چیز تھی جس نے قدیم انسان کے دماغ میں تصور کی جھلک پیدا کی۔

دوسری منزل یا حیات بعد الموت کا خیال بھی تمام دنیا میں متوازی نظر آتا ہے یعنی یہ کہ مُردوں کی روحیں زندہ رہتی ہیں اور ان کی سرگرمیاں بڑھ جاتی ہیں، نیز یہ کہ ارواح بہت رنجیدہ اور خشک مزاج ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان ارواح کو تمام بیماریوں اور مصیبتوں کا ذمہ دار سمجھا جانے لگا اور چونکہ ہر آدمی کے مرنے کے بعد ایک خبیث روح اور بڑھ جاتی ہے لہذا انسانی آبادیاں انھیں ارواح سے معمور نظر آنے لگیں۔ بعد کو وہ زمانہ آیا جب ان ارواح کے لئے خاص جگہیں (مثلاً آسمان یا زمین) میں مقرر کر دی گئیں۔ ان میں سے بعض ایسی بھی سمجھی جانے لگیں جو آدمیوں کی مدد کرتی ہیں، لیکن عام نظریہ یہی تھا کہ وہ عموماً شریر ہوتی ہیں۔

اب مذہب کے ارتقاء کی دوسری منزل کو لیجیے جس میں "پادری" یا "مذہبی" عالم کا ظہور ہوا ہے، یہ دور ہر حصۂ دنیا میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے گو وہ ہر جگہ مختلف شکلوں میں آیا ہو اور یہ جماعت گویا بری روحوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پیدا ہوتی تھی اور ان "ارواح خبیثہ" کا مقابلہ کرنے میں مذہبی پیشواؤں کا طریق جنگ ایسا ہوتا تھا کہ بجز وحشیوں کے کوئی بھی اس پر ایمان نہیں لا سکتا تھا۔

بہر حال جس وقت مذہبی "بزرگوں" کا یہ گروہ بڑھ رہا تھا اسی وقت مذہبی خیال میں بھی وسعت ہونی شروع ہوئی انسانی افراد قبایل میں منقسم ہونے لگے اور ہر قبیلہ کا ایک سردار ہو گیا۔ یہ سردار دوسری دنیا میں بھی سردار گنا جاتا تھا، اس کے علاوہ انسان کی

بڑھتی ہوئی قوتِ متخیلہ نے کچھ اور بھی طاقتور ہستیاں دیکھنا شروع کیں مثلاً سانپ، شیر وغیرہ اور آخرکار تمام نظام فطرت میں اُسے ارواح ہی ارواح نظر آنے لگیں، رفتہ رفتہ ان میں سے بعض "ارواح" دیوتا بن گئیں۔ اسی کے ساتھ مذہبی طاقت میں بھی اضافہ ہونے لگا یعنی جتنا بڑا دیوتا ہوتا تھا اتنا ہی عظیم المرتبت اس کا پجاری ہوتا تھا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ اگر کسی دیوتا کے پجاری زیادہ طاقتور ہوئے تو انھوں نے اپنے دیوتا کو نہ صرف دوسروں سے بڑھ کر ثابت کرنے کی کوشش کی بلکہ ان کو دوسرے دیوتاؤں کا یا تو سردار بنا دیا یا دوسروں کو شیطان ثابت کر دکھایا۔ مصر، بابل اور چین سبھی جگہ یہی ہوا۔

لیکن وہ ترقی بھی بہت اہم تھی جو ان حالات کے ساتھ مذہبی و اخلاقی خیالات میں الگ الگ نشو و نما پا رہی تھی، اخلاقیات کا دور اس وقت سے شروع ہوا جب لوگوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ ان کے قبائلی مراسم ایک قانون ہیں جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ ان کے گزشتہ سرداران قوم جو بہت عقلمند تھے، مرنے کے بعد بھی دیکھ رہے ہوں گے کہ ہمارے قبائلی قوانین پر ہمارے جانشین کہاں تک عمل کرتے ہیں۔ گویا مذہب یہیں سے "اخلاق" کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

اس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مذہب نے بہت جلد معلم اخلاقیات ہونے کی حیثیت حاصل کر لی، لیکن تاریخ مذاہب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اس وقت تک اخلاقی نہیں ہوا جب تک کہ اس کا معیار بہت اونچا نہیں ہو گیا۔ کہیں کہیں لوگ یہ خیال کر لیا کرتے تھے کہ ان کے دیوتا خرابی اخلاق سے ناراض ہو جاتے ہیں۔

دیوتا عموماً کاہل ہوتے تھے جن کو ہر ہر بات میں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا اور ان کی بہترین خدمت یہی سمجھی جاتی تھی کہ وہ اوپر اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے اپنے بندوں کی قربانیوں کی خوشبو سونگھتے رہیں۔

شہوانی تعلقات سے بھی مذہب کو بہت عرصہ تک لگاؤ نہیں رہا۔ پرانی سوسائٹی میں ایک انسان کسی شہوانی غلطی کا مرتکب اسی وقت سمجھا جاتا تھا جب وہ کسی دوسرے کی بیوی یا لڑکی کی عصمت خراب کرے اور اس کا یہ فعل صرف یہ حیثیت رکھتا تھا، گویا ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے مال کو چرا لیا اس کو نقصان پہونچایا مگر تعدد ازدواج پھر بھی عام چیز تھی۔

غرضکہ گناہ کا خیال سن عیسوی کی ابتداء سے بہت قبل پیدا ہو گیا تھا، ان کی داستان حسب ذیل پانچ حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے' (۱) پتھر کے اوزار معلوم ہونے سے قبل لاکھوں برس پیشتر کا زمانہ۔ (۲) پتھر کے زمانہ سے قبل تقریباً ۵ لاکھ برس پیشتر کا زمانہ۔ (۳) پتھر کا زمانہ (اب سے ۳-۴ ہزار برس پیشتر کا زمانہ)۔ (۴) نیا پتھر کا زمانہ (تقریباً ۲۰ ہزار برس قبل مسیح سے ۵۰۰ برس قبل مسیح تک)۔ (۵) تاریخی زمانہ، مذہب کی ترقی خاص طور پر نئے پتھر کے زمانہ سے ہونا شروع ہوئی ہے اور اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ مصر و بابل میں اخلاقی اور مذہبی خیالات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔

یہ ترقی بالکل قدرتی ترقی تھی ایک طرف تو دیوتا تھے جو قوم کے اخلاق و عادات کی نگرانی کیا کرتے تھے، دوسری طرف پادری یا مذہبی پیشوا تھے جو یہ ثابت کرتے تھے کہ خدا بدمعاشوں کو سزا دیتا ہے' باقی یہ سمجھتے تھے کہ ہر مصیبت اور بیماری گناہوں کی پاداش ہے' اسی طرح مصریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک اسیرس معاف نہ کر دے مرنے کے بعد گناہوں کی سخت سزا ملتی رہے گی۔ ایران میں یہ خیال تھا کہ مزدہ ایک دن تمام دنیا کو تباہ و برباد کر دے گا، عبرانیوں کا بھی اسی طرح کا عقیدہ تھا۔ یونانیوں کا مذہب جزوی طور سے اخلاقی ضرور تھا مگر ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اگر روح گندی ہو جائے تو انسان کو حیات ابدی اس وقت تک میسر نہیں ہوتی جب تک وہ توبہ اور بعض مراسم ادا کر کے پاک نہ کی جائے۔

رہا یہ سوال کہ مذہبی و اخلاقی قوانین و خیالات کا اختلاط قوم کے لئے مفید تھا یا نہیں، سو اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں، کہا جاتا ہے کہ زیادہ مناسب یہ تھا کہ اخلاقی قانون پر مذہبی اثرات کے تحت عملدرآمد کرایا جائے اور ایک شخص کی اخلاقی حالت کے مطابق سزا و جزا دی جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنے عقاید کے ساتھ اپنے چال چلن کے باب میں جتنا زیادہ غیر منطقی رہا ہے، اتنا کسی اور معاملہ میں نہیں رہا۔

ازمنۂ وسطیٰ میں، اخلاقی قوانین ——————— (خصوصاً جنسی تعلقات کے بارہ میں) بہت سخت تھے مگر پھر بھی ہمیں کوئی خطہ (بجز مشرقی بحر روم کے جہاں اعضائے شہوانی کی پرستش ہوتی تھی) ایسا نظر نہیں آتا جو زمانۂ وسطیٰ کی ان قوموں سے زیادہ خراب چال چلن رکھتا ہو اس لئے یہ نظریہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

گناہ کا خیال (جنسی تعلقات کے علاوہ) اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اخلاقی قانون کے مصنف دیوتا ہی ہیں مگر ایسے ثبوت کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ان کے خیالات سے قوم یا نسل کی اخلاقی حالت کو کوئی فایدہ نہیں پہونچا، کنفوشش، بودھ، زینو اور اپی کورس سب نے ایسے اخلاق کا درس دیا جس میں خدا کا نام نہ تھا مگر پھر بھی اپنی قوم پر ان کا اتنا ہی اثر تھا جتنا کہ کسی اور مذہبی معلم اخلاق کا —— ایک عیسائی جو اس مسئلہ پر بحث کرنا چاہے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ گناہ کے مذہبی اور اخلاقی خیال نے جنسی تعلقات کو زیادہ خوشگوار بنا دیا، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ پانچویں صدی عیسوی سے اُنیسویں صدی عیسوی تک جنسی اخلاقیات بہت آزاد رہا ہے جنسی تعلقات کے بارہ میں اخلاقی درس کی بنیاد کا پتہ زمانہ قبل تاریخ میں ملتا ہے یعنی ان اوہام میں جن سے ہم کو اب تنفر ہے۔

بے دینی یا الحاد کا عروج آخری اخلاقی، مذہبی، ترقی حضرت عیسیٰ کے ایک ہزار برس قبل ہوئی۔ یہ زمانہ تاریخ کے لئے بہت اہم شمار کیا جاتا ہے اسوقت سے مذہب کی داستان نہایت اہم ہو جاتی ہے۔

ہر چند زمانۂ تاریخ کے آغاز میں جب لوگوں کو لکھنا بھی آگیا تھا مذہب میں کئی خداؤں کے ماننے کا رواج پیدا ہو گیا تھا یعنی ہر قوم میں اوراح کے علاوہ دیوتا بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے اور ہر دیوتا کے الگ الگ پوجاری اور مندر ہوا کرتے تھے اور ہر فرقہ کے مراسم بھی جدا گانہ ہوتے تھے لیکن حضرت عیسیٰ سے دو ہزار قبل ہی روحانی خدا کا عقیدہ پیدا ہو گیا تھا چنانچہ عبرانی پادری جنھوں نے پرانی انجیل ایرانیوں اور بابیوں کے اثرات کے تحت لکھی تھی اپنے مربّی بادشاہ سائرس کو موحد مانتے ہیں۔ قرطی (CRETONS.) بھی ہزار دو برس سے موحد تھے اور صرف زمین کو اپنا دیوتا تسلیم کرتے تھے۔ تعلیم یافتہ چینی بھی آسمان کو اپنا خدا مانتے تھے اور حضرت عیسیٰ سے پانچویں یا چھٹی صدی قبل جب یونانی فلاسفر ایک خدا کا ذکر کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ وحدانیت عام ہو چکی ہے۔

مگر اس کا انکار اور الحاد کا دور بھی اسی وقت شروع ہو گیا اور یونانی مفکرین نے بیدینی پھیلانی شروع کی چنانچہ چنانچہ تھیلیس، اناکس منڈر، دماقرطیس وغیرہ کے نزدیک "خدا" صرف نام ہی نام ہے، اسی طرح تیسری صدی قبل مسیح کے اسٹوئک (STOIC.) اور ایپکیورین (EPICURIAN.) طبقے پورے مادہ پرست تھے۔

اب ذرا غور سے دیکھیئے۔ مصر میں حضرت عیسیٰ سے ایک ہزار برس قبل زوال کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے اس کی علمی ترقی ختم ہو گئی اور وہاں بہت سے نئے نئے مذہب پیدا ہونے لگے۔ بابل کو اسی زمانہ میں اسیریا نے تباہ کر دیا تھا مگر ہندوستان اور چین نے اپنی اپنی تہذیب قائم رکھی اور اپنے الحاد سے تمام تعلیم یافتہ طبقہ کو منسلک کر لیا۔ البتہ ہندوستان میں ایک جاہلانہ رد عمل ہوا اور گوتم بدھ نے جو تعلیم دی تھی وہ کالعدم ہو گئی۔ چین کے اعلیٰ طبقہ میں مذہب نے کبھی اقتدار نہیں حاصل کیا اور یہ اثر جاپان تک پھیلا جہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی بے دینوں میں شامل ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جہاں کہیں آزادی خیال لوگوں کو نصیب تھی وہاں مذہب خواہ وہ وحدانیت ہی کا کیوں نہ قایل ہو بیدینی میں بدلنے لگا تھا۔ یونانیوں کے تجربات اولین سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے ان لوگوں میں تحصیل علم و اشاعت علم کا اس قدر شوق تھا کہ انھوں نے تین صدیوں کے اندر سائنس و فلسفہ کی اتنی اشاعت کی کہ مصر اور بابل تین ہزار برس میں بھی نہ کر سکے تھے اور یہ سب کے سب بے دین یا منکر دین تھے ہمارے پاس ان کی کتابیں موجود نہیں ہیں مگر بعد کے یونانیوں نے ان کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بالکل مادہ پرست تھے۔

اس وقت وہاں ایک خاص مذہبی عصبیت کی لہر دوڑ گئی اور مفکرین کو بہت اذیتیں برداشت کرنا پڑیں حتیٰ کہ سقراط کو بھی جو خدا پرست تھا جان دینا پڑی اور افلاطون کی بھی کسی نے نہیں سُنی مگر جب دوبارہ علم کی اشاعت ہوئی تو پھر بے دینی میں ترقی شروع ہوئی اس کے بعد آخری زوال سے کچھ ہی زمانہ قبل جب ایتھنس میں تہذیب اپنے عروج پر تھی تو مذہب حتیٰ کہ افلاطون کی عقلی خدا پرستی کا بھی زوال ہو چکا تھا اس کے بعد یونان کی تہذیب، اسکندریہ کی طرف منتقل ہو گئی اور، گو ہم اسکندریہ کے ماہرین سائنس و ماہرین ریاضی کے خیالات سے کم واقف ہیں مگر ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ وہ بھی عموماً بے دین و منکر تھے، اس کے بعد تہذیب روم میں پہونچی اور وہاں اگرچہ عوام مذہب کے پیرو تھے مگر تعلیم یافتہ طبقہ میں وہی بے دینی پائی جاتی تھی جو اپی کورس کے الحاد اور راسٹوئک اخلاقیات سے مل کر پیدا ہوئی تھی۔

الغرض ایک ہزار سال کی مدت جو ۶۰۰ برس قبل مسیح سے شروع ہو کر ۴۰۰ برس بعد مسیح تک جاری رہی اور جس پر "پرانی دُنیا" کا اختتام سمجھا جاتا ہے، تاریخی اہمیت سے لبریز ہے، ابھی تک علم صرف پادریوں اور پجاریوں تک محدود تھا اور "مندر" اور عبادت گاہوں کے لئے حاصل کیا جاتا تھا (البتہ بابلی، علم نجوم میں ترقی کر رہے تھے) مگر اس کے بعد دنیا کے ہر حصہ میں مثلاً چین، ہندوستان، ایران، یونان، مصر اور روم مفکر اور معلم اخلاق پیدا ہونے لگے اور الحاد کا پھر عروج ہو گیا۔ فیثا غورث اور افلاطون وغیرہ چند مفکرین نے مذہب کو بے دینی کی اس زد سے بچانا چاہا مگر ان کا اثر زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا، سن عیسوی کی ابتدا کے وقت تعلیم یافتہ لوگ عموماً بے دین تھے۔

یہ پندرہ سو برس کی مدت وہی ہے جسے عہدِ عیسویت کہا جاتا ہے یعنی چوتھی صدی عیسوی کے نصف آخر سے (جب یورپ میں عیسائیت بہ جبر پھیلائی گئی) انیسویں صدی کے نصف آخر تک (جب آزادی عقاید مل گئی تھی)، سائنس کی اشاعت ہونے لگی تھی، عوام کو تعلیم دی جانے لگی تھی، اور عیسائیت اکثریت کے مذہب کی حیثیت سے ختم ہو چکی تھی، یہ وہ عہد تھا جب یورپ و امریکہ میں عظیم الشان اکثریت کا مذہب عیسائیت تھا، لیکن حد درجہ جنگ و جدل کا مرکز!

اس کے بعد بارھویں صدی سے یورپ میں تہذیب از سر نو قایم ہونے لگی، بارھویں صدی اس لئے کہا گیا ہے کہ یہیں سے تہذیب یورپ میں کئی چیزوں کی ابتدا ہوتی ہے، مثلاً گوتھک آرٹ کی ابتدا، یونیورسٹیوں کا قیام، تجارت کی ترقی، بڑے بڑے شہروں کا وجود، غلاموں کی آزادی وغیرہ، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ نہ فراموش کر دینا چاہئے کہ ہر چند عہدِ وسطیٰ در اصل انیسویں صدی تک قایم رہا لیکن تہذیب یورپ کی حالت دراصل بارھویں صدی سے سنبھلنا شروع ہو گئی تھی اور جو کچھ اصلاحات ہوئیں وہ یا تو عیسائیت سے قطعاً بے نیاز ہو کر ہوئیں یا اس کے علی الرغم۔

عیسائیت کا طرفدار اکثر اپنے مذہب کی حمایت میں کسی خانقاہ یا کسی پادری یا کسی لائبریری کا نام لیتا ہے اور بڑے فخر سے کہتا ہے کہ دیکھو یہ سب مذہب کی برکت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک پادری کا کوئی فعل یا کسی لائبریری کا قیام مذہب کی حقانیت کو نہیں ظاہر کرتا بلکہ "عیسائی چرچ" کی پالیسی اسکے پادریوں، اسقفوں اور پاپاؤں کے افعال سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ پالیسی انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے انتہائی مہلک رہی ہے۔ پاپاؤں اور پادریوں کی کثیر تعداد ہمیشہ خود غرض و اخلاقی اعتبار سے نہایت نفس پرست رہی ہے۔ البتہ "اصلاح مذہب" کی وہ تحریک جس نے پاپائے روم کی طاقت کو صدمہ پہونچایا ایک مذہبی خدمت تھی مگر اس اصلاح نے بھی ایک ایسی خانہ جنگی کی بنیاد ڈالی جس کا اثر عرصہ تک قایم رہا اور انقلاب فرانس تک نہ زائل ہو سکا واقعہ یہ ہے کہ عوام کے مذہب کا ارتقاء وحدانیت اور پھر بیدینی ہے — بہرحال اب یہ طے شدہ امر ہے کہ مذہب اپنا اثر کھوتا جا رہا ہے۔ اور خدا کا خیال خواہ کتنا ہی پاکیزہ

احادیث کی کوئی دینی قیمت نہیں ہے

(ایک مسلمان)

مطالعۂ اسلام کا سب سے پہلا ذریعہ قرآن ہے اور اس کے بعد حدیث، ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سب سے زیادہ اہمیت قرآن کو حاصل ہے اور احادیث ثانوی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن ہمارے یہاں ایک جماعت ایسے علماء کی بھی پائی جاتی ہے جو فہمِ قرآن کیلئے حدیث کو ضروری سمجھتی ہے اور اس طرح اُن کے نقطۂ نظر سے احادیث کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، اس جماعت کو "اہلِ حدیث" کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے دوسری جماعت اہل قرآن کی ہے جو ہر بات کو براہِ راست قرآن سے سمجھنا چاہتی ہے، یعنی اسکے نزدیک احادیث کو کوئی دینی قیمت حاصل نہیں ہے اور یہ مضمون اسی جماعت کے ایک فرد کا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دونوں جماعتیں اعتدال سے ہٹی ہوئی ہیں۔ اہلِ قرآن کا عمومیت کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ مطلقاً احادیث کی کوئی دینی قیمت نہیں ہے، نادرست ہے۔ ہاں اگر وہ یہ کہیں کہ جو احادیث تعلیمات قرآنی کی معارض ہیں قابل اعتبار نہیں، تو ان کا یہ کہنا درست ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اہل حدیث کا یہ کہنا کہ فہم قران بغیر احادیث کے ممکن نہیں، ناقابل توجہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ارشادات نبوی فہم و تفہیم قرآن کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، بشرطیکہ وہ واقعی اقوال رسول ہوں، لیکن اس کا ثبوت یقیناً بہت مشکل ہے کیونکہ اس باب میں ہم کو صرف راویوں کے بیان پر اعتماد کرنا پڑتا ہے اور کسی راوی کا یہ کہہ دینا کہ میں نے اس حدیث کو فلاں سے سُنا اور اُس نے فلاں سے، سماعی شہادت سے بھی زیادہ گری ہوئی بات ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تمدن و معاشرت، شعایر و فرائض سے متعلق بعض مسایل ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں پایا جاتا (مثلاً روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ کی تفصیلات یا بعض آیات متشابہات کی وضاحت و صراحت) اور اس صورت میں لامحالہ ہمیں اقوال رسول اللہ کی جستجو ہوتی ہے، اس لئے ہم احادیث کو بالکل نظر انداز تو نہیں کر سکتے، لیکن یہ چھان بین ضرور کر سکتے ہیں کہ جن باتوں کو رسول اللہ سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ واقعی رسول اللہ کا ارشاد ہیں یا نہیں اور یہیں سے وہ نزاع شروع ہو جاتی ہے جسے عقلی و روایتی نزاع کہتے ہیں۔

یہی وہ چیز تھی جس نے ایک طرف روایتی نقطۂ نظر سے "علم اسماء الرجال" کی بنیاد ڈالی اور دوسری طرف عقلی نقطۂ نظر سے، اصول درایت کی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جامعین احادیث نے ان دونوں باتوں میں سے کسی کی پوری پابندی نہیں کی اور رطب و یابس جو کچھ سامنے آیا لے لیا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ صحاح ستّہ میں بھی بڑا حصہ ایسے مزخرفات کا شامل ہے جن کو عقلاً و اخلاقاً کسی طرح رسول اللہ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اور ہو سکتا ہے کہ احادیث کی اسی لغویت کو دیکھ کر ایک جماعت نے

احادیث کی دینی اہمیت سے انکار کر دیا۔

روایت احادیث کا سب سے زیادہ خطرناک دور وہ تھا جب رسول اللہ کی رحلت کے بعد ملک میں مختلف سیاسی جماعتیں رونما ہوئیں اور ان کو اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل اور فریق مخالف کو زک دینے کے لئے احادیث وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

پھر چونکہ ان جماعتوں کا اختلاف قومی، مذہبی، سیاسی اور اعتقادی سبھی قسم کا تھا اس لئے انھیں اسی طرح کی تمام احادیث کی ضرورت تھی اور اسی ضرورت کے لحاظ سے وضع احادیث کی ٹکسالیں قایم ہو گئیں اور متضاد روایتوں کا ڈھیر لگ گیا پھر یہ بات ایسی نہ تھی جو عرصہ تک ڈھکی چھپی رہتی، رفتہ رفتہ سب کو معلوم ہو گئی اور اسی زمانہ میں نقد احادیث کے سلسلہ میں اس تلبیس و تدلیس کو بار بار بے نقاب کیا گیا اور بعض واضعین احادیث نے خود اس کا اعتراف بھی کیا چنانچہ عبداللہ بن یزید کا کہنا ہے کہ جب ہم کوئی ضرورت محسوس کرتے تو " جعلنا لہ حدیثا "۔ (ہم ایک حدیث گھڑ لیا کرتے ہیں)

ابو سعید مدائنی وغیرہ کا پیشہ ہی وضع احادیث تھا، چنانچہ خود خلیفہ مہدی عباسی کا قول ہے کہ " مقاتل بن سلیمان نے ایک دن مجھ سے آکر کہا " ان شئت وضعت لک حدیثا " (اگر آپ چاہیں تو میں کچھ حدیثیں بنا دوں) میں نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں "۔ (تدریب)

اسی طرح محمد بن القاسم جو مرجیہ جماعت کا سردار تھا اپنے مذہبی عقاید کے ثبوت میں حدیثیں گھڑ لیا کرتا تھا۔

ابو داؤد بڑے زاہد و مرتاض شخص تھے لیکن جھوٹی حدیثیں بیان کرنے میں وہ بڑے بیباک تھے، اور " ابو بشر احمد بن محمد " بھی وضع احادیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

ابن حبان نے لکھا ہے کہ ایک بار " میسرہ بن عدربہ " سے پوچھا گیا کہ یہ حدیثیں تم کیوں وضع کرتے ہو تو انھوں نے جواب دیا کہ " میں محض عوام کی درستی اخلاق کی غرض سے ایسا کرتا ہوں "۔۔۔ پھر اگر یہ بات صرف اخلاق و تعلیم اخلاق ہی تک محدود رہتی تو چنداں مضایقہ نہ تھا لیکن غضب تو یہ ہوا کہ اسرائیلی خرافیات کا بھی بہت بڑا ذخیرہ اسی صورت سے اسلام میں شامل ہو گیا اور اس کی ثقاہت ختم ہو گئی۔

نقل اسرائیلیات کی رو اتنی تند و تیز تھی کہ اس میں بڑے بڑے صحابہ کے قدم بھی اکھڑ گئے، یہاں تک کہ خلفاء راشدین کا دامن بھی اس خار زار میں الجھ گیا اور عبداللہ بن سلام، عبداللہ بن عمرو اور عمرو بن العاص جیسے مقتدر صحابہ بھی اس سے نہ بچ سکے۔ چنانچہ شام کے فتح ہونے کے بعد جب یہود و نصاریٰ کی کتابیں اونٹوں پر بار کرکے دارالخلافہ میں لائی گئیں تو ابوہریرہ اور عمرو بن العاص وغیرہ نے بہت سے اسرائیلی اخبار و قصص حدیثوں کی صورت میں بیان کرنا شروع کر دئے۔

علامہ سیوطی، اپنی کتاب " الاتقان فی علوم القرآن " میں لکھتے ہیں کہ " اسرائیلی کتابوں کے بہت سے قصص و اخبار جو یوم آخرت کے بیان سے تعلق رکھتے تھے اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں عبداللہ بن عمرو اور ابن عباس نے ان کتابوں سے لیکر روایت کر دیں "۔

چنانچہ بعض صحابہ نے صاف صاف یہاں تک کہدیا کہ " صحایف اسرائیل کے قصے بیان نہ کیا کرو "

حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ " ابن عباس اکثر اسرائیلی کتابوں سے ان کی روایات اخذ کر لیا کرتے تھے "۔ بعد کے راویوں نے ان میں کچھ اور اضافہ کر دیا، چنانچہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ :۔ " جب یہودی مسلمان ہوئے تو

بہت سی وہ روایات بھی اپنے ساتھ لائے جو ابتدائے خلق، قرب قیامت اور دوزخ وجنت وغیرہ سے تعلق رکھتی تھیں اور اس طرح وہ تمام روایتیں مسلمانوں میں رواج پاگئیں" — اور اس طرح علم حدیث اور اس کی وساطت سے علم فقہ دونوں خرافیات سے بھر گئے۔

تاہم ہماری رائے یہ ہے کہ اہل قرآن اور اہل حدیث دونوں اعتدال سے ہٹ گئے ہیں، وہ اس لئے کہ بغیر کسی تخصیص و تعیین کے سرے سے استمساک بالحدیث کے قایل ہی نہیں (حالانکہ بہت سے دینی مسایل کی وضاحت حدیث ہی سے ہوتی ہے)۔ اور یہ اس لئے کہ وہ تمام موجودہ کتب احادیث کو ناقابل تردید لٹریچر قرار دیتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ وہ قرآن کو بغیر احادیث کی مدد کے سمجھنے کے قایل ہی نہیں ہیں۔

اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں کو کسی ایک نقطۂ اشتراک پر لایا جا سکتا ہے یا نہیں اور اگر ایسا ممکن ہے تو اس کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کی بہتر صورت یہ ہو سکتی ہے کہ احادیث کا وہ حصہ جو معجزات، پیشین گوئیوں، اسرائیلیات، معاد و آخرت، عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، مظاہر قدرت کی تاویلات اور تاریخی و علمی مسایل سے متعلق ہے کالعدم قرار دیا جائے اور صرف ان احادیث کو لے لیا جائے جن میں خالص اخلاق و حسن معاشرت یا مسایل فقہیہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور اگر احادیث کا کوئی ایسا صاف و منقح مجموعہ مرتب ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کو ایک طرف اہل قرآن بھی تسلیم کرلیں گے اور دوسری طرف اہل حدیث بھی بہت سے احمقانہ معتقدات و مفروضات کے الزام سے بری ہو جائیں گے — (نیاز)

قرآن نے شروع سے آخر تک کہیں بھی یہ ہدایت نہیں کی ہے کہ نبی سے حدیثیں روایت کرکے ان کو اپنا دین بنالو، بلکہ جابجا اس نے تصریح کردی ہے کہ قرآن ہی کا اتباع کرو۔

"وہذا کتاب انزلناہ مبارک فاتبعوہ"۔ (یہ کتاب جس کو ہم نے اُتارا ہے مُبارک ہے، اس کی پیروی کرو)

ایک آیت میں تصریح فرمادی ہے کہ سوائے قرآن کے اور کسی کی پیروی نہ کرو۔

"اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء"۔ (اسکی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اُتارا گیا، اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو)

حدیث کی بنیاد اسی پر ہے کہ لوگوں نے بزرگان دین کو اولیاء اور مقربین الٰہی سمجھ کر ان کی روایتوں کو واجب الاتباع اور دین سمجھ لیا تھا اب اس نص صریح کے بعد کسی مومن شخص کے لئے مزید دلیل کی حاجت نہیں رہ جاتی۔

لاریب قرآن پاک سے رسول کی بھی پیروی کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

"قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی"۔ (کہدے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو)

مگر خود رسول کو بھی بار بار تصریح کے ساتھ یہ احکام دئے گئے ہیں کہ:-

"واتبع مایوحیٰ الیک"۔ (اس کی پیروی کر جو تجھے وحی بھیجی جاتی ہے)

ایک اور آیت زیادہ وضاحت اور حصر کے ساتھ یہ ہے:- "قل انما اتبع ما یوحیٰ الی من ربی"۔ (کہدے کہ میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو وحی میرے رب کی طرف سے مجھ پر بھیجی جاتی ہے)

جب رسول بھی قرآن ہی کا تابع ہے تو اتباع قرآن اور اتباع رسول در اصل دونوں ایک ہی چیز ہوئی۔

اتباع سنت کے متعلق ادنیٰ اشارہ بھی قرآن میں نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ سنت طریقہ کو کہتے ہیں اور رسول اللہ صلعم کی زندگی کی حیثیتیں مختلف تھیں۔ ایک یہ حیثیت تھی کہ آپ انسان تھے اور وہ طبعی فرائض اور اعمال آپ بھی ادا کرتے تھے۔ جو دوسرے انسان ادا کرتے ہیں۔ مثلاً کھانا، پینا، سونا، قضائے حاجت، لباس وغیرہ۔ دوسری حیثیت عرب ہونے کی تھی کہ اس ماحول میں جس طریقہ سے زندگی بسر کی جاتی تھی اس کی بہت سی باتوں کی پابندی آپ کو بھی کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً عرب میں رہنا، عربی زبان بولنا، عربی لباس پہننا، عربی عورتوں سے شادیاں کرنا وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ یہ تمامتر دنیاوی امور ہیں جن میں رسول کے طریقہ کی پابندی نہ دین کا جزو ہو سکتی ہے نہ دنیا سے کرائی جا سکتی ہے اسلئے سنت یعنے طریقۂ زندگیٔ رسول مامور کیونکر ہو سکتی ہے۔

بے شک آپ کی معظم ترین حیثیت رسول اللہ اور معلمِ امت کی تھی اور آپ اوامر الٰہی کے اولین مامور تھے اور اُن پر عمل کر کے دکھلاتے تھے تاکہ امت کے لئے نمونہ ہوں۔ اس حیثیت سے آپ کی ذات پیشوائے امت تھی۔ یعنی تعمیل احکام الٰہی کا نمونہ آپ کی ذات سے سیکھا جاتا تھا اور یہ سنت نہیں ہے بلکہ اس کو قرآن نے اسوۂ رسول کہا ہے۔

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃٌ حسنۃٌ"۔ (تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ ہے)

اور سنت مطلقاً طریقۂ زندگیٔ رسول کو کہتے ہیں خواہ کسی حیثیت سے ہو۔ جس میں سے بڑا حصہ محض انسان اور عرب ہونے کا تقاضا جو نہ دین ہے نہ شرع نہ مامور بہ۔

احادیث کی صورت یہ ہے کہ راوی ایک حدیث بیان کرتا ہے وہ خود ہی مدعی ہے کہ میں نے یہ حدیث فلاں سے سُنی۔ پھر وہ دعوے کرتا ہے کہ اس سے اس کو فلاں نے بیان کیا۔ اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ رسول اللہ تک پہونچتا ہے۔ اور کسی درجہ میں نہ کوئی شاہد ہے نہ کوئی گواہ۔

پھر کیا شہادت، درشہادت، درشہادت، درشہادت سے آپ کسی اسلامی یا غیر اسلامی عدالت سے ایک پائی کا بھی فیصلہ اپنے حق میں لے سکتے ہیں؟ - الغرض حدیث اور اسماء الرجال وغیرہ تاریخی علوم ہیں نہ کہ دینی۔

اطاعتِ رسول

اہل سنت کی سب سے بڑی دلیل حدیثوں کو تسلیم کرانے کے لئے یہ ہے کہ قرآن میں حکم ہے:-

"اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم"۔ (اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ کی اطاعت کرو اور اُن امراء کی جو تم میں سے ہوں)

کہتے ہیں کہ جب تک حدیثیں تسلیم نہ کی جائیں رسول اللہ کی اطاعت کیونکر ہو سکتی ہے؟

اس کے دو جواب ہیں ایک الزامی اور دوسرا تحقیقی۔

الزامی جواب یہ ہے کہ اطاعتِ رسول کے ساتھ ہی ساتھ امراء اسلام کی بھی اطاعت کا حکم ہے۔ آپ نے احادیث رسول کے دفاتر تو طیار کر لئے لیکن امراء اسلام کی احادیث کے مجموعے کیوں نہ بنائے کہ دین کا جزو ہوتے۔ کیونکہ بلا اُن کی احادیث کے اُن کی اطاعت کیونکر ہو سکتی ہے؟

"افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض الآیہ"۔ (کیا تم کتاب کے ایک ٹکڑے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے پر نہیں)

تحقیقی جواب یہ ہے کہ اطاعت رسول کو ہم بھی فرض سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

"وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ"۔ (اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لئے کہ اذن الٰہی سے اسکی اطاعت کیجائے)

لیکن رسول کی اطاعت یہی ہے کہ جو پیغام وہ حق کی طرف سے لایا ہے اور جس کی اتباع وہ خود کرتا ہے اُس کی پیروی کی جائے۔ قرآن میں یہی ہے:۔ "فالذین آمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولٰئک ہم المفلحون"۔

(جو لوگ اس پر (رسول) ایمان لائے اور اُسکی مدد کی اور ساتھ دیا اور اس نور (قرآن) کی پیروی کی جو اسکے ساتھ اُتارا گیا ہے تو وہی کامیاب ہوں گے)۔

یہ ہرگز رسول کی اطاعت نہیں کہ اس کے نام کی طرف جو کوئی سچ یا جھوٹ منسوب کرے اس کو ہم مانیں۔ کیونکہ یہ ہمارے نزدیک دین اور انسانیت دونوں کی اہانت ہے۔ ہمارا ایمان تو اس نورانی کتاب پر ہے جس کو اُتارنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُس فرشتہ کو آسمان میں نازل نامزد فرمایا جو ملائکہ میں امین ہے اور زمین میں اس رسول کو منتخب کیا جو انسانوں میں امین تھا۔ زمین سے آسمان تک شہاب ثاقب کے پہرے شیطانوں پر قائم کئے کہ اس مقدس کلام میں آمیزش نہ کر سکیں۔ اُتارنے والا امین۔ راستہ مامون۔ جس پر وہ اُتارا گیا وہ امین۔ پاک کلام۔ ہر آمیزش سے بری۔ سراسر حق۔ جس کی شان یہ ہے:۔

"وبالحق انزلناہ وبالحق نزل"۔ (ہم نے حق کے ساتھ قرآن کو اُتارا اور وہ حق کے ساتھ اُترا)

ہماری نگاہ میں جملہ مجموعہ احادیث قرآن کے ایک حرف کی بھی قیمت نہیں رکھتا۔ ہم امام یحییٰ بن معین وغیرہ آئمہ جرح و تعدیل کے یہ الفاظ سنتے ہیں کہ "حدیث قرآن پر قاضی ہے" یا علماء اصول کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ سنت قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے تو اس روایت پرستی پر ہم کو سخت حیرت ہوتی ہے۔ ہم تو ان لوگوں کو اصل علم مانتے ہیں جن کی نسبت قرآن کریم کہتا ہے:۔

"ویری الذین اوتوا العلم الذی انزل الیک من ربک ہو الحق"

(جن کو علم دیا گیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اُتارا گیا ہے وہی حق ہے)

یقیناً احادیث پرستوں کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ ہم جھوٹ اور سچ کو جانچ لیتے ہیں اور ائمہ حدیث نے بخاری وغیرہ کی حدیثوں کو تنقید کر کے صحیح قرار دیا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ روایت کی صداقت ایک باطنی وصف ہے جس پر قطعی شہادت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے یہ شہادت خود ظنی ہے اور ازیں قبیل حدیث کی تصحیح اور تغلیط کے جو اصول مقرر کئے گئے ہیں وہ بجائے خود صحیح نہیں ہیں۔ اہل نظر متکلمین نے قدم قدم پر اختلافات کئے مگر شخصیت پرستی کے جذبہ میں محدثین نے ان کی طرف توجہ نہ کی اور رائج ہیں کمزور اصولوں پہ حدیث کی عمارت کھڑی کر دی۔

اس صورت میں ہم راوی کے بیان کو اسی کا قول سمجھتے ہیں نہ کہ قول رسول۔ اور قرآن نے یہ زریں اصول سکھلایا ہے۔

"وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن"۔

(روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کی اطاعت کرو تو اللہ کی راہ سے وہ تم کو گمراہ کر دیں گے وہ نہیں پیروی کرتے مگر ظن کی)

علماء حدیث، احادیث کو ظنی قرار دیتے ہیں۔ اور ظنیات سے دین کا کام نہیں چلتا۔

"ان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً"۔ (ظن حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا)

امام غزالیؒ المستصفٰی میں لکھتے ہیں (جلد اول صفحہ ۱۴۵ مطبوعہ مصر)

"خبر الواحد لا یفید العلم"۔ (خبر واحد مفید یقین نہیں)

خبر واحد کس کو کہتے ہیں؟ یہ بھی اسی صفحہ میں انھیں کے قلم سے دیکھئے:۔

"انا نوید بخبر الواحد فی ہذا المقام مالا ینتھی الی حد التواتر۔ فما نقلہ جماعۃ من خمسۃ او سنۃ مثلاً فہو خبر الواحد"

ہم خبر واحد سے اس مقام پر وہ حدیث مراد لیتے ہیں جو حد تواتر تک نہ پہنچتی ہو مثلاً جو حدیث ایک جماعت پانچ یا چھ راویوں سے روایت کرے وہ خبر واحد ہے۔ بے شک متواتر یقینی ہے کیونکہ تواتر یقینیات کی ایک قسم ہے مگر کسی متواتر حدیث کے وجود ہی میں بحث ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین حدیثیں ہیں، جن کو لوگوں نے متواتر کہا ہے۔ امام ابن صلاح اور ابن تیمیہ کا ذکر چھوڑئیے۔ کیونکہ ان دونوں حضرات کو حدیث کے معاملہ میں غلو ہے۔ بخاری اور مسلم کی حدیثیں جو جملہ ائمۂ حدیث کے نزدیک غیر متواتر اور ظنی ہیں۔ ان کے نزدیک یقینی ہیں اور بجز اپنے عقیدہ کے اور کوئی دلیل ان کے پاس نہیں۔ قرآن کریم میں ہے:-

"ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم"۔

(بعض لوگ حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں کہ لوگوں کو بلا علم کے گمراہ کریں)

اس میں بغیر علم کا لفظ خصوصیت کے ساتھ توجہ کے قابل ہے کہ ائمہ حدیث نے حدیث کو مفید علم نہیں قرار دیا ہے۔

الغرض جس کا نام لوگوں نے سنت رکھا ہے اس کی کوئی تائید قرآن سے نہیں ملتی بلکہ مخالفت پائی جاتی ہے۔ سنت کی اہمیت پر ایک آیت یہ پیش کی جاتی ہے:-

"یرید اللہ لیبین لکم ویھدیکم سنن الذین من قبلکم"۔

(اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے بیان کردے اور تم کو اگلوں کے راستوں کی ہدایت کرے)

مگر اللہ یہاں جس سنت کو بیان کرنا چاہتا ہے وہ وہی ہے جو اس نے انبیائے سابقین کو سکھلائی تھی اور اسی کو ہماری ہدایت کے لئے ہمارے واسطے بیان کرنا چاہتا ہے۔ دراصل یہ وہی صراط مستقیم ہے جس کی ہدایت ہم ہر نماز میں مانگتے ہیں۔ یعنے ایمان۔ تقوےٰ۔ تزکیۂ نفس۔ اصلاح اعمال۔ ادائے فرائض وحقوق وغیرہ جن کے ساتھ دنیا و آخرت کی سعادت وابستہ ہے اور جو آسمانی دین ہے۔ نہ کہ اس قسم کی سنت کہ رسول اللہ نے زندگی بھر تہجد اور عمامہ باندھا۔ داڑھی چھوڑی اور مونچھ ترشوائی۔ حلوا اور شہد پسند فرماتے تھے اور دنیا کی چیزوں میں خوشبو اور عورت مرغوب خاطر تھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ یہ شخصی حالات ہیں جو تاریخ ہیں نہ دین۔

قرنہا قرن گزر گئے کہ امت اسلامیہ اسی مشکوک اور ظنی تاریخ کو دین کے نام سے حاصل کرتی چلی آتی ہے اور اپنی فرقہ بندیوں میں اس سے امداد لے کر اصل دین کو جو قرآن ہے چھوڑ بیٹھی ہے جس سے دنیا بھی گئی اور دین بھی گیا۔ اور عقلی اور علمی خرابیاں تو حد شمار سے زیادہ پیدا ہو گئیں۔

سب سے پہلے عہد رسالت اور عہد صحابہ میں حدیث کی حیثیت کو دیکھنا چاہئے کہ کیا تھی؟

عہد اول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برخلاف قرآن کے حدیث کی حفاظت کی طرف کبھی توجہ نہ فرمائی، بلکہ آپ نے یہ حکم دیا کہ:-

"لاتکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی شیئاً فلیمحہ"۔

(مجھ سے سوائے قرآن کچھ نہ لکھو۔ اور جس نے مجھ سے کچھ لیا ہو چاہئے کہ اس کو مٹا ڈالو)

خلیفۂ اول نے چند حدیثیں لکھی تھیں لیکن آخر میں ان کو جلا دیا۔

قاضی مکہ ابن ابی ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ تم لوگ حدیثیں بیان کرتے ہو جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ اس سے بھی زیادہ اختلافات

کریں گے اس لئے رسول اللہ سے کوئی روایت نہ کرو۔

خلیفۂ اول قبول حدیث میں بہت محتاط تھے اور بغیر شہادت کے کسی کی روایت نہیں مانتے تھے۔ جدّہ کی وراثت کے متعلق حضرت مغیرہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ایک سدس دلوایا کرتے تھے۔ اس پر ان سے شہادت طلب کی۔

حضرت عمرؓ بھی بلا شہادت کے کسی کی روایت نہیں مانتے تھے، یہاں تک کہ ابو موسیٰ اشعری جیسے جلیل القدر صحابی سے بھی انھوں نے اس روایت پر کہ رسول اللہ سے میں نے سُنا ہے کہ جب کوئی تین بار پکارے اور مکان سے آواز نہ آئے تو واپس چلا جائے۔ شہادت طلب کی اور کہا کہ اگر نہ لائیے گے تو خبر لوں گا۔

امام ابو سلمہ نے حضرت ابو ہریرہ سے پوچھا کیا تم حضرت عمرؓ کے عہد میں اسی طرح روایت کرتے تھے اُنھوں نے کہا کہ میں ان کے زمانہ میں اس طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھ کو اپنے دُرّے سے پیٹ ڈالتے۔

حضرت عمرؓ صحابہ کو حکم دیا کرتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے رسول اللہ سے روایتیں کم کریں۔ جب عراق کی طرف فوج روانہ کی تو خود بھی ساتھ ساتھ گئے اور رخصت کرتے وقت فرمایا کہ میں اسی لئے تم کو پہونچانے آیا تھا کہ یہ نصیحت کروں کہ تم ایسی جگہ جاتے ہو جہاں لوگ قرآن میں مشغول ہیں۔ دیکھو روایتیں بیان کر کے اُن کو قرآن سے نہ روکنا۔

حضرت عثمان روایتوں کو نہیں مانتے تھے۔ ان کے پاس محمد بن علی بن ابی طالب اپنے باپ کے پاس سے وہ صحیفہ لے کر گئے جس میں زکوٰۃ کے احکام تھے۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ مجھے اس سے معاف رکھو۔

حضرت عبداللہ بن عباس کے سامنے بشیر بن کعب نے حدیثیں بیان کرنا شروع کیں۔ اُنھوں نے نہیں سنا۔ اس پر بشیر نے کہا کہ میں رسول اللہ کی حدیثیں بیان کرتا ہوں اور آپ نہیں سنتے۔ فرمایا کہ ہم اُس وقت حدیثیں سنتے تھے جب رسول اللہ پر لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ اب جب سے لوگ ہر قسم کے رطب و یابس باتیں کہنے لگے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔

ابن عباس نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت "الوضوء مما مستہ النار"، کو تسلیم نہیں کیا۔ نہ حضرت علیؓ کی حرمت متعہ والی روایت کو مانا ابن عمرؓ کے سامنے جب ابو ہریرہ کی روایت کلب زرع کے متعلق بیان کی گئی تو اُنھوں نے فرمایا کہ ابو ہریرہ کے پاس کھیتی ہے[1]۔ الغرض صحابۂ کرام نے حدیث کو دینی حجت نہیں سمجھا۔ اُنھوں نے اس کی حفاظت بھی نہیں کی۔ بلکہ اُس کو فتنہ سمجھ کر روکتے رہے۔ ان کے زمانہ میں لوگ جھوٹ بولنے لگے تھے۔ اس وجہ سے بہت سے صحابہ نے حدیث کو چھوڑ بھی دیا تھا۔ امام شافعی بیان کرتے ہیں کہ میں ایک سال تک ابن عمرؓ کی خدمت میں رہا اور ان کی زبان سے کوئی حدیث نہ سُنی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر بھی شاذ و نادر ہی کوئی حدیث بیان کرتے تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی موطا دوسری صدی ہجری اور بخاری اور مسلم تیسری صدی ہجری میں مدون ہوئیں، جبکہ حدیثوں نے دینی رنگ اختیار کر لیا تھا اور ائمۂ حدیث مقدس اور مقتدائے امت سمجھے جانے لگے تھے۔ مسلمانوں میں فرقے پیدا ہو گئے تھے اور ہر ہر فریق اپنے اپنے فرقے کی حمایت میں حدیثیں پیش کرنے لگا تھا۔ اس وجہ سے وضع، جعل اور کذب کے امکانات حدیثوں میں بہ نسبت تاریخ کے بھی زیادہ ہو گئے تھے، اور جو اصول تصحیح حدیث کے لئے مرتب کئے گئے، وہ عقلی طور پر بیشتر غلط اور محض شخصی اعتبار پر قایم کئے گئے۔ جن کی وجہ سے حدیثوں کی حیثیت ایک ظنی تاریخ سے زیادہ نہ رہی نہ وہ قرآن کے کسی خاص کو عام اور عام کو خاص کر سکتی ہیں، نہ مطلق کو مقید اور نہ مقید کو مطلق، اور زیادتی علی الکتاب کا تو خیال ہی مہمل ہے اور نسخ کا اس سے زیادہ۔

---

[1] یہ جملہ روایت میں نے کتاب توجیہ النظر الیٰ اصول الاثر مصنفہ شیخ طاہر جزائری سے نقل کی ہیں۔

بعض آیاتِ قرآنی کی تصریح

۱۔ "فقبضت قبضۃ من اثر الرسول" (سورۃ ۲۰ - آیت ۹۶) ۔ سامری کے قصہ میں عام تفاسیر کا بیان ہے کہ سامری نے جو گوسالہ بنایا تھا وہ آواز دیتا تھا۔ لوگوں نے جب اس سے پوچھا تو اس نے کہا "فقبضت قبضۃ من اثر الرسول" جس کو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سامری نے رسول یعنی جبرئیل کے قدم کی خاک لے کر اس میں ڈال دی تھی۔ (گویا رسول کے معنی جبرئیل کے لئے گئے ہیں) لیکن امام رازی نے تفسیر کبیر میں اسکی تردید کردی ہے۔

اس آیت میں رسول سے مراد خود حضرت موسیٰ ہیں اور اس پوری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب سامری سے پوچھا گیا کہ تونے کیوں گوسالہ بناکر لوگوں کو گمراہ کیا تو اس نے جواب دیا کہ "میں نے رسول (موسیٰ) کے راستہ کو پوری طرح اختیار نہ کیا تھا اور بعد کو اسے ترک کردیا۔

۲۔ "اذ قال امراۃ عمران" (سورت ۳ - آیت ۳۴) ۔ اس آیت میں مریم کو امراۃ عمران کہا گیا ہے۔ اور دوسری جگہ سورۃ ۱۹ - آیت ۲۸ (یا اخت ہارون ماکان ابوک الخ) ______ میں انھیں اخت ہارون کہکر خطاب کیا گیا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہارون، موسیٰ کے بھائی تھے اور مریم کو اخت ہارون (ہارون کی بہن) کہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ موسیٰ کے زمانہ میں پائی جاتی تھیں بلکہ موسیٰ کی بہن بھی تھیں اور یہ سخت تاریخی غلطی ہے۔

مگر یہ اعتراض صحیح نہیں، کیونکہ امراۃ عمران سے عمران کی بیوی مراد نہیں ہے بلکہ خاندان عمران کی عورت مراد ہے، اسی طرح اخت ہارون کے معنی ہارون کی بہن نہیں بلکہ خاندان ہارون سے تعلق رکھنے والی مراد ہے۔ اگر مریم کا تعلق عہد موسیٰ سے سمجھا جاتا تو انھیں اخت ہارون کے نام سے کیوں یاد کیا جاتا۔ اختِ موسیٰ کہا جاتا۔ سامی زبانوں میں لفظ اب (باپ)، اُم (ماں)، اخ (بھائی)، اُخت (بہن) کا استعمال بہت وسیع تھا اور صرف ماں، باپ، بھائی، بہن کے معنی میں استعمال نہیں ہوتے تھے بلکہ کسی قدیم خاندان یا قبیلہ سے منسوب کرنے کے لئے بھی یہ الفاظ مستعمل تھے۔

۳۔ "جمع الشمس والقمر" (سورۃ ۶۵ (القیامہ) - آیت ۹) ۔ شمس وقمر کے ایک جگہ جمع کردئے جانے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی روشنی ختم ہوجائے گی۔ (تفسیر کبیر امام رازی)

۴۔ "وجعلوا للہ شرکاء الجن" (سورۃ الانعام - آیت ۱۰۱) ۔ انھوں نے جن کو خدا کا شریک قرار دیا۔ اس آیت میں عربوں کے اس اعتقاد کی تردید کی گئی ہے کہ جنات ان کے معاملات میں دخیل ہیں اور اچھے برے نتائج انھیں سے متعلق ہیں۔

اس لئے اس آیت میں جن سے شیطانی قوت مراد ہے جس کے اہل عرب قایل تھے۔

چند اور آیات میں بھی "جن" کا ذکر کیا گیا ہے:۔

۵۔ "وکذلک جعلنا لکل نبی عدوًا شیاطین الانس والجن" (سورۃ الانعام - آیت ۱۱۳)
(یعنی ہر نبی کے لئے انس وجن کے شیاطین اس کے دشمن ہوا کرتے ہیں)۔ انس سے مراد عوام اور جن سے ان کے رہبر و سردار۔

۶ - "یا معشر الجن قد استکثرتم من الانس" (سورۂ انعام - آیت ۱۲۹) - یہاں لفظ جن، کا استعمال کسی ایسی مخلوق کے لئے نہیں ہوا ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہے - بلکہ گمراہ کن شیطانی قوتوں کے لئے ہوا ہے۔

۷ - "ومن الجن من یعمل بین یدیہ" - (سورۂ سبا - آیت ۱۲) - یہاں جن سے مراد وہ غیر ممالک کے لوگ تھے جنھیں سلیمانؑ نے اپنا تابع بنالیا تھا۔

۸ - "استمع نفر من الجن" - (سورۂ جن - آیت ۱) - یہاں جن سے مراد یہودی اور غیر عرب اقوام کے لوگ ہیں۔

۹ - "الذین یحملون العرش" - سورۂ المومن - آیت - (وہ جو عرش اٹھائے ہوئے ہیں) - عرش سے مراد تخت نہیں ہے اور نہ حاملین عرش سے مراد تخت بردار ہیں - بلکہ مراد وہ فطری قوتیں ہیں جو دنیا میں اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔

۱۰ - "لٰکن رسول اللہ وخاتم النبیین" - (سورۂ الاحزاب - آیت ۴۰) - (خاتم النبیین) - خاتم، کے اصل معنی مُہر کے ہیں اور مجازاً کسی چیز کے آخری حصہ کو بھی کہتے ہیں - قرآن میں لفظ خاتِم (بہ معنی ختم کرنے والا) استعمال نہیں ہوا، بلکہ خاتَم (بہ معنی مُہر) استعمال ہوا ہے اور مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ رسول اللہ انبیاء سابق کی تعلیمات کی تصدیق کرنے والے تھے۔

۱۱ - "اخرجنا لھم دابۃ من الارض" - (سورۂ نمل - آیت ۸۲) - دابّہ سے مراد کوئی مخصوص مخلوق نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہم مخالفین کو تباہ کردینے والے اسباب پیدا کردیں گے۔

۱۲ - "جبریل و میکائیل" - (سورۂ بقر - آیت ۹۸) - یہود کا مقصد وہ تھا کہ یہ دونوں فرشتے ہیں - میکائیل کو وہ دوست فرشتہ کہتے تھے اور جبرئیل کو دشمن - انجیل میں جبرئیل کو خدائی پیغامبر بتایا گیا ہے۔

جبریل مرکب ہے جبر و ایل سے - میکائیل مرکب ہے میک وایل سے - جبر و میک بمعنی خادم اور ایل بمعنی خدا - اس لئے ان دونوں کے معنے "خادم خدا" کے ہیں - یعنی وہ فطری قوائے مدبرۂ عالم ہیں۔

۱۳ - "ہاویہ" - (سورۂ ۱۰۱ (القارعہ) لفظ ہاویہ کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ دوزخ کے ایک خاص طبقہ کا نام ہے - حالانکہ اس سے مراد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ انجام برا ہوگا۔

اہل عرب جب کسی کو بددعا دیتے تو کہتے "ھوت امہ"

۱۴ - "فسجدوا الا ابلیس" - (سورت ۲ - آیت ۳۴) - عام مفسرین ظاہر کرتے ہیں کہ "ابلیس" ایک فرشتہ تھا جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا - حالانکہ ابلیس سے مراد "بُری فطرت" ہے جس کو شیطان بھی کہتے ہیں - لفظ ابلیس مشتق ہے بلس کا جس کے معنے مایوسی و محرومی کے ہیں اور لفظ شیطان مشتق ہے شطن یا مشاط سے جس کے معنی تباہ ہوجانے کے ہیں - اس لئے ابلیس کے معنے مغرور و متکبر کے ہیں اور شیطان "گمراہ کرنے والے" کے۔

۱۵ - "والسماء رفعھا ووضع المیزان" - (سورۂ رحمان) - میزان سے مراد ترازو نہیں ہے بلکہ معیار و مقادیر مراد ہیں۔

۱۶ - "واضمم یدک الی جناحک تخرج بیضاء من غیر سوء اٰیۃ اخرٰی" - (سورۂ طٰہٰ) - اس کے معنی "روشن یا درخشاں ہاتھ" سمجھنا صحیح نہیں "ید بیضاء" حجۃ قاطعہ کو بھی کہتے ہیں - (تاج العروس)

۱۷ - "وتفقد الطیر فقال مالی لا اری الھدھد" - (سورۂ نمل - آیت ۲۰) - ہُدہُد سے مراد چڑیا نہیں ہے بلکہ خاص شخص کا نام ہے اور بعد کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلیمان کے دربار کا کوئی خاص افسر تھا۔

۱۸۔ "یایہا النمل ادخلوا مساکنکم"۔ (سورۂ نمل، آیت ۱۸) ۔ نمل چیونٹی کو بھی کہتے ہیں، لیکن بعض مفسرین کا یہ بیان کہ اس میں چیونٹیوں سے خطاب کیا گیا ہے درست نہیں۔

نملہ ایک قبیلہ کا نام تھا اور وادی النمل، ایک وادی تھی جو جبرین و عقلان کے درمیان واقع تھی۔ (تاج العروس)

۱۹۔ "جاعل الملائکۃ رسلا اولی اجنحۃ"۔ (سورۂ الفاطر ۔ آیت ۱) ۔ اس آیت میں ملائکہ کو پر و بازو رکھنے والا کہا گیا ہے حالانکہ جب کسی کی قوت ٹوٹ جاتی ہے تو کہتے ہیں "ہو مقصوص الجناح" (اس کے بازو توڑ دئے گئے) ۔ ہر چند "اجنحہ" بازو کو کہتے ہیں لیکن عربی میں لفظ جناح، قوت کے معنی میں بھی آتا ہے: ——— الغرض ملائکہ کا استعمال یہاں غیر مادی یا روحانی قوت کے مفہوم میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب کسی شخص میں کسی بات کی خاص اہلیت و قابلیت پائی جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو اس بات میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔

۲۰۔ "حتی اذا جاء امرنا و فار التنور"۔ (سورۂ ہود ۔ آیت ۴۰) ۔ یہ آیت طوفان نوح کے سلسلہ کی ہے۔ اس آیت میں لفظ فار اور تنور، نے بعض مفسرین کو مغالطہ میں ڈال دیا اور یہ قصہ مشہور ہو گیا کہ طوفان نوح کسی بڑھیا کے تنور یا بھٹی سے ابل پڑا تھا۔

فار کے معنی صرف ابلنے اور جوش کھانے کے نہیں ہیں، بلکہ زمین کے اندر سے چشمہ پھوٹ نکلنے کو بھی کہتے ہیں، اسی طرح تنور صرف بھٹی کو نہیں کہتے بلکہ پانی کے حوض یا کسی ایسی جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو جائے۔ اس لئے اس کے معنی یہ ہوئے کہ پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا، بھٹی سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

بعض نایاب کتابیں

چوتھائی قیمت پیشگی ملنا ضروری ہے

کلیات صہبائی ۔ امام بخش ۔ صفحہ ۵۱۴ = (عـہ) ——— قصاید عرفی ۔ جمال الدین ۔ صفحہ ۱۴۸ = (ـہ) ——— ہشت بہشت ۔ امیر خسرو = (للعہ)

مثنوی قرآن السعدین ۔ امیر خسرو = (للعہ) ——— کلیات سعدی شیرازی ۔ مطبوعہ بمبئی ۔ (ـہ) ——— مصطلحات وارستہ = (ـہ)

غیاث اللغات مع چراغ ہدایت = (ـہ) ——— گلستان قاآنی ۔ مرزا حبیب = (ـہ) ——— بہارستان جامی و لوائح جامی = (للعہ)

توزک جہانگیری، اردو = (عـہ) ——— سوانح عمری امیر تیمور و حمیدہ بانو بیگم ۔ مرزا حیرت = (ـہ) ——— حدیقۃ الاولیا و آخر ناقص = (ـہ)

حیات جامی = (ـہ) ——— کلیات انشاء اللہ خاں انشاء = (ـہ) ——— دیوان مصحفی = (ـہ) ——— دیوان رند = (ـہ)

تجلائے شہاب ثاقب ۔ دیوان ثاقب مع سوانح مرزا ذاکر حسین ثاقب = (ـہ) ——— ریاض رضوان ۔ ریاض احمد ریاض = (ـہ) ——— کلیات نظیر اکبر آبادی ۔ مرتبہ عبد الباری آسی (ـہ) ——— انتخاب داغ = (ـہ)

کلیات نظیر اکبر آبادی = (ـہ) ——— دیوان درد ۔ خواجہ میر درد = (ـہ)

کلیات ولی ۔ مرتبہ احسن علی احسن مارہروی ۔ مطبوعہ ٹائپ = (عـہ) ——— صنم کدۂ عشق ۔ امیر احمد امیر = (ـہ) ——— نظم دل افروز ۔ امیر اللہ تسلیم = (ـہ)

دیوان مجروح = (للعہ) ——— انتخاب داغ = (للعہ) ——— ترانہ ۔ یگانہ = (للعہ) ——— گلزار داغ ۔ نواب مرزا = (عـہ) ——— مہتاب داغ = (للعہ)

یادگار داغ = (ـہ) ——— کلیات میر تقی میر = (ـہ) ——— دیوان ناظم ۔ نواب محمد یوسف علی خاں ناظم رامپوری = (عـہ) ——— دیوان میر اثر = (ـہ)

کلیات سودا ۔ جدید اڈیشن = (عـہ) ——— دیوان نسیم دہلوی = (عـہ) ——— کلیات میر تقی میر ۔ جدید اڈیشن = (ـہ) ——— مثنوی میر حسن

کفر و اسلام کی روایتی و عقلی حیثیت

اور

ہمارے موجودہ علماء کرام کا صحیح موقف

توحید و بت پرستی یا کفر و اسلام کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے لفظ غیر مسلم پر مذہبی و فقہی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔ غیر مسلم کے مقابلہ میں دو بہت کھلے ہوئے الفاظ قرآن میں استعمال کئے گئے ہیں:- "کافر و مشرک" لیکن اسی کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر وہ شخص جو دائرۂ اسلام سے خارج ہے، کافر یا مشرک ضرور ہوگا۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے ہم کو سب سے پہلے مسلم، کافر اور مشرک ان تینوں اصطلاحوں پر غور کر کے معلوم کرنا ہے کہ قرآن یا شارع نے ان الفاظ کا کیا مفہوم مراد لیا ہے۔

ایمان - اسلام - مسلم - مومن اب آپ سب سے پہلے لفظ مسلم کو لیجئے۔ عرب لٹریچر میں مسلم کا لفظ صرف دین اسلام کے ماننے والوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور آج کل بھی دنیا کے ہر لٹریچر میں مسلم بول کر یہی مراد لی جاتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ اس وقت اس لفظ کا استعمال زیادہ تر سوسائٹی یا کمیونٹی کے مفہوم میں ہوتا ہے اور اس سے قبل عہد نبوی و قرون اولیٰ میں مسلم و مومن دونوں تقریباً ایک ہی مفہوم رکھتے تھے۔

قرآن میں مسلم و مومن کے الفاظ متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں، لیکن لفظ ایمان اور اس کے مشتقات بہ نسبت اسلام اور اس کے مشتقات کے بہت زیادہ استعمال کئے گئے ہیں، یہاں تک کہ ایک مکی سورت کا نام ہی "المومنین" ہے۔

لیکن معنوی حیثیت سے اسلام زیادہ وسیع چیز ہے، یہاں تک کہ اسے بالکل فطری چیز قرار دیا گیا ہے اور رسول اللہ سے قبل جو پیغمبر آ چکے تھے ان کے بتائے ہوئے مذہب کو بھی اسلام ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں اکثر جگہ اسلام و ایمان کا استعمال ایک ہی مفہوم میں ہوا ہے، لیکن کہیں کہیں صراحتاً ان میں تفریق بھی کردی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ الحجرات میں ارشاد ہوتا ہے:-

"قالت الاعراب آمنّا۔ قل لم تومنوا ولاکن قولوا اسلمنا و لما یدخل الایمان فی قلوبکم وان تطیعوا اللہ و رسولہ لا یلتکم من اعمالکم شیئاً۔"

(اہل عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، تو اے رسول ان سے کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ صرف اسلام لائے ہو (یعنے اطاعت قبول کرلی ہے) اور جب ایمان تمہارے دلوں میں سما جائے گا (یعنی، اللہ و رسول کی صحیح معنی میں اطاعت کرو گے تو تمہارے اعمال (خیر) میں کوئی کمی نہ ہوگی)

اس کے علاوہ بعض آیات اور بھی ہیں جن سے ایمان و اسلام کے مفہوم کا فرق ظاہر ہوتا ہے اور اسی لئے ایمان کے متعین کرنے کی ضرورت

محسوس کی گئی۔

لغوی حیثیت سے لفظ ایمان کا مادہ امن ہے، جس کے معنی ہیں:۔ اطمینان نفس، بے خوفی اور اعتماد کے۔ اسی لئے فقہ میں ایمان کا اصطلاحی مفہوم قرار پایا:۔ "اللہ، اس کے رسول اور رسول کے پیغامات پر بھروسہ کرنا" (احیاء العلوم ۔ غزالی) لیکن غزالی کی یہ تعریف بھی مبہم ہے۔

رسول اللہ کی ایک حدیث ہے کہ:۔ "جس کے دل میں ایک ذرہ برابر ایمان ہے وہ بھی آگ سے محفوظ رہے گا"۔ اس حدیث پر فقہاء نے بھی غور کیا اور متکلمین نے بھی اور یہ موشگافیاں اتنی بڑھیں کہ ایمان کا صحیح مفہوم متعین ہونے کے بجائے اس میں اور گتھیاں پڑ گئیں۔ اشعری و ماتریدی جماعت نے بتایا کہ ایمان کا تعلق صرف قلب سے ہے۔ حنفی جماعت نے اس کے ساتھ زبان سے بھی اس کی تصدیق ضروری قرار دی اور خارجیوں نے عمل کو بھی لازم ٹھہرایا۔ قرامطہ نے صرف زبان سے اقرار کر لینا کافی سمجھا۔ جہمی اور جبریوں نے کہا کہ ایمان نام ہے معرفت خدا و قرآن کا عقل کے ذریعہ سے۔ اسلاف پرست مسلمانوں نے ایمان نام رکھا قلبی، اخلاقی اعتقاد کا اور اسی کے ساتھ زبان سے اس کے اظہار کا، لیکن عمل خیر کو ضروری قرار نہیں دیا۔ گو مرتبہ بلند حاصل کرنے کے لئے اعمال حسنہ بھی ضروری تھے۔ معتزلہ نے ایک نئی صورت پیش کی وہ یہ اگر کوئی مسلمان کسی ایک گناہ کبیرہ کا بھی مرتکب ہو تو وہ نہ مسلمان ہے نہ کافر بلکہ منافق ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، مرجیہ اور خارجیہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل ضد تھے۔ خارجی تو اعمال حسنہ اور گناہوں سے احتراز کو بھی اسلام کی ضروری شرط قرار دیتے تھے۔ لیکن مرجیہ جماعت کہتی تھی کہ ہر وہ شخص جو اپنے کو مسلم کہتا ہے، مسلم ہے۔ یہ جماعت ابتدائے عہد اسلام میں اسی وقت پیدا ہو گئی تھی، جب لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دل سے کون ایمان لایا ہے اور کس نے ظاہرداری سے کام لیا ہے، اس صورت میں انھوں نے یہی فیصلہ مناسب سمجھا کہ ہر وہ شخص جو قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا ہے مسلمان ہے اور ہمیں اس کے اعمال و افعال کے احتساب کی ضرورت نہیں اسی کے ساتھ یہ بحث شروع ہوئی کہ ایمان کے مدارج ہیں یا نہیں یعنی اس میں کمی یا زیادتی کا سوال پیدا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ میں بھی دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک تو اس بات کا قایل تھا کہ ایمان میں کمی یا زیادتی کے کوئی معنی نہیں (الایمان لا یزید ولا ینقص) لیکن یہ بات چونکہ رسول اللہ کی اس حدیث کے خلاف تھی، جس میں ذرہ برابر ایمان رکھنے والے کو بھی جنت کی بشارت دی گئی ہے اس لئے علماء کا رجحان زیادہ تر یہی رہا کہ ایمان میں کمی یا زیادتی ہو سکتی ہے لیکن چونکہ اس کا علم اعمال حسنہ ہی سے ہو سکتا ہے، اس لئے مدارج ایمان متعین کرنے میں ایک مسلمان کے کردار ہی کو دیکھ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے

کفر۔ کافر

اب آئیے لفظ کفر کے مفہوم پر غور کریں، یہ لفظ قرآن میں مع اپنے تمام مشتقات کے بہ کثرت استعمال ہوا ہے۔ کہیں محض جحود و انکار، یا ناشکر گزاری کے لغوی معنی میں اور کہیں اصطلاحی معنی میں جو مومن یا مسلم کی ضد ہے۔

قرآن میں سب سے پہلے سورۂ المدثر میں کافرین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ الہامی ترتیب کے لحاظ سے کئی صورتوں میں سورۂ المزمل کے بعد یہ دوسری صورت ہے جو رسول اللہ پر نازل ہوئی۔ لفظ کافر سب سے پہلے ان اہل مکہ کے لئے استعمال کیا گیا، جنھوں نے اسلام لانے سے انکار کیا اور رسول اللہ کو جھٹلایا۔ ابتدائی کئی سورتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کا طرز عمل کفار مکہ کے ساتھ اس امید پر کہ شاید وہ اسلام لے آئیں اول اول ایک حد تک روادارانہ رہا، لیکن جب بالکل مایوسی ہو گئی تو پھر ان سے مقاطعہ کی ہدایت کر دی گئی (سورۂ آل عمران۔ آیت ۲۷) علاوہ اس کے بہت سی آیتیں کلام مجید میں ایسی بھی ہیں جن سے کافروں کے انجام کا عمومی ذکر کیا گیا ہے۔

احادیث میں کافی تفصیل کے ساتھ کفر و کافر سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن مثل مشہور ہے "سو منہ سو باتیں" اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مسئلہ سلجھنے کے بجائے زیادہ اُلجھ گیا اور کفر و شرک کی خدا جانے کتنی صورتیں نکل آئیں اور اس سلسلہ میں ملحد، مرتد، منافق، فاسق اور فاجر وغیرہ کی متعدد اصطلاحیں وجود میں آ گئیں اور کفر کی بہت سی قسمیں ہو گئیں مثلاً (۱) کفر و انکار (یعنی خدا کے وجود کو تسلیم نہ کرنا)۔ (۲) کفر و جحود (یعنی خدا کے وجود کو ماننا لیکن زبان سے اس کا اقرار نہ کرنا)۔ (۳) کفر المعاندہ (یعنی خدا کے وجود کا اقرار کرنے کے بعد محض بغض و عناد کی وجہ سے اسلام نہ لانا)۔ (۴) کفر النفاق (یعنی ظاہر میں تو خدا کا قائل ہونا لیکن باطناً اس سے انکار)

اس چھان بین کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس باب میں خارجی، معتزلہ، مرجئہ، عبادیہ، قرامطہ، اشاعرہ، ماتریدی، اہل حدیث وغیرہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے۔

حدیث کے بعد فقہی لٹریچر کو دیکھئے تو یہاں بھی اختلاف نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے تو فقہاء نے غور کیا کہ کافر پاک ہے یا ناپاک اور اس میں اختلاف پیدا ہوا۔ ناپاک کہنے والوں میں شیعہ جماعت نے سختی کے ساتھ کفار کو نجس قرار دیا۔ (یعنی ان کے نزدیک جو دس نجاستیں پیشاب پاخانہ کی قسم کی ہیں انھیں میں کفر بھی شامل ہے اور اسی لئے وہ غیر مسلم کی چھوئی ہوئی چیز کھانا بھی جائز نہیں سمجھتے) لیکن اور جماعتوں نے اس قدر سختی سے کام نہیں لیا اور پاکی یا ناپاکی میں صرف نجاست ظاہری کو سامنے رکھا۔ پھر اسی سلسلہ میں اہل کتاب کے متعلق غور کیا گیا کہ وہ کس قسم کے کافر ہیں اور انھیں پہلے قسم کا کافر قرار دے کر ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا یا ان کے ساتھ رسم ازدواج قائم کرنا جائز مانا گیا۔ جہاد کے سلسلہ میں جب کفار کی بستیوں کو دار الحرب قرار دے کر جہاد فرض کفایہ قرار دیا گیا تو اہل کتاب کے لئے یہ رعایت روا رکھی گئی کہ وہ جذیہ یا خراج ادا کر کے ذمی بن سکتے تھے اور ان کو امان مل سکتی تھی۔

اسی سلسلہ میں مرتد اور کافر کے درمیان بھی تفریق کی گئی کہ اگر مرتد دوبارہ اسلام نہ لائے تو اسے قتل کر دیا جائے اور کافر کے لئے قتل کے سوا اور کوئی صورت مفر کی نہ رکھی گئی مگر یہ کہ وہ جنگی قیدی ہونے کے بعد غلام بنا لئے جائیں۔

اس مسئلہ کو اگر تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کفر و کافر کے مفہوم اور ان کی تعبیر میں زمانہ کے ساتھ ساتھ بہت تبدیلیاں ہوئیں، اول اول عہد رسالت میں کفار سے مراد صرف وہی اہل عرب تھے جو رسول اللہ کے مخالف و دشمن تھے اور اسلام کی راہ میں سنگ گراں بنے ہوئے تھے اس وقت کفر و اسلام کی تفریق کا صرف یہ مفہوم تھا کہ کون رسول اللہ کا دوست ہے اور کون دشمن، اس کے بعد عہد خلفا میں جب فتوحات کا آغاز ہوا اور پیروان اسلام کو معلوم ہوا کہ اسلام میں دین کے ساتھ دنیا بھی شامل ہے تو پھر مصر و عجم پر حملہ کرنے کے لئے "کفر و شرک" کو سبب اصلی قرار دیا گیا۔ اس کے بعد جب حکومت اسلام وسیع ہوئی اور جہانگیری جذبہ ایک حد تک پورا ہو گیا تو پھر کئی صدی تک کفر و اسلام کو مذہب سے زیادہ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جانے لگا اور صلیبی جنگوں کے زمانہ تک کفار اور خصوصاً اہل کتاب کفار کے خلاف تعصب قریب قریب ختم ہو گیا۔ لیکن جب اس کے بعد ترکوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی جنگیں شروع ہوئیں تو عوام میں جذبۂ جہاد تازہ کرنے کے لئے پھر کافر و مسلم کی تفریق کا سوال سامنے لایا گیا۔ اس کے بعد جب اسلامی حکومتوں کو زوال شروع ہوا اور ان کا سیاسی اقتدار کم ہونے لگا تو اس جذبہ میں اور اشتداد پیدا ہوا کیونکہ مسلمان مغلوب ہو کر اب اپنی تسکین اس طرح کر سکتے تھے کہ وہ مذہبی حیثیت سے اپنا تفوق ثابت کریں اور غیر مسلموں کو عند اللہ مقہور و مغضوب قرار دیں۔

تصوف نے اس مسئلہ کو بالکل دوسری نگاہ سے دیکھا اور اس نے روحانیت کے مقابلہ میں تفریق مذہب اور کفر و اسلام دونوں کو پس پشت ڈال کر صرف توحید اور توحید بھی وہ جسے ان کی اصطلاح میں وحدت الوجود کہتے ہیں اصل چیز قرار دے کر یہ فیصلہ کر دیا کہ:

کفر و اسلام در رہش پویاں
وحدہٗ لا الٰہ لہٗ گویاں،

اب آئیے شرک و مشرک کی حقیقت کو بھی سمجھ لیں۔

شرک و مشرک شرک کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کو ایک نہ ماننا بلکہ اس کی خدائی میں کسی اور کو شریک قرار دینا، لیکن عجیب بات ہے کہ ابتدائی مکی صورتوں میں شرک یا مشرک کا کہیں ذکر نہیں پایا جاتا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب تک رسول اللہ خود اپنے تصفیۂ اخلاق و تزکیۂ روح کی منزل سے نہیں گزرے اس وقت تک ان کو دوسروں کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور جب اس کے بعد انھوں نے تبلیغ اسلام شروع کی اور لوگوں کی طرف سے مخالفت شروع ہوئی تو پھر انھیں مشرک قرار دے کر اُن سے احتراز کی ہدایت کی۔

مشرکوں کا ذکر قرآن میں بہت جگہ آیا ہے اور تمام آیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مشرک کہنا بُت پرستی کی وجہ سے تھا۔ وہ بتوں کے سامنے اسی طرح التجائیں لے جاتے تھے جس طرح خدا کے سامنے کوئی لے جائے اور انھیں یقین تھا کہ ان کی زندگی کے صلاح و فساد انھیں بتوں کی خوشنودی یا برہمی پر منحصر ہے۔

مشرکوں کو کلام مجید میں طرح طرح کے عذاب آخرت سے ڈرایا گیا ہے اور سورۂ برائت (۲۸ ویں آیت میں) انھیں نجس و ناپاک ظاہر کیا گیا ہے۔ الغرض کافر و مشرک میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ کافر بہت عام اصطلاح ہے جس میں مشرک اور غیر مسلم اہل کتاب بھی شامل ہیں اور مشرک کی تعریف میں اہلِ کتاب کو شامل کرنے کے باب میں اختلاف ہے۔ بعض کا فیصلہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب بھی مشرکین میں شامل ہیں، بعض مفسرین نے اہلِ کتاب کو بُت پرست قرار نہ دے کر مشرک تسلیم نہیں کیا اور قرآن میں بھی جہاں جہاں لفظ مشرک استعمال ہوا ہے وہاں "بت پرستی یا شرک فی التوحید" ہی مراد لیا گیا ہے۔ احادیث میں بھی مشرک کا ذکر اسی مفہوم میں کیا گیا ہے اور اہلِ فقہ نے جو مسایل اس سلسلہ میں بیان کئے ہیں مثلاً خراج، جزیہ، جہاد، دار الحرب، نکاح اور غلامی ان سب کی بنیاد یہی مفہوم ہے۔ لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ شرک یا مشرک کی تعیین و تعریف میں کوئی اختلاف نہیں پایا گیا، غلط ہے، معتزلہ نے شرک کے لئے یہ شرط ضروری قرار دی کہ صفات خداوندی میں کسی کو شریک ٹھہرا کر اسے خدا ہی کی طرح ازلی و ابدی مانا جائے

الموحدین کے یہاں عقیدۂ توحید زیادہ سخت تھا، وہ ان لوگوں کو بھی مشرک قرار دیتے تھے جو قرآن کو غیر مخلوق سمجھتے تھے، کیونکہ اس طرح قرآن بھی خدا کی طرح ازلی و ابدی چیز ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے سوا دوسری مسلم جماعتوں کو بھی مشرک کہتے تھے کیونکہ وہ ان کے عقیدۂ توحید کے نظریہ سے صحیح معنی میں خدا کی وحدانیت کے قایل نہ تھے۔ اسماعیلیہ بھی اپنے آپ کو موحدین کہلانا پسند کرتے تھے، لیکن چونکہ ان کے یہاں امام کی حیثیت بھی دوسرے خدا کی سی تھی اس لئے ان کا یہ دعویٰ چل نہ سکا اور انھیں خود اپنی کمتری کا احساس ہونے لگا۔ وہابیوں کے یہاں شرک کا مفہوم اس قدر وسیع ہو گیا کہ ان کے سوا دُنیا میں کوئی مسلمان باقی نہ رہا۔

ان کے یہاں شرک کی کئی قسمیں ہیں (۱) شرک العلم:۔ یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ علم غیب، خدا کے سوا کسی اور کو بھی حاصل ہو سکتا ہے، انکے نزدیک شرک ہے اور اس نقطۂ نظر سے وہ لوگ جو انبیاء کو حاملِ علم غیب سمجھتے تھے یا علمِ نجوم کی مدد سے پیش گوئیاں کرتے تھے، سب مشرک قرار پائے۔ (۲) شرک التصرف:۔ یعنی یہ اعتقاد کہ خدا کے سوا کوئی اور کسی امر کے وقوع یا عدم وقوع پر اختیار رکھتا ہے، اس لئے انکے نزدیک اولیاء کرام کے کرامات یا شفاعت رُسل کو ماننے والے بھی مشرک ہیں۔ (۳) شرک العبادۃ:۔ خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنا یہاں تک

کہ انبیاء و اولیاء کے مزاروں پر جانا، قبروں کا طواف کرنا دعا، تعویذ، گنڈا، فاتحہ، عُرس وغیرہ سب شرک میں داخل ہے۔ (۴) شرک العادۃ:۔ یعنی فال، استخارہ، شگون، یا اس طرح کے نام رکھنا جس سے خدا کے علاوہ کسی اور کی عبدیت ظاہر ہو جیسے عبدالنبی یا غلام محمد ان کے نزدیک شرک ہے۔ (۵) شرک الآداب:۔ یعنی پیغمبروں، ولیوں یا پیروں کی قسم کھانا۔ یا ان کا نام لے کر ان سے مدد چاہنا اور یا محمدؐ یا علیؓ وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنا یہ سب ان کے نزدیک شرک ہے۔

"اخلاقیین" کا نظریہ اس باب میں زیادہ بلند و لطیف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شعائر مذہب کی پابندی (مثلاً روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ) اس خیال سے کہ اس کی مُزد اسی دنیا میں ملے گی، یا یہ کہ اس سے کوئی خوش ہوگا، شرک ہے۔ ان کے نزدیک ہر عمل کو خالصتاً لوجہ اللہ ہونا چاہئے اور اس میں کوئی شائبہ دنیا کا نہ پایا جانا چاہئے، اس مسئلہ میں ان کے غلو کا یہ عالم ہے کہ جذبۂ انانیت اور تکبر و غرور کو بھی شرک قرار دیتے ہیں، مگر انھوں نے شرک کی شدت و خفت کے ساتھ اس کے مدارج بھی مقرر کر دئے ہیں جن کو وہ اپنی اصطلاح میں شرک اصغر، شرک صغیر اور شرک عظیم کہتے ہیں۔

اب صوفیہ کی مو شگافیاں ملاحظہ فرمائیے۔ ان کے یہاں شرک کی دو قسمیں ہیں، شرک خفی اور شرک جلی۔ ان کے یہاں اصل چیز توجہ الی اللہ ہے اور وہ بھی اس صورت سے کہ درمیان میں کوئی چیز ذریعہ یا واسطہ کی صورت سے بھی حایل نہ ہو۔ یہاں تک کہ اگر نفس یا روح کے متعلق یہ خیال قایم کر لیا گیا کہ بذات خود اس میں کوئی نیکی پائی جا سکتی ہے تو یہ ان کے نزدیک شرک خفی کہلائے گا۔ آپ یہ سُن کر غالباً تعجب کریں گے کہ کسی کا یہ کہنا کہ "میں خدا کو جانتا ہوں" ان کے یہاں شرک ہے، کیونکہ اس طرح وہ گویا نفس علم کے باب میں جو صرف خدا کے لئے مخصوص ہے، اپنے تئیں خدا کا شریک ٹھہراتا ہے۔ اس مسئلہ میں ان کا غلو اس حد تک بڑھ گیا کہ ابن عربی کے ایک شاگرد تلمسانی نے یہاں تک کہدیا کہ "قرآن بھی شرک ہے کیونکہ خالص عقیدۂ توحید میں وہ بھی حایل ہوتا ہے"۔

میرا نظریہ یہاں تک آپ نے قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف کے نقطۂ نظر سے شرک اسلام کا مطالعہ کر لیا اور آپ ان کو پڑھ کر مطمئن ہوئے ہوں یا نہیں، ہمیں اس سے بحث نہیں، لیکن یہ تو بہر حال آپ کو ماننا ہی پڑے گا کہ ان تمام نظریوں کا تعلق اُس زمانہ سے تھا جو ختم ہو گیا اور اب ان کو سامنے رکھکر ہم کسی ایسے صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتے جو موجودہ دور انسانیت کی اُلجھنوں کو دور کرنے اور زندگی کی صحیح راہ متعین کرنے میں ہماری مدد کر سکے۔

اس لئے اب آئیے حالات حاضرہ کو سامنے رکھ کر خالص فلسفیانہ نقطۂ نظر سے غور کریں کہ شرک و اسلام کی حقیقت کیا ہے، توحید و بُت پرستی سے کیا مقصود ہے اور ہمارے موجودہ علماء اسلام کا صحیح موقف اس باب میں کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے بت پرستی کی شدید مخالفت کی، اور جس کے علمبرداروں نے اپنے آپ کو "بُت شکن" کہلانے کے لئے نہ ہمالیہ کی بلندیوں کی پروا کی اور نہ بحر ہند کی گہرائیوں کی۔ وہ مور و ملخ کی تعداد میں فوجیں فراہم کر کے اُٹھے، صرصر و سیل کی طرح نہ رکنے والا عزم لے کر آگے بڑھے اور برق و زلزلہ کے مانند ہر اس بتکدہ کو تباہ و برباد کر گئے جو ان کے سامنے آیا۔ ان کا ہر قدم جو اس غرض سے اُٹھتا تھا "جنت عدن" سے قریب تر کر دینے والا ہوتا اور تیشہ کی ہر وہ ضرب جو کسی بُت پر پڑتی تھی گویا قصر فردوس کی تعمیر کی مترادف تھی۔ وہ مذہب جس کی بنیاد ہی "لات و ہبل" کی مسماری پر قایم ہوئی ہو، اس کے متبعین میں یہی جوش و خروش ہونا چاہئے تھا۔ لیکن صبح صادق کی نورانی صباحت میں جب مندر کے کسی گھنٹہ کی

کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے تو میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ ایک "بت" کا تعلق انسان کے کن جذبات سے وابستہ ہے کہ ایک طرف گرز گراں اٹھتا ہوا نظر آتا ہے اور دوسری طرف

"جنبد کلید بتکدہ در دست برہمن"

یوں تو دنیا کا ہر پتھر جس کو ہم ٹھوکر لگاتے ہوئے گزر جاتے ہیں، بُت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے اندر ایک "ناتراشیدہ معبود" چھپائے ہوئے ہے، لیکن نہ بُت پرست اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے اور نہ "بُت شکن" اس پر اپنا تیشہ صرف کرتا ہے۔ کیوں؟ - آیئے آج کی صحبت میں اس پر غور کریں، شاید تسبیح و زنار کی گتھیوں کو اس طرح سلجھا سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق "مادہ" سے ہوئی ہے اور مادہ قدیم ہے ہمیں اس دعوے کے صدق و کذب پر اس وقت بحث کرنا مقصود نہیں، لیکن ہمارا تجربہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ "محض مادہ" کوئی قیمت نہیں رکھتا، اصل چیز جو اس کو باوقعت بناتی ہے وہ انسان کی ذہانت ہے جو اس پر صرف ہوتی ہے۔ مٹی کوئی قیمت نہیں رکھتی، لیکن جس وقت اس سے کوئی برتن بنا لیا جاتا ہے تو اس کی قیمت متعین ہو جاتی ہے، لوہا اپنے معدن کے اندر بیکار ہے، لیکن جب انسان اسے باہر نکال کر دوسری شکلوں میں تبدیل کر لیتا ہے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے، سونا یوں کسی کام کی چیز نہیں لیکن چونکہ ذہن انسانی نے اس کو ایک معیاری قدر و قیمت کی چیز سمجھ لیا ہے اس لئے وہ گراں ہے، الغرض مادہ بذات خود کوئی چیز نہیں اور اگر انسان کی ذہانت خواہ وہ خالص علمی پہلو رکھتی ہو یا جذباتی، اس سے متعلق نہ ہو تو وہ بالکل بیکار شے ہے۔

اب اس نظریہ کو سامنے رکھ کر "بُت" کی حقیقت پر غور کیجئے کہ وہ کیا ہے؟ - "بُت" فی الاصل ایک پتھر کا ٹکڑا تھا، جب تک اسکو انسانی ذہانت نے ایک مخصوص شکل میں تبدیل نہ کیا تھا، وہ ایک حقیر پارۂ سنگ تھا، جس وقت تک انسان نے اپنے جذبات کو اس میں متشکل نہ کیا تھا، لیکن ایک "بُت تراش" کی چھینی اور ایک برہمن کے جذبۂ عقیدت سے مس ہوتے ہی وہ اس قدر مقدس ہو گیا کہ پیشانیاں اس کے سامنے جھکنے لگیں۔ اس لئے اگر "بُت شکنی" کا ہدف صرف وہ "پیکر سنگین" قرار پائے جو مندروں میں رکھا ہوا نظر آتا ہے تو اس سے زیادہ کوتاہ نظری اور کوئی نہیں ہو سکتی، کیونکہ پتھر کا بُت بنا دینے والی حقیر و ذلیل پارۂ سنگ کو "معبود" کی حیثیت دینے والی ذہنیت اس سے بدل نہیں سکتی اور وہ ہزار بُت شکنیوں کے بعد بھی بدستور قایم رہ سکتی ہے، ہاں اگر کسی مخصوص و متعین "بت" کو توڑنے کے بعد کوئی دوسرا بُت اس کی جگہ نہ لے سکے تو بے شک "بُت شکنی" مفید ثابت ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ بت پرستی کا تعلق صرف انسان کی ذہنیت سے ہے اس لئے جب تک اس بتکدے کو نہ توڑا جائے جو انسان کے قلب و دماغ میں چھپا ہوا ہے یہ مادی بربادیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام دُنیا کا تنہا وہ مذہب ہے جس نے بُت شکنی میں خاص شہرت حاصل کی، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصود "لات و ہبل" کی صرف مورتیوں کو مسمار کر کے خاموش ہو جانا نہیں تھا بلکہ اس ذہنیت کو منہدم کرنا تھا جو انسان کے اندر غلامانہ تذلل پیدا کرتی ہے اور اسی لئے جب کسی بُت کو توڑا تو اس کا فلسفہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیا کہ پرستش کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ اس مادی عالم سے جدا ایک چیز ہے جو خود انسان کے اندر ہی موجود ہے اور جس کا اصطلاحی نام "خدا" ہے، انسان جسم ظاہری کے لحاظ سے یقیناً فانی ہے لیکن اپنی معنویت کے لحاظ سے قطعاً غیر فانی ہے، انفرادی حیثیت سے وہ چاہے کتنا ہی بے بود ہو لیکن کلی و اجتماعی حیثیت سے وہ لازوال مقصودِ آفرینش ہے اور یہی وہ حقیقت تھی جو بعض زبانوں سے "انا الحق" کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

بہر حال "بت پرستی" اگر انسان سے اس جذبۂ بلند کو محو کر دینے والی ہے تو یقیناً نہایت مضرت رساں چیز ہے اور اس کو یقیناً مٹ جانا چاہئے، لیکن سوال یہی ہے کہ کیا اس وقت بھی نزاع کفر و دین کو جاری رہنا چاہئے اور ایک کے جذبۂ بُت شکنی کو دوسرے کے جذبۂ

بُت پرستی سے متصادم ہونا چاہئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ وہ ہے جب تمام دُنیا سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے اور عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہ عقول انسانی کا ساتھ دینے کے لئے طیار نہیں، میں کہتا ہوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب مذہب کا وہ ارتقائی مفہوم ہمارے سامنے آتا ہے جس پر تمام نوعِ انسانی متفق ہو سکتی ہے اور یہی وہ دورِ عقل و فراست ہے جس نے حقیقی مذہب کے چہرہ کو بے نقاب کر کے اس کے دلکش خط و خال نمایاں کر دئے ہیں۔

مذہب ضرورت انسانی کی پیداوار تھی اور ہماری ضرورتوں کے ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی چلنا چاہئے، اول اول جب انسان کی "اجتماعی حیثیت" محدود طبقوں اور مخصوص قوموں کے لحاظ سے بہت تنگ تھی تو مذہب کا نقطۂ نظر بھی تنگ تھا اور ہونا چاہئے تھا، لیکن اب کہ نظام تمدن نے وسیع ہو کر شرق و غرب کے امتیاز کو مٹا دیا ہے اور انسان صحیح معنی میں "خلیفۃ اللہ فی الارض" بن کر سارے کرۂ ارض پر چھا گیا ہے، مذہب کو بھی وسیع ہونا چاہئے، اس کے مقصود کو بھی بدلنا چاہئے اور اس کے اصول میں بھی وسعت پیدا ہونا چاہئے تاکہ امتیازِ نسل و رنگ اور اختلاف مسجد و کلیسہ سے بلند ہو کر تمام نوعِ انسانی کو ایک ہی مرکز پر لایا جا سکے۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مذہب کو صرف مابعد الطبیعیات تک محدود رکھا جائے، جزا و سزا کا معیار بہشت و دوزخ یا حور و قصور کی سطح سے بہت بلند ہو گیا ہے اور اب خدا کا نام کسی ایسی قہار و جبار ہستی کا نہیں رہا جو کسی خود مختار فرمانروا کی طرح دُنیا میں صرف غلامی کو رواج دینا چاہتا ہے، مذہب کا دور استبداد ختم ہو گیا اور اگر وہ اپنے آپ کو قایم رکھنا چاہتا ہے تو اس کو بھی زمانہ کا ساتھ دینا پڑے گا جو اس وقت صرف عالمگیر سکون و آزادی چاہتا ہے۔

وہ دور جب انسان نے خدا کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے تھے گزر گیا ہے، آج جو خدا عیسائیوں کا ہے وہی ہندوؤں کا ہے وہی مسلمانوں کا ہے جس طرح وہ مسجد کی اذانوں میں چھپا ہوا ہے اسی طرح وہ ناقوس میں پوشیدہ ہے، اس کا سورج سب پر یکساں چمکتا ہے اس کے الطاف سب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، اس کی محبت ہر ہر فرد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے، اس کے حُسن نے کائنات کی ہر ہر چیز کو مسحور کر رکھا ہے۔ وہ کائنات کی نبض میں گرم خون کی طرح دوڑ رہا ہے، کائنات کے سینہ میں قلب بنا ہوا دھڑک رہا ہے وہ گویا ایک "مرکز المراکز" ہے جہاں پہونچ کر ماضی، حال و مستقبل سب ایک ہو جاتے ہیں۔

آج کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کا مفہوم کوئی علٰحدہ قرار دے، اس کا کوئی جداگانہ تصور پیدا کر کے اپنے لئے مخصوص کر لے۔ مذاہب قدیمہ نے عرصہ تک خدا کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، لیکن اب وہ اس شکنجہ سے آزاد ہو گیا ہے اور اپنا معبد اس نے عقل انسانی کی اس غیر محدود فضا میں تعمیر کیا ہے جہاں وحوش و طیور، انس و جن، سیاہ و سفید، جاہل و عالم، شاہ و گدا سب ایک سطح پر نظر آتے ہیں اور نوعِ انسانی اپنی تفریق کو محو کر چکی ہے۔

آج کوئی قوم ایسی نہیں جو برگزیدگی کو صرف اپنے لئے مخصوص کر سکے، کوئی جماعت اس کی مستحق نہیں کہ وہ سوا اپنے باقی سب کو گمراہ قرار دے۔ اگر انسان کی قسمت میں نجات لکھی ہے تو وہ اسی دنیا میں حاصل ہوگی اور نوعِ انسانی کا ہر ہر فرد اس میں برابر کا شریک ہوگا ممکن نہیں کہ ایک انعام خداوندی کا مستحق قرار دیا جائے اور دوسرا آلام و مصائب کا شکار بنا رہے، اگر معصیت کی بنا پر انسان کو دوزخ میں جانا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ میں جاؤں اور آپ بچ جائیں، اب تو یہاں دوزخ ہی رہے گی یا فردوس — اور بلا تفریق سب کو اسی ایک سے واسطہ پڑنا ہے۔

یہ دور ہے اشتراکیت کا، اجتماعیت کا جب ہر چیز ایک کلی و عمومی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے اور خدا کی کائناتی حیثیت حیات

انسانی کے ہر ہر پہلو کو "کائناتی" بنا دینا چاہتی ہے۔ ہمارا خدا، ہمارا معبد، ہمارا مذہب، ہماری عبادت، ہماری روحانیت سب کچھ "کائناتی" رنگ اختیار کرنا ہے اور یہی وہ حقیقی مقصود آفرینش تھا جس کی تکمیل کا زمانہ اب آیا ہے۔

خدا اب مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں کے اندر مقید نہیں رہنا چاہتا، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ فطرت کی وسعت میں اسے تلاش کیا جائے اور دل کے اندر اس کا استھان بنایا جائے، وہ اب انسان کے بنائے ہوئے معبدوں میں رہنا پسند نہیں کرتا، بلکہ اس معبد میں جو خود اسی کا بنایا ہوا ہے، جہاں بلا تفریق و امتیاز سب کے سر جھک جاتے ہیں اور وہ معبد انسان کا قلب و دماغ ہے۔

مسجد و کلیسا کی تفریق کا وقت گزر گیا، زنار و تسبیح کے امتیاز کا زمانہ ختم ہو گیا، جن کو ہم بت سمجھ کر پوجتے تھے وہ خود سرنگوں ہوتے جا رہے ہیں، جس کی پرستش ہم خدا سمجھ کر کرتے تھے وہ خود ہم سے بیزار ہے، اس لئے ہم کو بت پرستوں کی جستجو اجودھیا اور کاشی سے باہر کسی اور جگہ کرنا چاہئے اور پرستاران خدا کی تلاش حطیم کعبہ سے باہر کہیں اور۔

دنیا میں بت پرستی اب بھی قایم ہے، لیکن مورتیوں کی صورت میں نہیں، بت شکنی اب بھی ضروری ہے لیکن تیشۂ آہنی سے نہیں، آپ کو معلوم ہے کہ یہ بت کہاں اور کن کن شکلوں میں پائے جاتے ہیں، یہ بت ہر جگہ موجود ہیں اور مختلف شکلوں میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

یہ تم کو خانقاہوں میں زرکار مسندوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے، تعلیمی اداروں میں قرآن و احادیث کا درس دیتے ہوئے نظر آئیں گے سیاسی جلسوں میں صدارتی تقریریں کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

ان کی صورتیں نورانی ہوں گی، لیکن دل سیاہ، ان کی زبانوں پر خدا رسول کا نام ہو گا لیکن صرف نمود و نمایش کے لئے، ان کی تقریروں سے ملک و قوم کی محبت ٹپکتی ہو گی لیکن ان کا مقصود صرف اپنی ذات ہو گی۔ ان کی پیشانیوں پر سجدہ کا نشان، ان کی دامندار طویل قبائیں، ان کی عریض و طویل داڑھیاں، ان کی ہر وقت گردش کرنے والی سمرنیں۔ ان کی وہ خصوصیات ہیں جن سے تم ان بتوں کو ہمیشہ آسانی سے پہچان سکتے ہو، یہ خود کبھی سلام میں تقدیم نہیں کریں گے، کوئی دوسرا اسلام کرے گا تو جواب میں کبھی سر نہ جھکائیں گے، جب یہ کسی طرف سے گزریں گے تو ان کی ذریات کا ایک ہجوم ان کے ساتھ ہو گا اور جب خانقاہوں کے اندر شہ نشینوں پر ان کو بیٹھا دیکھو گے تو یہ معلوم ہو گا کہ "خداوند تعالیٰ" اپنے بندوں کو دیدار سے مشرف کر رہا ہے۔

جس وقت یہ قرآن کا درس دے رہے ہوں گے تو سوا نحوی و صرفی نکات کے کوئی اور موضوع ان کے سامنے نہ ہو گا جب حدیث پڑھا رہے ہوں گے تو اسماء رجال کی تحقیق ان کا انتہائی کارنامہ ہو گا، جب یہ منبر پر وعظ فرما رہے ہوں گے تو سوا خدا کے قہر و غضب اور جہنم کے ہولناک مناظر کے وہ کچھ نہ بیان کریں گے، سیرۃ اکابر پر اظہار خیال فرمائیں گے تو سوا ان باتوں کے جو حماقتوں سے پُر ہیں کوئی لفظ ان کے منہ سے نہ نکلے گا۔ فرشتوں کی باتیں، جنات کے افسانے، معجزہ و کرامات کے واقعات اور اسی طرح کے دیگر مزخرفات ان کے مواعظہ کی جان ہیں، اخلاق کا درس بھولے سے اگر کبھی دیں گے بھی، تو بہشت کی طمع، جہنم کے خوف سے کبھی خالی نہ ہو گا اور ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئے گی کہ نیکی کرنا ہر انسان کا فطری فرض ہے اور اسے خیال مزد و تعزیر سے بلند ہونا چاہئے۔

الغرض یہ ہیں وہ بت جن کو اس وقت توڑنے کی ضرورت ہے، اور یہ ہیں آج کل کے وہ "لات و ہبل" جن کو مسمار کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔

ہم کعبہ وہم بتکدہ سنگِ رہِ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

تعلیمات اسلامی کا صحیح مفہوم

اور

ہمارے علمائے کرام

عہدِ حاضر میں علوم ریاضیہ کی ترقی نے ذہن انسانی میں عجیب قسم کی جستجو پیدا کر دی ہے، وہ چاہتا ہے کہ ہر چیز کی ناپ تول کرسکے، اس کے عرض و طول، بلندی و عمق کا اندازہ کرسکے اور جب اس سے سوال ہو کہ فلاں امر کی حقیقت کیا ہے تو وہ بتاسکے کہ اس کے حدود یہ ہیں، اس کے ابعادِ ثلثہ کی پیمایش یہ ہے اور اعداد و شمار کے لحاظ سے اس کو یوں بیان کرسکتے ہیں۔ پھر یہ ذوق انھیں چیزوں تک محدود نہیں جو مادی ہیں، مرئی ہیں، جامد ہیں، بلکہ کیفیات و وجدانیات کی تحقیق بھی انھیں خطوط پر کی جاتی ہے اور بالکل ریل کی رفتار کی طرح اخلاق انسانی اور تخیلِ دماغی کا بھی مقیاس متعین کیا جاتا ہے —— لیکن سوال یہ ہے کہ حیات انسانی کا مقیاس کیا ہے اور عام طور پر جو نظریہ اس کی پیمایش کا قایم کیا جاتا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔

ایک شخص کی زندگی پر جب گفتگو کی جاتی ہے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ اتنی مدت تک زندہ رہا، اتنے سال اور اتنے مہینے جیا، جوان مرگیا، بوڑھا ہو کر مرا، لیکن کیا یہ معیار درست ہے —— غالباً نہیں —— کیونکہ یہ معیار انسان کی زندگی کا نہیں بلکہ اس کے جسم کی زندگی کا ہے۔

سکندر صرف ۳۶ سال تک اس دُنیا میں زندہ رہا، حالانکہ وہ ۳۰۰ سال قبل مسیح سے اس وقت تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مسیح صرف ۳۳ سال زندہ رہے لیکن اپنی زندگی کے اخیر تین سال میں وہ اس طرح جیے کہ اپنے آپ کو خلعت دوام بخش گئے۔ اسی طرح دُنیا کے اور بڑے بڑے مفکرین اور تاریخ کے بڑے بڑے لوگوں کو لیجئے کہ وہ آج موجود نہیں ہیں، لیکن اُن کے آثار ہنوز باقی ہیں اور روزانہ ہزاروں لاکھوں زبان پران کا نام آجاتا ہے۔

ممکن ہے بعض کا خیال ہو کہ حیات انسانی کا معیار عیش و لذت، جاہ و ثروت ہے، یعنی زندگی نام ہے لطف و نشاط کے ساتھ عمر بسر کردینے کا جاہ و ثروت کے حصول کا۔ لیکن محض ذاتی لذت اور زر و دولت کا انبار اپنے بعد کوئی تاثرات چھوڑ جانے والا نہیں اور اس لئے اجتماع بشری کی تاریخ ایسے لوگوں کی زندگی سے اعتنا نہیں کرتی —— پھر اگر صحیح معنی میں حیات انسانی کا کوئی معیار و مقیاس ہوسکتا ہے، تو وہ مقیاس اجتماعی ہے یعنی یہ کہ ایک شخص نے قوم کی کیا خدمت انجام دی، ملک و ملت کی اصلاح و فلاح کے لئے کیا کیا قربانیاں کیں اور دوسروں کو اپنے ذہنی یا مادی اکتسابات سے کیا فایدہ پہونچایا۔

دُنیا کے جدید اجتماعی نظریۂ زر و دولت کے مسئلہ کو صرف اسی حد تک اہمیت دیتے ہیں کہ وہ نوعِ انسانی کو فایدہ پہونچانے والے ہیں دولت کا انبار بجائے خود مہمل چیز ہے اگر اس کی استباری قوتِ کار برآری کو نظر انداز کر دیا جائے اور یہیں سے اختلاف کی دو راہیں پیدا ہوتی ہیں جن میں سے ایک کا نام سرمایہ داری اور دوسری کا مطالبۂ محنت و عمل ہے۔ پھر جس رفتار کے ساتھ یہ احساس قوی ہوتا جا رہا ہے اس کو دیکھ کر یہ حکم لگانا دشوار نہیں کہ وہ وقت قریب ہے جب ایک تاجر کی تجارت، ایک سائنس داں کی ایجادات، ایک صناع کی صنعتگری سب کا مدعا صرف مفادِ جمہور کے لحاظ سے متعین کیا جائے گا اور اکتساب زر یا فراہمی دولت کا کوئی سوال دنیا میں باقی نہ رہے گا۔ پھر آئیے اس سلسلہ میں غور کریں کہ مذہب اس امر میں کسی حد تک نوعِ انسانی کا ساتھ دینے والا ہے؟

جس حد تک مقصود یا غایۃ کا تعلق ہے ہم کو ماننا پڑے گا کہ مذہب کی تعلیمات یکسر مفادِ جمہور پر مبنی ہیں اور تمدنی نقطۂ نظر سے وہ امن و سکون ہی کا خواہشمند ہے، لیکن تاریخ مذہب بالکل اس کے برعکس ہم کو یہ بتاتی ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ بدامنی و خونریزی مذہب ہی کی بدولت ہوئی، اس لئے ظاہر ہے کہ ہم کو اُصولِ مذہب کی جستجو تاریخ سے ہٹ کر صرف اس کی تعلیمات میں کرنی چاہئے اور اگر ایک بار یہ بات اصولاً متعین ہو جائے کہ دنیا کا امن و سکون یا نوعِ بشری کی فلاح صرف مذہب ہی کے ذریعہ سے ممکن ہے اور یہ کہ مذہب سے زیادہ اس کا کوئی حامی نہیں، تو پھر اس کا فیصلہ چنداں دشوار نہیں کہ مذہب اپنے عمل یا تعلیمات زندگی کے لحاظ سے کسی ایک جگہ ٹھہر جانے والی چیز ہے یا ترقی تمدن کی سطح کے ساتھ اُبھرنے یا بلند ہو جانے والی۔

اس باب میں سب سے بڑی غلطی علمبردارانِ مذہب نے یہ کی ہے کہ انھوں نے عقیدہ، عمل اور مقصود کے باہمی ربط و تناسب کو بالکل پس پشت ڈال دیا اور بجائے اس کے کہ مقصود کی اہمیت کو سامنے رکھ کر عمل یا عقیدہ کو اس کا تابع یا ذریعہ قرار دیتے، صرف عقیدہ کو اصل چیز سمجھ لیا اور مقصود کو اس کی تابعیت میں دے کر مذہب کی اہمیت کو نیست و نابود کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ اگر مذہب سے اس کے مروجہ عقاید کو الگ کر دیں تو اس کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا اور وہ کوئی مرکز ایسا نہ پیدا کر سکے گا جس پر کسی جماعت کے افراد کا اجتماع ہو سکے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ "عقاید" ہی اصل چیز ہیں کس قدر کم فہمی کی بات ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ مذہب کے عقیدہ کا اصل الاصول ایک خدائے قادر مطلق کے وجود کو تسلیم کرنا ہے، لیکن صرف ذہن سے ایسا سمجھ لینا یا زبان سے اس کا اقرار کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا اگر اس عقیدہ کے تحت ہم اپنے اعمال و افعال میں کوئی تغیر پیدا کریں، اور یہ اعمال و افعال بھی بیکار ہیں اگر اُن سے ہمارے نظامِ تمدن یا ہماری اجتماعی زندگی کو کوئی فایدہ نہ پہونچے۔ یہی حال صوم و صلوٰۃ کا ہے کہ محض قیام و قعود یا صبح سے شام تک بے آب و نان بسر کر دینا فی نفسہ لایعنی حرکت ہے اگر اس سے کوئی اخلاقی نتیجہ نہ برآمد ہو، اور اخلاق کا تعلق چونکہ صرف انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے، اس لئے اعمالِ مذہب، اوراد و وظائف، دُعا و توبہ کے رد و قبول کا معیار صرف یہ ہونا چاہئے کہ سب سے زیادہ پابند صوم و صلوٰۃ نے سب سے زیادہ خدمتِ خلق کی انجام دی ہے یا نہیں اور وہ شخص جس نے تین لاکھ مرتبہ سورۂ مزمل پڑھ کر اس کی زکوٰۃ ادا کی ہے، اس نے سوسائٹی کے لئے کس قدر ایثار سے کام لیا۔ دُنیا کے تمام مذاہب کا مقصود عبادت و نمایش سے یہ رہا ہو یا کچھ اور، مجھے اس سے بحث نہیں، لیکن اسلام کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اُس کا نصب العین صرف یہی تھا اور اس نے عبادت کو محض عبادت کے لحاظ سے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اس نے نماز کی تعلیم دی صرف اس لئے کہ باہمی اتحاد و تعاون پیدا ہو، اس نے روزہ فرض کیا محض اس غرض سے کہ ہم میں ابنارِ جنس کے اقتصادی مشکلات کا احساس پیدا ہو، اس نے حج کی ہدایت کی صرف اس مقصود کے تحت کہ اسلام کو بین الاقوامی چیز بنایا جائے، اس نے ادائے زکوٰۃ کو لازم قرار دیا فقط اس مدعا کے ساتھ کہ قوم کا ایک مرکزی بیت المال قایم

رہے، لیکن افسوس ہے کہ عہد رسالت قوم کے اس عظیم الشان پروگرام کو پورا کرنے کے لئے بہت مختصر ثابت ہوا اور عہد خلفاء میں بھی بعض سیاسی اختلافات کی وجہ سے اس کی بنیاد مضبوط نہ ہو سکی - یہاں تک کہ آخر کار بنو امیہ کا دور ملوکیت شروع ہو گیا اور اسلام کی روح اجتماعیت وانسان پرستی، ہوس ملک گیری اور تکمیل استبداد و سرمایہ داری میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

اسلام نے زعامت دینی و دنیوی کی تفریق اسی لئے گوارا نہیں کی کہ ملوکانہ استعمار و استدراک کی خواہش لوگوں میں پیدا نہ ہو اور ایک قاید و رہنما، یا سلطان و فرمانروا کی خصوصیت یہ نہ قرار پائے کہ وہ ملک کا سب سے بڑا سرمایہ دار ہے بلکہ اس کے لئے وجہ امتیازیہ ہو کہ وہ ملک و قوم کا سب سے زیادہ جفاکش خادم ہے اور تقسیم دولت میں وہ اسی سطح پر نظر آتا ہے جہاں دوسرے افراد قوم پائے جاتے ہیں۔ پھر تاریخ شاہد ہے کہ اس لحاظ سے رسول اللہ کی زندگی کیا تھی اور آپ کے بعد خلفاء راشدین نے کس حد تک اس اصول کی پابندی کی۔ لیکن جب عہد امیر معاویہ شروع ہوا تو حکومت ختم ہو کر حکومتِ عرب قایم ہوئی اور اسلام کی ظاہری پابندی صرف اس لئے قایم رکھی گئی کہ مصلحت کا اقتضا یہی تھا[1] - الغرض اسلام کی صحیح تعلیم سے روشناس ہوئے دنیا کو مشکل سے ایک ربع صدی کا زمانہ گزرا ہوگا کہ واقعات وحالات نے اسے محو کرنا شروع کیا اور زعامت دنیوی کے ساتھ ساتھ زعامت دینی سلاطین اسلام کی اتنی ضعیف ہو گئی کہ آخر کار پبلک پر اثر قایم رکھنے کے لئے ایک جماعت علماء مذہب کی علحٰدہ قایم کی گئی جو حکومت کا ساتھ دینے والی ہو اور جس کی وساطت سے دنیاوی حکومت کو مضبوط بنایا جائے چنانچہ تاریخ کے صفحات ایسے واقعات سے لبریز ہیں کہ علماء مذہب نے سلاطین و امراء کے اغراض پورا کرنے کے لئے حدیثیں وضع کیں، واقعات تاریخ کو مسخ کیا اور شریعت میں بہت سی ایسی تبدیلیاں کیں جو فرمانروائے وقت کے اغراض و مقاصد کے لئے ضروری تھیں ---- ہر چند علماء سلف میں بعض ایسے نفوس بھی تھے جنھوں نے اپنے ضمیر کے خلاف کہنا کبھی گوارا نہیں کیا (مثلاً جناب ابو حنیفہ کہ انھوں نے امویین و عباسئین دونوں کے کوڑے کھانا محض اس لئے گوارا کئے کہ وہ خلافت کا مستحق صرف علویین کو قرار دیتے تھے) لیکن عنصر غالب انھیں علماء کا تھا جن کا علم دین حاکم وقت کی خواہشوں کے مطابق ہر رنگ میں ڈھل جاتا تھا اور جس کے احکام و فتاوی کو شاہانِ وقت بہ جبر ملک میں رائج کرتے تھے، چنانچہ فقہ حنفی کا ابو یوسف کے فتاوی کے مطابق مدوّن ہونا اور ان کے استاد ابو حنیفہ کے اقوال پر عمل درآمد نہ ہونا اس کا واضح ثبوت ہے۔

الغرض جب فرمانروائے وقت کی دینی کمزوریوں کے اثرات کو دور کرنے کے لئے علماء مذہب کی خدمات حاصل کی گئیں تو اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ اسلام کی وہ روح فنا ہو جائے جو شاہ و گدا کے امتیاز کو مٹانے والی تھی، جو بنی نوع انسان میں حریت و مساوات کا ذوق پیدا کرنا چاہتی تھی اور جو سرمایہ داری کی اسی لئے مخالف تھی کہ اس سے افرادِ قوم میں بالکل غلط اصول پر تفریق مدارج قایم ہوتی ہے اس کے بعد جب رفتہ رفتہ حکومت دنیوی ضعیف ہونے لگی اور اسی کے ساتھ علماء مذہب کا وہ جاہ و جلال بھی مٹنے لگا جو حمایت حکومت کی وجہ سے انھیں حاصل ہوا تھا، تو انھیں فکر لاحق ہوئی کہ اس سیادت کو کیونکر قایم رکھا جائے اور اس طرح اسلام میں سب سے پہلے "ادارۂ کہانت" کی بنیاد پڑی - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام رفتہ رفتہ مذہب کے حقیقی مفہوم سے بیگانہ ہو گئے اور دین اسلام نام رہ گیا صرف اُن باتوں کا جو ہمارے علماء بتائیں اور مذہبی لٹریچر کو شجر ممنوع قرار دے کر عوام کو اس کے مطالعہ سے روکا گیا، تاکہ وہ ہمیشہ علماء دین کے محتاج رہیں اور خود

---

[1] امیر معاویہ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اہلِ مدینہ سے جن الفاظ میں خطاب کیا تھا ان سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام سے امیر معاویہ کو کتنی محبت تھی وہ الفاظ ملاحظہ ہوں:- "ولقد رضت لکم نفسی علیٰ عمل ابی قحافتہ (ابی بکر) وارد تہا علیٰ عمل عمر - فنفرت من ذٰلک نفاراً شدیداً وارد ت علیٰ ثنیات عثمان فابت علی - فسلکت بہا طریقالی ولکم فیہہ منفعتہ، مواکلتہ حسنتہ و مشاربتہ جمیلتہ فان لم تجدونی خیرکم فانی خیرلکم ولایتہ"۔

اُن میں غور و فکر کی صلاحیت کبھی نہ پیدا ہو۔

اس وقت جو حالت ہمارے علماء کرام کی ہے وہ اسی کاہنانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے نہ صرف بہ لحاظ نفسیات بلکہ ظاہری وضع و صورت کے اعتبار سے بھی اُنھوں نے اپنے آپ کو قوم کے دوسرے افراد سے جدا کر لیا ہے اور اس طرح اپنے و عوام کے درمیان "بینہما برزخ لا یبغیان" کی ایسی زبردست حد فاصل کھینچ رکھی ہے کہ اس کے دور ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

اس میں شک نہیں کہ ہر قوم اور ہر جماعت کے لئے ایک قاید و رہنما کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور عوام کی ذہنیت کو گمراہی سے بچانے کے لئے کسی نہ کسی ایسے دماغ کا پایا جانا لازم ہے جو ان پر خاص اقتدار رکھتا ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بالکل درست ہے کہ ایک پابند مذہب جماعت کے لئے یہ خدمت بہترین طور پر وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو مذہبی اقتدار رکھتا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مذہبی سیادت کا کیا مفہوم ہے اور علماء اسلام اس سے کیا کام لے رہے ہیں۔

یوں تو مذہب بظاہر نام ہے صرف چند مخصوص عقاید کا، لیکن مخصوص بالذات محض عقاید نہیں ہیں بلکہ اُن کی وساطت سے ایک غرض مشترک ایک مرکز اجتماع پیدا کرنا ہے اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر جب ہم اپنے علماء کرام کے اعمال و افعال کا جایزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہوتی ہے کہ انھوں نے اسلام کے مفہوم کو واقعتاً سمجھا بھی ہے یا نہیں۔

ہمارے علماء کرام سب سے زیادہ زور ادائے صوم و صلوٰۃ پر دیتے ہیں لیکن ان کی یہ تعلیم کس قدر بے روح ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرون اولیٰ میں جب مسلمانوں کی ترقی سیلاب کی طرح بڑھ رہی تھی، بالکل یہی نماز تھی اور یہی قیام و قعود، یہی روزہ تھا اور یہی اسحار و افطار، پھر اب کیا ہوا جو ہماری ہر طاعت بے نتیجہ نظر آتی ہے، اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ پہلے نمازیں پڑھی جاتی تھیں اصلاح نفس و اعمال کے لئے، احیاء قومیت کے لئے، احساس اجتماعیت کے لئے اور اب طاعت و عبادت بے روح ہے، بے مقصود ہے، کوئی منزل سامنے نہیں، کوئی ہدف پیش نظر نہیں، پہلے مسلمان نماز پڑھتا تھا تو دنیا ہی میں طرح فردوس ڈالتا تھا، اپنے لئے یہیں حور و قصور پیدا کر لیتا تھا اور اب وہ سب کچھ "وعدۂ فردا" کی امید پہ کرتا ہے اور اسلام کو اس دُنیا سے بالکل علحدہ کر کے اُس آخرت سے متعلق سمجھتا ہے جہاں نہ سوال جد و جہد کا ہے نہ سعی و عمل کا اور یہ وہ ذہنیت ہے جو اسلام کے غلط مفہوم کی تبلیغ سے پیدا ہوئی ہے۔

بعض حضرات انسانی ترقی کو دنیاوی ترقی سے بالکل علحدہ سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اسلام کا مدعا کسی سلطنت کا قیام یا حکومت کی بنیاد ڈالنا نہ تھا، لیکن ایسا کہنا نہ صرف واقعات کی تکذیب ہے بلکہ اسلامی تعلیم کی بھی مخالفت کرنا ہے، رسول اللہؐ اور خلفاء کا جنگ کر کے لوگوں کو مسلمان بنانا، مال غنیمت کو مجاہدین میں تقسیم کرنا، مفتوحہ ممالک کی آمدنی سے بیت المال قایم کرنا، اسی لئے تھا کہ عربوں یا مسلمانوں کی حکومت دنیا میں قایم ہو اور غالباً یہ کوئی گناہ نہ تھا کیونکہ ایک قوم کے استعلاء کا کوئی مفہوم متعین ہو ہی نہیں سکتا جب تک اُس کا کوئی خاص اقتدار قایم نہ ہو اور یہ اقتدار یقیناً اسی دُنیا سے متعلق ہونا چاہئے، ورنہ مرنے کے بعد جب نہ سوال مسابقت کا ہوگا نہ سعی و نتیجہ کا، اگر محض استعلاء روحانی ہو ابھی تو بیکار ہے اور اس کی تعلیم و تلقین اس عالم میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ دنیا کے بعض مذاہب نے صرف روحانی پاکیزگی ہی کو اپنا اصل مقصد قرار دیا تھا اور اس دُنیا میں تکلیفیں اُٹھا اُٹھا کر ختم ہو جانے کو حیاتِ ابدی بتایا، لیکن اسلام کی تعلیم یہ نہ تھی، اس نے اپنا مذہبی آئین اسی دنیا سے متعلق رکھا اور تمام وہ تدابیر بتائیں جو ایک قوم کی زندگی کو من حیث القوم کامیاب بنا سکتی ہیں، اس نے اگر اخوت و ہمدردی کی تعلیم دی تو دوسری طرف دشمنوں سے جنگ کرنے کا بھی حکم دیا اور اگر اس نے یہ بتایا کہ نجات روحانی کا ذریعہ اخلاق کی پاکیزگی ہے تو اسی کے ساتھ یہ راز بھی ظاہر کر دیا کہ:-

"جس نے اس دُنیا میں اندھوں کی طرح زندگی بسر کی وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا"

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے علماء کرام نے تعلیمات اسلامی میں سے صرف روزہ، نماز کو تو لے لیا، لیکن اس جوش عمل اور اس ولولۂ ترقی
نظر انداز کر دیا جس کے پیدا کرنے کے لئے طاعت و عبادت کی پابندیاں عاید کی گئی تھیں، انھوں نے دوزخ کے اژدھے اور جنت کی حوریں
یاد رکھیں، لیکن اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ جہنّم میں جو چیز اژدھا بن کر ڈسنے والی ہے وہ اسی نکبت و ذلت کی دوسری صورت ہے جو اس د
میں کسی قوم پر مستولی ہو جاتی ہے اور جس لذت کو حور کہا جاتا ہے وہ اُسی استعلاء و ترقی کا نام ہے جس کی بدولت ایک جماعت اسی دنیا کو جنّ
بنا لیتی ہے۔

آج ہمارے علماء کرام ہم سے نمازیں تو پڑھوا لیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ کس نعمت کے شکریہ میں ان متواتر سجدوں کا خراج ہم سے وصو
کیا جاتا ہے۔ روزے تو ہم پر ہر سال مسلط کر دیتے ہیں مگر اس کی کوئی تدبیر نہیں بتاتے کہ شکم سیر ہو کر کھانے کے ذرائع مسلمان کو کیونکر حاصل ہو سک
ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مذہبی رہنماؤں نے اسلام کے فلسفہ کو سمجھا ہی نہیں اور غالباً وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ اسلام کا مفہوم یکسر سعی و
عمل ہے اور اصل عبادت وہی ہے جو ہر وقت ہمارے دماغ و جوارح کو متحرک رکھ کر ہم کو اپنی زندگی کا ثبوت دینے پر مجبور کرتی رہے۔

اسلام نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ "نیکی کر اور دریا میں ڈال"۔ اس نے زمین کی طنابیں کھینچ کر دُنیا پر چھا جانے کا درس درس دیا، اس نے
اچھے کام کرنے ہی نہیں ان سے فایدہ اٹھانے کی ترکیبیں بتائیں اور یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ آخرت کی کھیتی اسی دُنیا میں بوئی جاتی ہے اور فردوس
کے قصورِ بلند بام کی بنیادیں بھی اسی عالمِ آب و گل میں استوار کی جاتی ہیں۔

مذاہبِ عالم

(اپنی نوعیت کی بالکل پہلی اُردو تصنیف)

جس میں محمد عبداللہ المسدوسی نے کامل تحقیق و تفتیش کے بعد بتایا ہے کہ اس وقت (۱) دُنیا میں مختلف مذاہب کے متبعین کی کتنی حکومتیں
کہاں کہاں پائی جاتی ہیں۔ (۲) ان کی آبادی و رقبہ کیا ہے۔ (۳) ان کا سیاسی، اقتصادی و معاشرتی موقف کیا ہے۔ (۴) ان کی پٹرولی دولت کتنی
ہے۔ (۵) ان کے استعماری عروج و زوال کی تاریخ کیا ہے۔ (۶) دُنیا کے جدید سیاسی معاہدات کی رو سے ان کے باہمی تعلقات کیا ہیں۔

تین باب صرف مسلم آبادی اور مسلم حکومتوں کے لئے وقف ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت تمام دُنیا میں ان کی آبادی کتنی ہے، کہاں کہاں
ان کی حکومتیں قایم ہیں اور سیاسی و اقتصادی حیثیت سے ان کا کیا مرتبہ ہے۔

چھ سادہ و رنگین نقشوں اور متعدد ضمیموں کے ذریعہ سے ان سب کی جغرافی پوزیشن، تناسب آبادی، اقتصادی ذرایع اور سیاسی اہمیت
کو نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتاب موجودہ عالمی حالات، ان کے بنیادی عوامل اور اسلامی حکومتوں کے موجودہ سیاسی موقف کو سمجھنے کے لئے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی
ہے۔ نہایت نفیس طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے اور مع محصول تیرہ روپیہ میں مل سکتی ہے۔

قیمت پیشگی آنا چاہئے —— وی، پی نہیں بھیجا جائے گا۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

معجزہ اور علم غیب

سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ معجزہ کا اصطلاحی مفہوم کیا ہو سکتا ہے، شرح مواقف میں معجزہ کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ:-

"معجزہ — معجزۃ عندنا ما یقصد بہ تصدیق مدعی الرسالۃ وان لم یکن خارقاً للعادۃ"۔ یعنی علامہ سید شریف کے نزدیک معجزہ وہ چیز ہے جس سے رسالت کی تصدیق مقصود ہو، گویہ ضروری نہیں کہ وہ خارقِ عادت بھی ہو، لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ اگر خارقِ عادت کی شرط کو ضروری نہ قرار دیا جائے، تو اس میں اعجاز کی کونسی صورت باقی رہتی ہے اور ایسی بات کا صدور کیونکر تصدیق رسالت کے لئے مفید ہو سکتا ہے اس لئے تمام علماء اسلام نے معجزہ کو خارق عادت ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خارق عادت ہونے سے کیا مقصود ہے۔

اگر "خارقِ عادت" سے مراد کسی ایسے فعل کا ظہور ہے جو "قانونِ قدرت" کے مخالف ہو تو قابل تسلیم نہیں کیونکہ اس کی تردید خود نصوص قطعیہ سے ہوتی ہے۔ کلام اللہ میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ جو چیز جس انداز پر پیدا کی گئی ہے اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، مثلاً:-

"قل کل یعمل علی شاکلتہ" — "فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" — "ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا" — "خلق کل شئی فقدرہ تقدیرا" —

"کل شئی عندہ بمقدارہ" — کی تفسیر میں امام رازی نے لکھا ہے کہ "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز ایک مخصوص انداز پر ہے اور اس کی حالت یہ ہے کہ "لایجاوز ولاینقص عنہ"۔ اس میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی۔

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اسی سلسلہ میں ظاہر کیا ہے کہ:-

"جرت عادۃ اللہ تعالیٰ ان لاتنفک الخواص عما جعلت خواص لہا"۔ (یعنی خدا کی عادت ہے کہ وہ اشیاء کے خواص کو نہیں بدلتا)

اس لئے "خوارقِ عادت" سے مراد ایسے افعال ہوں گے جو عادتاً ظہور میں نہیں آتے لیکن ان کا ظاہر ہونا ممکن ہے اور چونکہ ایسے افعال کے حدوث کے لئے اسباب کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے ان میں کوئی کیفیتِ اعجاز پیدا نہیں ہوتی، جب اسباب پیدا ہو جائیں گے ان کا ظہور ہو جائیگا خواہ وہ اسباب کسی نبی کی دعا سے پیدا ہوں یا غیر نبی کی کاوش سے۔ اگر کوئی کہے کہ ان اسباب کا ظہور کسی غیر نبی کی کاوش سے نہیں ہو سکتا تو ہم اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں، کیونکہ اس طرح کی نادر الوقوع باتیں یوں بھی اسباب فراہم ہو جانے پر کبھی کبھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔

اس بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر معجزات کو محالات عقلیہ سے متعلق سمجھا جائے تو خود نص قطعی سے اس کی تردید ہوتی ہے اور اگر محالات عادی سے وابستہ کریں تو معجزہ کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور نہ اسے تصدیق رسالت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب بھی تفہیمات الٰہیہ میں یہی لکھتے ہیں کہ:- "انما المعجزات والکرامات امور اسبابیۃ ولم تترک الاسباب قط۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا"۔

اس کے بعد یہ امر بحث طلب ہے کہ معجزہ مثبت نبوت ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے بعض اسے مثبت نبوت کہتے ہیں اور بعض کو اس سے انکار ہے۔ لیکن جہاں تک ہمارے رسول کا تعلق ہے خود کلام مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود کفار کے معجزہ طلب کرنے کے آپ نے معجزہ پیش کرنے سے انکار کر دیا، وہ آیات یہاں نقل کرتا ہوں:-

"وقالوا لن نومن لک حتیٰ تفجر لنا من ارض ینبوعا او یکون لنا جنۃ من نخیل وعنب فتفجر الانہار خلالہا تفجیرا او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تی باللہ والملائکۃ قبیلا او یکون لک ترفیک حتیٰ تنزل علینا کتابا نقرأہ قل سبحان ربی ہل کنت الا بشراً رسولا" (سورۂ بنی اسرائیل، آیات ۹۲-۹۵)

(کفار نے رسول اللہ سے کہا کہ ہم تیرے اوپر ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لئے چشمہ نہ جاری کردے یا یہ کہ تیرے پاس کھجور یا انگور کا باغ ہو اور تو اس میں بہتی ہوئی نہریں نکالے یا یہ کہ آسمان کے ٹکڑے کر ڈالے یا یہ کہ خدا اور فرشتوں کو اپنے ساتھ لے آوے یا یہ کہ تیرے لئے کوئی آراستہ مکان ہو یا یہ کہ تو آسمان پر چڑھ جاوے اور ہم تیرے افسوں پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کوئی ایسی کتاب ہم پر نازل نہ ہو جسے پڑھ لیں (سوائے رسول، کہدے کہ پاک ہے میرا پروردگار میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، مگر ایک انسان بھیجا ہوا)

اگر معجزہ کا پیش کرنا ثبوت نبوت کے لئے ضروری ہوتا تو ایسی صورت میں کہ کفار آپ سے معجزہ طلب کر رہے تھے، یہ جواب ہرگز نہ دیتے کہ:۔ "سبحان ربی ہل کنت الا بشراً رسولا" بلکہ کوئی نہ کوئی معجزہ ضرور پیش کرتے۔

قاضی ابوالولید محمد بن رشید نے بھی اپنی مشہور کتاب "الکشف عن مناہج الادلۃ فی عقائد الملۃ" میں قوی دلایل سے یہی ثابت کیا ہے کہ معجزہ ثبت نبوت نہیں۔

سورۂ عنکبوت کی ایک آیت ہے:۔ "وقالوا لولا انزل علیہ آیات من ربہ قل انما الآیات عند اللہ وانما انا نذیر مبین"۔ اس پر غور کیجئے کہ کیا کفار کا یہ کہنا کہ ان پر (یعنی رسول اللہ پر) کیوں اللہ کی طرف سے نشانیاں یا معجزے نہیں اتارے گئے، اس بات کو ثابت نہیں کرتا کہ رسول اللہ نے اس سے قبل کبھی کوئی معجزہ پیش نہیں کیا تھا اور کفار کا معجزہ طلب کرنا اور رسول کا اس کے جواب میں یہ فرمانا کہ:۔ "انما الآیات عند اللہ وانما انا نذیر مبین"۔ (یعنی نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں میں تو صرف تمہیں علانیہ ڈرانے کے لئے آیا ہوں)۔ اس امر کا ثبوت نہیں کہ آپ معجزہ پیش کرنے کے لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے اور نہ آپ نے کوئی معجزہ پیش کیا۔

رسول اللہ کا اگر کوئی معجزہ تھا تو صرف قرآن پاک تھا (اور ہے) جیسا کہ مندرجہ بالا آیت کے بعد والی آیت سے ثابت ہوتا ہے:۔

"اولم یکفہم انا انزلنا علیک الکتاب یتلیٰ علیہم ان فی ذالک لرحمۃ وذکریٰ لقوم یومنون"۔

(کیا کفار کے لئے یہ کافی نشانی یا معجزہ نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے اور جس میں ایمان والوں کے لئے رحمت و نصیحت پائی جاتی ہے)

اس ضمن میں لفظ آیت و آیات کی بحث بھی غور طلب ہے لیکن میں یہاں اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا کہ اصل موضوع سے اس کا تعلق نہیں ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ اس لفظ کا استعمال کلام مجید میں مختلف موقع و محل پر ہوا ہے اور اس مناسبت سے اس کا مفہوم بھی مختلف ہے، کہیں اس سے مراد صرف علامت و نشانی ہے اور کہیں نصائح و مواعظ — پھر یہ خیال صرف میرا ہی نہیں ہے بلکہ بعض اکابر علماء کا بھی ہے۔

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں:۔

"اما شق القمر فعندنا لیس من المعجزات، انما ہو من آیات القیامۃ کما قال اللہ تعالیٰ اقتربت الساعۃ وانشق القمر ولکن صلی اللہ علیہ وسلم اخبر عنہ قبل وجودہ فکان معجزہ من ہذا السبیل ولم یذکر اللہ

سبحانہ شیئاً من ہذا المعجزات فی کتابہ"۔
یعنی شق القمر ہمارے نزدیک معجزات میں سے نہیں ہے بلکہ وہ قیامت کی ایک علامت ہے جیساکہ خدا کا ارشاد ہے :۔
"اقتربت الساعۃ وانشق القمر"۔ اور نہ خدا نے اپنی کتاب میں اس قسم کے معجزوں کا کہیں ذکر کیا ہے۔

غیر معتبر کتابوں میں رسول اللہ کے بہت سے معجزوں کا ذکر پایا جاتا ہے، لیکن یہ نتیجہ ہے محض خوش اعتقادی کا یا ذریعہ ہے عوام کو متاثر کرنے کا۔ ورنہ در اصل رسول اللہ نے نہ کبھی معجزہ پیش کیا نہ معجزہ پیش کرنے کا دعویٰ کیا۔

آپ کے جسم کا سایہ نہ ہونا، کنکریوں کا آپ کی رسالت کی شہادت دینا، استن حنانہ کو آنسو بہانا وغیرہ وغیرہ سب خرافیات ہیں اور حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔

سب سے بڑا معجزہ جو رسول اللہ سے منسوب کیا جاتا ہے شق القمر کا ہے، سو اس کے بابت ہم شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان پیش کر چکے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس کے قایل نہ تھے۔

رسول اللہ کا اصل معجزہ جیساکہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں ان کا بلند درجۂ انسانیت تھا اور اخلاق کی غیر معمولی پاکیزگی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم اس کی طرف تو متوجہ نہیں ہوتے اور اثبات رسالت کے لئے ایسے سخیف دلایل پیش کرتے ہیں جن کو نہ عقل انسانی باور کر سکتی ہے اور نہ جن پر یقین لانے کی ضرورت۔

علم غیب

بعض حضرات کا خیال ہے کہ رسول اللہ کو علم غیب بھی حاصل تھا حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔
میرے نزدیک غیب کا مسئلہ نہایت صاف و آسان مسئلہ ہے اور اس میں نہ زیادہ عقل آرائی کی ضرورت ہے اور نہ کسی بحث و نزاع کی۔

لفظ غیب یا غائب لغوی معنی میں ہر اس امر کو کہتے ہیں جو مستور ہو، آنکھوں سے نظر نہ آئے اور جس کا ہم زمان و مکان متعین نہ کر سکیں چنانچہ جب کوئی آواز کسی ایسے مقام سے آتی ہے جس کا پتہ نہیں چلتا یا نظر نہیں آتا تو عربی زبان میں اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں :۔

"سمعت الصلات من وراء الغیب"

اب دیکھنا یہ ہے کہ کلام مجید میں اس لفظ کا استعمال لغوی معنی سے ہٹ کر تو نہیں ہوا؟۔ قرآن میں متعدد جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے سب سے پہلے تو سورۂ بقر کی بالکل ابتدا میں "یومنون بالغیب" نظر آتا ہے، بعض مفسرین نے اس آیت میں "غیب" کے جو یہ معنی لکھے ہیں کہ "آنکھ بند کر کے ایمان لاتے ہیں"۔ ان سے مجھے اختلاف ہے اس کا جو مفہوم عبد اللہ ابن عباس نے ظاہر کیا ہے وہی درست معلوم ہوتا ہے، انھوں نے لکھا ہے "الغیب ہو اللہ" یعنی غیب سے مراد خدا کی ذات ہے۔ چونکہ خدا کی ذات مستور ہے اور نظر نہیں آتی، اس لئے اس کو لفظ غیب یا غائب سے تعبیر کرنا بالکل لغوی معنی کے لحاظ سے ہے جس میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔

سورۂ آل عمران میں جب جناب مریم کو ان کی تطہیر و پاکیزگی کا یقین دلاتے ہوئے اطاعت و عبادت کی ہدایت کی گئی تو اس کے ساتھ ارشاد ہوا کہ :۔

"ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک"

یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تجھے بتاتے ہیں۔ یہاں غیب کے معنی خواہ خدا کے لیجئے یا محض عالم مستور کے (جو "عالم شہادۃ" کا ضد ہے) کوئی فرق نہیں ہوتا اور وہی لغوی معنی بدستور قایم رہتے ہیں۔

دو مقام پر صاف صاف علم غیب کے متعلق اظہار حقیقت کیا گیا ہے۔ سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"وعندہٗ مفاتح الغیب لا یعلمہا الا ہو"

یعنی خدا ہی کے پاس غیب کے خزانے یا کنجیاں ہیں جن کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔ دوسری جگہ سورۂ جن میں مرقوم ہے:۔

"عالم الغیب فلا یظہر علیٰ غیبہٖ احداً الا من ارتضیٰ من رسول"

یعنی وہ عالم الغیب (خدا) اپنا بھید کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر اس پر جسے وہ رسالت کے لئے چن لے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ انعام اور سورۂ جن کی آیتیں متعارض ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سورۂ انعام میں جو حقیقت ظاہر کی گئی وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے یعنی یہ کہ رموزِ غیب کا جاننے والا صرف خدا ہے اور سورۂ جن میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ان رموز کو وہ اپنے رسولوں پر ظاہر کر دیتا ہے۔

اس طرح گویا سورۂ جن سے یہ امر روشن ہو گیا کہ خدا رسولوں کو علم غیب عطا کرتا ہے۔ لیکن فیصلہ کرنے سے قبل دو باتوں پر غور کر لینا ضروری ہے، ایک یہ کہ عالم غیب، عالم مستور، رموز غیب وغیرہ سے کیا مراد ہے اور علم کی کتنی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

عالم غیب اور عالم شہادت دو عالم مانے جاتے ہیں۔ عالم شہادت تو وہ جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے یا جس کا ہم کو علم ہو چکا ہے اور عالم غیب وہ جو ہماری نگاہ اور ہمارے حواس و ادراک سے پوشیدہ ہے اور یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ "عالم شہادت بہ نسبت عالم غیب کے نہایت مختصر ہے"، انسانی معلومات کا نقص اور اس کی تنگی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ جو کچھ انسان کو معلوم ہے اور جن امور کا وہ اپنے آپ کو محقق کہتا ہے وہ بھی اسے اچھی طرح نہیں معلوم، چہ جائیکہ تمام کائنات اور رموزِ کائنات و آفرینش سے آگاہ ہونا۔ الغرض انسان کے سامنے جو کچھ ہے وہ عالمِ غیب کا نہایت ہی حقیر و مختصر سا حصہ ہے جس کا علم اُسے حاصل ہو گیا ہے اور جس کو ہم عالم شہادت کہتے ہیں وہ بھی کسی وقت عالم الغیب ہی میں داخل تھا۔

علوم حاضرہ کی تمام تحقیقات، فنون جدیدہ کی تمام معلومات کسی وقت سب عالم غیب ہی میں داخل تھیں جو بعد کو عالم الشہادت میں داخل ہوئیں، علم الکیمیا کے تمام نظریئے، علم طبقات الارض کے تمام انکشافات، طبیعیات کے جملہ مسائل، الغرض اس وقت کے تمام معلومات سب عالم غیب سے متعلق تھے جو اب عالم شہادت میں آ گئے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ اور کون سے غیب کے خزانے ہیں جو آئندہ انسان کو عطا ہونے والے ہیں، اس لئے یہ کہنا کہ غیب کا علم رسول کو نہیں تھا اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ کلی علم کسی انسان کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا لیکن جزئی علم ہر انسان کو حاصل ہے چہ جائیکہ انبیاء و رسل جو بہر نوع زیادہ مکمل انسان تھے۔

علم دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جسے علم حقیقت کہتے ہیں، دوسرا علم علت و معلول، قسم اول کا علم تو یقیناً سوا ذات باری کے کسی کو نہیں ہو سکتا، لیکن دوسرے کا علم ہر انسان کو حاصل ہو سکتا ہے اور عقل و دماغ کے تفاوت سے اس کے بھی مدارج ہوتے ہیں یا یوں سمجھئے کہ ایک انسان یہ تو سمجھ سکتا ہے کہ جب دو چیزیں آپس میں ملیں گی تو ایک تیسری چیز رونما ہو گی لیکن وہ "کیوں" کا جواب نہیں دے سکتا، کیوں کا علم صرف خُدا ہے۔

اب اگر انبیاء یا رسول اللہ کے متعلق کہا جائے کہ وہ حقیقت کا علم رکھتے تھے تو میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں ہوں لیکن جس طرح اور دوسرے انسانوں کو بعض خواص فطرت کا علم ہو سکتا ہے، اسی طرح ان کو بھی حاصل تھا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کا علم، ان کی عقول عالیہ اور نفوس ذکیہ کی وجہ سے زیادہ بلند و وسیع رہا ہو۔ اب ذرا دنیا سے بالکل جدا ہو کر صرف روحانی عالم میں آئیے تو یہاں بھی وہی صورت نظر آئے گی۔ اس وقت مسمریزم، ہپناٹزم، قوت مقناطیسی، اخبار عن الغیب، پیشین گوئی، قرأۃ افکار (دل کا حال معلوم کر لینا)، یا

اس سے قبل رمل، نجوم وغیرہ کے ذریعہ سے احکام صادر کرنا، یہ سب علم غیب ہی سے متعلق تھے اور انسان دماغ کو مخصوص طور پر تربیت کرنے کے بعد یہ تمام باتیں بتا سکتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت نہیں ہے بلکہ نتیجہ ہے اس قوت کا جو خاص مشق کے بعد بلا کسی اصول وضابطہ کے کسی امر کی طرف رہبری کرتی ہے، انبیاء چونکہ قدرت کی طرف سے نہایت ہی اعلیٰ دماغ لے کر آئے تھے، اس لئے اگر وہ کوئی پیشین گوئی کر دیتے تھے یا کسی امر غیر معلوم کے متعلق کوئی صحیح حکم لگا دیتے تھے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم کو علم غیب حاصل تھا، لیکن حضرت آدم کوئی پیغمبر نہ تھے۔ آدم سے مراد محض انسان ہے اور انسان ہونے کی حیثیت سے اس نے بہت سے انکشافات کئے ہیں۔ سب سے پہلے جب انسان نے پتھروں کے اوزار بنا کر ان سے کام لیا تو یہ بھی علم غیب ہی تھا اور آج جبکہ انسان ہوا میں اڑتا پھر رہا ہے غیب ہی کے خزانہ کا عطیہ ہے اور کل جب وہ کرۂ قمر میں اپنی نو آبادیوں کی بنیاد ڈالے گا اس وقت بھی یہ سب عالم غیب ہی کے ایک جزو کا انکشاف ہوگا۔

مکتبہ جدید لاہور کی مشہور تاریخی، سوانحی اور نفسیاتی مطبوعات

جو ظاہری ومعنوی حیثیتوں سے معیاری درجہ رکھتی ہیں۔ آپ ہندوستان میں ہمارے ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ذیل کی فہرست ملاحظہ فرمایئے۔ اور آپ کو جو کتابیں درکار ہوں ان کی قیمت مع محصول ڈاک ذریعہ منی آرڈر ہمارے پاس بھیج دیجئے۔ (کمیشن وی پی کا کوئی سوال نہیں) لیکن کوئی آرڈر دس روپیہ سے کم کا نہ ہونا چاہئے جس کے ساتھ محصول ڈاک بھی بحساب پندرہ فی صدی آپ کو بھیجنا چاہئے۔

منیجر نگار، لکھنؤ

سلسلہ تاریخ وسوانح

حیات محمد ---- (محمد حسین ہیکل) --- ۱۹ انیس روپیہ
ابوبکر صدیق ---- (" ") ---- ۱۰ دس روپیہ
الحسین ---- (" ") ---- ڈھائی روپیہ
الزہرا ---- (" ") ---- ۲ دو روپیہ
اہارون ---- " " ---- ۵ پانچ روپیہ
خالد سیف اللہ -- (ابوزید شبلی) ---- ۵ پانچ روپیہ
عمرو بن العاص --- (حسن ابراہیم حسن) ---- ۵ پانچ روپیہ
چنگیز خاں --- (ہیرلڈ لیمب) --- ۵ پانچ روپیہ
امیر تیمور --- (" ") --- ۷ سات روپیہ

سلسلۂ نفسیات عملی

جینے کا قرینہ --- (آندرے موروا) --- ۶ چھ روپیہ
پریشان ہونا چھوڑ دیجئے -- (ڈیل کارنیگی) ---- ۶ چھ روپیہ
میٹھے بول میں جادو ہے -- (" ") ---- ۷ سات روپیہ
جینے کی اہمیت --- (لین یوتانگ) ---- ۱۲ بارہ روپیہ

زندگی کا راستہ --- (ڈیوس بٹیس چیمبرز) ------ ۶ چھ روپیہ
کامیابی کا راستہ --- (" ") ---- ۴ چار روپیہ
اپنا راستہ خود بناؤ --- (خالق کامراں) ---- ۴ چار روپیہ
کیا آپ کاروبار کرتے ہیں -- (اعجاز حسین) ---- ۵ پانچ روپیہ

علم وتنقید

دلی سے اقبال تک --- (ڈاکٹر سید عبداللہ) --- ۵ پانچ روپیہ
انسان اور آدمی (محمد حسن عسکری) ---- ۴ چار روپیہ
مقدمۂ شعر وشاعری (ڈاکٹر وحید قریشی) ---- ۱۰ دس روپیہ
تذکرۂ شوق --- (عطاء اللہ پالوی) ---- ۶ چھ روپیہ
میر حسن اور انکے خاندان کے شعراء -- (محمود فاروقی) --- ۵ پانچ روپیہ

منٹو کے افسانے

پھندنے --- (سعادت حسین منٹو) ---- ۴ چار روپیہ
گنجے فرشتے --- (" " ") ---- ۵ پانچ روپیہ
ٹھنڈا گوشت --- (" " ") ---- ۳ تین روپیہ
چغد --- (" " ") ---- ۳ تین روپیہ

مضمون وار منتخب اشعار

نادر الوجود انسائیکلوپیڈیا

گلستانِ ہزار رنگ

مقدمہ از حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں :- " سید بہاء الدین احمد صاحب (مؤلف) نے اردو شاعری کے نظر و مطالعہ کی ایک نئی راہ کھول دی ہے۔ آیندہ اس رُخ پر اصحاب ذوق نئے نئے قدم اُٹھا سکیں گے .... عنوانوں کے تجویز کرنے میں ہر طرح کے مواد و مطالب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اور اشعار کا انتخاب سلیقہ کے ساتھ کیا گیا ہے......"

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین (گورنر بہار) :- "...... مجلد صورت میں یہ اور بھی اچھی لگتی ہے .... آپ کی محنت کا پھل سب کے لئے قابل قدر ہے ...... میں آپ کو اس کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتا ہوں"

مولانا نیاز فتحپوری "نگار" میں :- " ۵۹۱ عنوانات کے ماتحت ہزاروں شعر اردو کے یکجا کر دئے ہیں ...... تالیف فاضل مصنف کے وسیع مطالعہ اور حسن ذوق کی بڑی قیمتی دستاویز ہے .... دیباچہ کو اردو ادب کی مختصر تاریخ کہنا غلط نہ ہوگا...... یہ گویا تاریخ، تبصرہ اور انتخاب کلام کا بڑا دلچسپ آمیزہ ہے جس کی ملک کو قدر کرنا چاہئے .... کتاب بڑے اہتمام سے نہایت نفیس کاغذ پر بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ شایع کی گئی ہے"

مولانا عبدالماجد دریا بادی "صدق جدید" میں :- " اردو کے قدیم و جدید مشہور و غیر مشہور سیکڑوں شاعروں کے کلام سے مضمون وار ان کا عطر کشید کر کے لے لیا گیا ہے۔ مؤلف نے کمال دکھایا ہے .... اہل ذوق کے لئے کتاب ایک خاصے کا تحفہ ہے......"

اس کے بغیر کوئی لائبریری مکمل ہو ہی نہیں سکتی

سائز بڑا - صفحات ۵۱۲ - قیمت مجلد دس روپے (عنا۔ر) مع محصولڈاک

(اس کے ہندی اڈیشن کا پیش لفظ راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد اور بہار کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سری کرشن سنہا نے لکھا ہے)

گیان منزل پبلیکیشنز - دریاپور - پٹنہ - ۴ - (بہار)

حق اللہ کوئی چیز نہیں

"حقوق اللہ اور حقوق العباد" کا مسئلہ بھی منجملہ ان دیگر مسایل کے ہے جن کو معتقدات اسلامیہ سے غیر متعلق ہونے کے باوجود غلطی سے جزو ایمان و اسلام قرار دے لیا گیا ہے حالانکہ حق اللہ بالکل بے معنی بات ہے ــــ فرض اور حق میں کوئی فرق نہیں ہے سوا اس کے کہ جس چیز کی طرف سے ادائے فرض کا مطالبہ ہوتا ہے وہ اس کو حق کہکر طلب کرتا ہے اور جو ادا کرتا ہے وہ اسے فرض کے نام سے موسوم کر کے انجام دیتا ہے اس لئے اگر حق کا مفہوم متعین ہو جائے تو فرض کی صورت بھی متعین ہو سکتی ہے اور اس کی غایت کا بھی علم ہو سکتا ہے۔

ادائے فرض یا حق نام ہے کسی ایثار، یا احسان و کرم کے اعتراف کا ایثار کے ذریعہ سے یا کسی اور ایسے ذریعہ سے جسے احسان کرنے والا اپنے لطف و کرم کا معاوضہ سمجھ سکے۔ اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ حق کا طلبگار اور ادائے فرض کرنے والا دونوں احتیاج کے لحاظ سے قریب قریب ایک سطح پر ہوں، دوسری صورت یہ ہے کہ احسان کرنے والا بہت بلند ہو اور وہ اس کے معاوضہ کا محتاج نہ ہو۔ تیسری صورت ایک اور ہے۔ وہ یہ کہ احسان و کرم کرنے والی ذات ایک ایسا عمومی مبدء و منبع ہو جو بلا تخصیص و تعیین، بلا غرض و سبب لطف عمیم کی حادی ہے، جیسے آفتاب کا وجود کہ اس کی روشنی کوہ و راغ، صحرا و باغ، وادی و مرغزار ہر جگہ یکساں جاں بخش و حیات افروز ہے، یا پھول کی نکہت کہ اس کی شامہ نوازی کسی مخصوص و محدود زمان و مکان کے لئے مختص نہیں ہے یا ابر مطیر جس کے نزدیک شاہ و گدا، نشیب و فراز، شب و روز، صبح و شام کسی چیز کی تخصیص نہیں ہے، ایسی صورت میں نہ کوئی سوال حق و فرض کا پیدا ہوتا ہے، نہ اس کے ادا کئے جانے کا۔

خدا اور انسان کا تعلق اگر کسی شق میں آسکتا ہے تو وہ یہی تیسری صورت ہے، کیونکہ ذات خداوندی کے انعامات بغیر کسی وجہ و سبب، بلا کسی غرض و غایت کے ہر ایک ہستی و مخلوق پر یکساں ہیں اور اگر آج تمام نوعِ انسانی بلکہ جملہ مخلوق ان سے منکر ہو جائے تو بھی اس کے الطاف اسی حال سے جاری رہیں گے اور ان کے اعتراف یا عدم اعتراف سے ان کے استمرار و دوام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اگر حقوق اللہ میں کوئی چیز ایسی ہو سکتی جس کا احساس فطرت کی طرف سے ہر شخص میں ودیعت کیا گیا ہے تو سب سے پہلے اس کی ذات اور وجود کو تسلیم کرنا ہے۔ لیکن اگر آج کوئی اس سے انکار کر دے بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ اس کو گالیاں دینے لگے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خدا اس سے ناخوش ہو جائے گا اور اپنے اُن انعامات عمیم سے اُسے محروم کر دے گا جو بلا کسی سبب کے اُس نے ہر شخص کے لئے ارزانی کر رکھے ہیں؟ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم خدا اور اس کے کاروبار کو بالکل دُنیاوی اصول زندگی کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اس کے مطابق حکم لگاتے ہیں۔

اب آپ اصولی گفتگو سے ہٹ کر نیچے آیئے اور دیکھئے کہ جن باتوں کو خدا کے حقوق سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کیا ہیں اور ان میں ... وہ خصوصیت ہے جو "حق اللہ" کو ہم پر ثابت کرتی ہے، ہر مذہبی تعلیم دو چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ عبادات و معاملات۔ معاملات کو چھوڑئے کیونکہ وہ بین طور پر حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ رہ گئی عبادات سو حق اللہ کو انھیں سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ در انحالیکہ ان میں سے ایک بھی حق اللہ نہیں ہے اور عبادت خواہ کسی صورت سے ہو حقوق العباد ہی سے متعلق ہے، مسلمانوں میں جہاں تک عبادات کا تعلق ہے اس میں نماز، روزہ، حج داخل ہیں اور انھیں کو حق اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وہ لوگ جو نماز، روزہ اور حج کو حق اللہ میں داخل کرتے ہیں، وہ بھی غالباً اس امر کا انکار نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جو صرف ہمارے ہی فایدہ کے لئے نہ بتائی گئی ہو۔ اگر ہم تارک الصلوٰۃ ہیں تو اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنی اجتماعی و تمدنی ترقی کے لئے سعی نہیں کرتے اور اس طرح گویا نماز کا ترک کرنا اُن حقوق کو پامال کر دینا ہے جو قوم کی طرف سے اس کے ہر ہر فرد پر عاید ہوتے ہیں۔ حج چونکہ نماز جماعت ہی کی ایک زیادہ وسیع صورت ہے اور اس کا مقصود بھی محض اخوت عامہ کو مستحکم کرنا ہے اس لئے اس کا بھی حق العباد میں شامل ہونا ظاہر ہے۔ یہی حال روزہ کا ہے کہ اس کی تاکید بھی صرف اس لئے کی گئی ہے کہ ہم اپنی قوم کے مسکین و بیکس افراد کی حالت کا احساس کر سکیں اور اُن کی مدد کی طرف متوجہ ہوں اگر یہ جذبہ ہم میں پیدا نہیں ہوتا تو روزہ بالکل بے معنی چیز ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ عبادت بھی سراسر حق العباد سے متعلق ہے۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی بحث طلب ہے کہ کسی معصیت کو خدا کا معاف کر دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ میرا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ جس طرح خدا کا کوئی حق بندہ پر نہیں ہے۔ یعنی جس طرح ایک انسان کے اعمال حسنہ خود اس کے لئے مفید ہیں اسی طرح اعمال سیئہ اس کے لئے مضر ہیں اور اس فایدہ و مضرت کا دوسرا نام ثواب و عذاب ہے۔ خدا کی شان اس سے بہت بلند و ارفع ہے کہ وہ ہمارے اچھے کاموں کی تحسین اور بُرے کاموں کی تشنیع کے لئے کوئی اہتمام کرے۔

اگر ہم ان ہدایات پر عمل نہیں کریں گے جو شارع نے بتائے ہیں تو اس کا نتیجہ از خود ہمارے اور ہماری قوم کے حق میں بُرا پیدا ہوگا اور اگر اُن پر کاربند ہوں گے تو ہم خود اس سے فایدہ اُٹھائیں گے۔ اس لئے ہمارے تمام اعمال و عبادات سب حق العباد ہیں اور حق اللہ کوئی چیز نہیں۔

"نگار" کے بعض متفرق پرچے

سنہ ۵۶ء = مارچ ۱۲ار۔ اپریل عہ ر۔ مئی ۸ر۔ جولائی ۸ر۔ اگست ۸ر۔ ستمبر ۸ر۔

سنہ ۵۷ء = مارچ ۱۲ار۔ اپریل ۸ر۔ مئی ۸ر۔ جون ۸ر۔ جولائی ۸ر۔ اگست ۸ر۔ ستمبر ۸ر۔ اکتوبر ۸ر۔ نومبر ۸ر۔ دسمبر ۸ر۔

سنہ ۵۸ء = مئی ۸ر۔ جولائی عہ ر۔ اگست ۸ر۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر ۸ر

کمیاب کتابیں

ملہم تاریخ۔ فن تاریخ گوئی = (...) ۔ اصول اردو = (...) ۔ زباندانی ...
اصلاح زبان اردو = (...) ۔ شاعری کی دوسری کتاب = (...) ۔
دیوان شرف = (...) ۔ کلیات جعفر زٹلی = (...) ۔ تذکرہ آب بقا ...
مصطلحات اردو = (...) ۔ نگارستان فارس = (...) ۔
تذکرہ صنادید عجم = (...) ۔ تذکرہ سفینۃ الاولیاء = (...) ۔
دبستان مذاہب = (...) ۔ ذخیرۃ الملوک = (...) ۔

ہماری اُردو مطبوعات

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
۱ -	پنڈت نہرو سے بات چیت - از ٹیبر منڈی	۲ روپے	۴۰ نئے پیسے
۲ -	بھارت کی لوک کہانیاں	۱ روپیہ	۲۵ " "
۳ -	دیس دیس کی لوک کہانیاں	۷۵ نئے پیسے	۲۵ " "
۴ -	اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	۷۵ " "	۲۰ " "
۵ -	خوشحالی کے لئے منصوبہ بندی	۷۵ " "	۲۰ " "
۶ -	ناپ تول کا میٹری نظام	۲۵ " "	۱۵ " "
۷ -	ہماری کامیابیاں اور نئی منزلیں	۶۰ " "	۲۵ " "
۸ -	کیلنڈر کی اصلاح	۴۰ " "	۱۵ " "
۹ -	ہمارے نئے سکے	۲۵ " "	۱۵ " "
۱۰ -	جواہر لال نہرو کی تقریریں - فی کتابچہ نمبر ۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ -	۱۰ " "	۸ " "
۱۱	گرام دان	۵ نئے پیسے	۸ " "
۱۲ -	رسل و رسایل	۱۰ " "	۸ " "
۱۳ -	خوراک اور زراعت	۱۰ " "	۸ " "
۱۴ -	آب پاشی اور بجلی	۱۰ " "	۸ " "
۱۵ -	نئے سماجی نظام کی جانب	۱۰ " "	۸ " "
۱۶ -	صنعتی ترقی	۱۰ " "	۸ " "
۱۷ -	ہمارے پلان اور سوشلزم	۱۰ " "	۸ " "

(رجسٹری خرچ الگ)

پبلیکیشنز ڈویژن
حکومت ہند
پوسٹ بکس نمبر ۲۰۱۱
دہلی - ۸

آپ اور میٹرک نظام

آپ خواہ خریدنے والے ہوں یا بیچنے والے، آپ محسوس کریں گے کہ ناپ تول کے میٹرک نظام سے حساب کتاب بڑا آسان ہوگیا ہے۔

سارے ملک میں ناپ تول کے واحد نظام کی بدولت نہ صرف تجارت میں سہولت ہوگی بلکہ قومی وحدت میں بھی مدد ملے گی۔

یکم اکتوبر ۱۹۵۸ء سے میٹرک اوزان کا استعمال بعض صنعتوں اور صوبوں کے منتخب علاقوں میں قانونی ہوگیا ہے۔ یہ تبدیلی رفتہ رفتہ دوسرے علاقوں میں بھی کردی جائے گی۔

تجارتی باٹ مندرجہ ذیل اوزان کے ہیں								
لوہے کے باٹ			پیتل / کانسی کے باٹ					
			صرف سونا چاندی کے لیے		سونا چاندی اور دوسری اشیا کے لیے			
کیلوگرام		گرام	کیلوگرام		کیلوگرام	گرام		
۵۰	۵	۵۰۰	۲۰	۵	۱	۵۰۰	۵۰	۵
۲۰	۲	۲۰۰	۱۰	۲		۲۰۰	۲۰	۲
۱۰	۱	۱۰۰				۱۰۰	۱۰	۱
ایک کیلوگرام = ۱۰۰۰ گرام = ۸۶ تولے								

آسانی اور یکسانی کے لیے

میٹرک نظام

جاری کردہ بھارت سرکار